یونہی تو نہیں جینا

شفیق برلاس

کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

تیسرا باب:۔

چوتھا باب:۔

پانچواں باب:۔

چھٹا باب:۔

ساتواں باب:۔

دوسرا حصہ

پہلا باب:۔

دوسرا باب:۔

تیسرا باب:۔

تیسرا حصّہ

ہر اُس شخص کے نام ــــــ

جس نے اِس دُنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

پیش لفظ

جب ہم اپنے گرد و پیش بکھری ہوئی زندگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو بیشمار تلخیوں، مصائب اور آلام کی دیوار ہمارے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ انسان کی زندگی ہے کیا؟ — مشاہدے اور تجربے کی بدولت ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی المناک حقائق کی ایک طویل داستان ہے۔

زندگی کے سمندر کی غوّاصی حسّاس اور سمجھدار انسان کا روزِ ازل سے محبوب ترین مشغلہ رہی ہے۔ ہر ذہین انسان نے اس کی تلخی کو چکھا اور اسے کم کرنے کی کوشش کی۔ خدا پر بھی شاید انسانی زندگی کی ہولناکیاں آئینہ تھیں۔ اسی لیے وہ اپنی مخلوق کی خاطر اپنے پیغامبر بھیجتا رہا۔ اسے بھی شاید معلوم تھا کہ انسان کیلیے اس گتھی کو سلجھانا بہت دشوار ہے۔

تاریخِ عالم کے اوراق اُلٹنے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف مقامات پر مختلف پیغمبر مختلف پیغامات لیکر آئے۔ اُنہوں نے پیغامِ خدا کو دنیا کے ہر کونے تک پہنچایا۔ اُن کی رہنمائی کو کروڑوں انسانوں نے قبول کیا۔ ان کے پیغام کی ہردلعزیزی اور مقبولیت کے باوجود دُنیا میں ہیجان و اضطراب، تاریکی و گمراہی، انتشار و خلفشار موجود ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟ انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ لیکن وہ

بُرے بھلے میں تمیز کیوں نہیں کر سکتا۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان کی سرشت نیکی کی ضد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا نیک انسانوں سے خالی نہیں ہے۔ شرافت اور انسانیت کا فقدان نہیں مگر ہمیں ساتھ ساتھ یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ پیغمبروں کے مؤثر پیغامات بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ تعجب، حیرت اور تجسس انسان کی عادتِ ثانی بن چکا ہے۔ جس راستے کو خوفناک بتا کر اُسے اس پر چلنے سے روکا جاتا ہے۔ وہ اسی طرف قدم اُٹھاتا ہے۔ حضرتِ آدم کو جنت سے نکلوانے والا بھی تجسس اور یہی تعجب تھا۔

زندگی کے متعلق بیشمار نظریات سُننے میں آتے ہیں۔ زندگی کو ہر زاویۂ نگاہ سے پرکھا جاتا ہے ارضِ مغرب میں جہاں مذہب کو ایک ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے۔ وہاں سائنس زندگی کی کسوٹی ہے اور مشرق میں جہاں مذہب آج بھی پُوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ ریز ہے۔ زندگی کی کسوٹی مذہب ہی ہے۔ لیکن جدید سائنس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس بھی جہاں سے چلی ہے۔ گھوم پھر کر وہیں آ رہی ہے۔ انسانیت مذہب سے انحراف کرنے کے بعد دوبارہ مذہب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے۔ زندگی کے لئے کوئی نہ کوئی لائحۂ عمل مرتب کرنا ہی پڑتا ہے۔ زندگی کو کسی تنظیم کا پابند کرنا ہی پڑتا ہے۔ جبھی تو ایک مشہور فلسفی نے کہا تھا کہ اگر کوئی خدا نہیں ہے تو ہمیں ایک خدا ضرور بنا لینا چاہئے۔ اس دعوٰی کو شکست خوردہ ذہنیت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ زندگی ایک نظام کے تحت ہی خوشحال رہ سکتی ہے۔

اب چونکہ خدا نے دُنیا میں اپنے پیغمبر بھیجنا بند کر دیئے ہیں۔ اس لئے انسان تاریکی میں اپنا رستہ آپ ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یہ دُرست ہے کہ اس کے پاس خدا کے پیغامات و الہامات صحیفوں میں موجود ہیں لیکن زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ انسان نے کیوں — کیسے — اور کس طرح کہنا سیکھ لیا ہے۔ ان سوالات کا جواب الہامی کتب میں موجود نہیں۔ اسی لئے تمام دُنیا پریشان ہے۔ پریشانی اور اضطراب میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اضطراب کے اعتبار سے موجودہ دور عبوری دَور ہے۔

انسان تاریکی میں لپٹا ہوا چوراہے پر کھڑا ہے۔ کدھر جائے؟ — کہاں جائے؟ —

کون سا راستہ اختیار کرے۔ اس تذبذب کا طلسم ابھی نہیں ٹوٹا۔ یہ بات بھی نہیں تاریکی میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے والے بھی اس دُنیا میں موجود ہیں۔ شاید ان محتاط راہگیروں کی کوششیں ایک دن ثمردار ہوں اور دُنیا مسرور اور خوشحال ہو جائے۔ ان محتاط راہگیروں میں بدقسمتی سے ایک میں بھی ہُوں۔ زندگی کے غائر مطالعہ اور نیا دلۂ خیال کے ذریعے زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اور میری وُہ کوشش اس کتاب کی صورت میں حاضرِ خدمت ہے۔

میں نے اس کتاب میں ـــــ اپنے تجربات کو جمع کر دیا ہے۔ نفسیات کی روشنی میں ہر چیز کا جائزہ لیا ہے۔ تجربات کی نفسیاتی تحلیل سے ان کے حُسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے۔ صداقت کو صداقت اور خباثت کو خباثت بتایا ہے۔ پردہ پوشی سے کام نہیں لیا۔ کسی کے ساتھ جانب داری نہیں کی غیر جانب دار ہو کر اور ہر قسم کے تعصّب سے بے نیاز ہو کر دُنیا کے ہر موضوع پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ حکماء کا قول ہے کہ صحیح فن کار وُہی ہے جو حالات کا تجزیہ کرے اور پھر ہمیں درست راستہ دکھائے ـــــ میں نے اسی قول پر عمل کیا ہے۔

میں نے تصویر کے دونوں رُخ دکھائے ہیں۔ جنت بھی ـــ جہنم بھی۔ میں عیوب و محاسن بتا کر ہی نہیں رہ گیا۔ بلکہ میں نے سچے راستے کی رہنمائی بھی کی ہے۔ مَیں پیغمبر نہیں ہُوں۔ بلکہ ایک انسان ہُوں اور وُہ بھی آپ سے مختلف نہیں۔ میں نے کہیں بھی درس و تدریس کی کوشش نہیں کی خطابت کا رنگ کہیں بھی اختیار نہیں کیا۔ اس زندگی میں بے شمار تجربے کئے ہیں۔ ان کے حسن و قبح پر غور کیا ہے جو منظر میں نے دیکھا ہے اسے آپ کو بھی دکھانے کی سعی کی ہے۔ منطق اور دلائل سے صحیح رستے کے انتخاب میں آپ کی مدد کی ہے۔

زندگی کا موضوع بڑا دشوار ہے۔ اس پر کچھ لکھنا جُوئے شِیر لانے کے مترادف ہے۔ میں نے دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے لیکن اپنے تجربات کو مستند سمجھا ہے۔ کیونکہ میں اس سلسلے میں تاریک اور تعفّن سے بھرے ہُوئے غاروں میں بھی کُود پڑا ہوں اور گلستانوں کی سیر بھی کی ہے۔ مہکتے اور لہلہاتے ہُوئے گلستانوں کی۔

دُنیا میں خلوص کی کمی ہے۔ لیکن اس کتاب میں جا بجا خلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر خلوص

عام ہو جائے تو مصائب ختم ہو سکتے ہیں۔ سی۔ ای۔ ایم جوڈ اپنی تازہ کتاب GUIDE TO MODER THOUGHT کے آغاز میں لکھتا ہے۔

"ایسے روایتی سوالات بھی ہیں جنہیں مردوں اور عورتوں نے ہر دور میں پوچھا ہے اور یہی سوالات آج بھی پوچھے جا رہے ہیں۔ کیا یہ کائنات ایک ہنگامی ترتیبِ ذرات ہے؟ یا ایک خاص مقصد اور تجویز کا آئینہ ہے؟ کیا یہ دنیا جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ایک حادثہ ہے کہ تجویز ۔۔۔ کسی کا فن پارہ؟ کیا زندگی مادی نظامِ کار کی حادثاتی پیداوار ہے؟ انسانی آبادی کبھی انتہائی منازلِ ترقی پر گامزن ہو سکے گی کہ نہیں؟ یا یونہی ناکام رہے گی؟ ہمیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اختیار ہے کہ ہم خواہشات کے غلام ہیں؟"

میں آخر میں صرف اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب انہی سوالات کا جواب ہے۔ میں خوش ہوں گا۔ اگر اس کتاب نے آپ کو صحیح راستے سمجھانے میں مدد دی۔

جالندھر چھاؤنی
۲ر فروری سنہ ۱۹۴۶ء

شفیق برلاس

پہلا حِصّہ

پہلا باب

زندگی کا مقصد، علم الاخلاق ـــ جذبات، فطری خواہشات اور ضروریات

سیدھی، چوڑی اور سرمگیں سڑک پُر رونق بازار کو چیرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ چوک کے ایک کونے پر جہاں کانسٹیبل کھڑا ہوا نا تربیت یافتہ آبادی کو راہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک ریستوران ہے۔ ایک اوسط درجے کا ریستوران جس میں اوسط درجے کے لوگ ہی آتے ہیں لیکن یہ بات بھی نہیں کبھی کبھی فوج کے افسرانِ اعلیٰ بھی سروں پر اپنی کلاہ کج کئے ہوئے اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے داخلے پر ریستوران کا مالک اپنی مخصوص نشست پر سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے ـــ اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ شاید یہ چمک اس مسرت کا مظہر ہوتی ہے جو کسی غریب کی جھونپڑی میں کسی بھولے بھٹکے اور ساتھیوں سے بچھڑے ہوئے راجہ کی آمد پر پھیل جاتی ہے۔

اس ریستوران کی فضا کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ ریستوران ایک کافی بڑے کمرے پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک حصے میں کچن ہے۔ دوسرے حصے میں ٹاٹ کے پردوں سے بنائے ہوئے مختلف کمرے ہیں۔ ہوٹل کا مالک ایک بوڑھا ہے۔ باتونی اور تندمزاج۔ آپ کوئی بات کریں اُس کے پاس اس بات کیلئے ایک کہانی موجود ہوگی اور آپ کی مرضی کے خلاف وُہ داستان سنانے کے لئے ہر وقت تیار نظر آئے گا۔ اس بوڑھے کی باتوں سے بعض اوقات اُلجھن بھی ہوتی ہے لیکن چونکہ بیٹھنے کے لئے اور کوئی موزوں مقام احباب کو تنگی کی وجہ سے میسّر نہیں آتا۔ اسلئے اس بوڑھے کے ناز نخرے سہنا ہی پڑتے ہیں۔ ہوٹل کے بوڑھے مالک کا بیٹا بھی صبح سے شام تک

کرسی پر بیٹھا ہوا نہایت سستی قسم کے ناول پڑھتا رہتا ہے۔ وہ احباب کی گفتگو میں بہت کم مداخلت کرتا ہے۔ ہوٹل کا باورچی ایک پالتو کتے کی طرح وفادار ہے۔ جسے بٹیر، مرغ اور گوشت بھوننے کے سوا کسی اور چیز میں کوئی دلچسپی نہیں۔ نسلِ آدم کیونکہ طبقات میں بانٹ دی گئی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باورچی نچلے طبقے کا فرد ہے۔

رستوران میں ہمیشہ تفریحی اور کاروباری باتیں ہوا کرتی ہیں۔ کوئی اپنے دوست کو چائے پلانے یا کھانا کھلانے لاتا ہے۔ اگر اتفاق سے رستوران میں آنے والے پردیسی ہیں تو کھانے کو بدمزہ پاکر یہ گلہ کرتے ہیں کہ بازار کا کھانا کسی حال میں نہیں کھانا چاہیئے۔ گھر کی دال روٹی کا مقابلہ یہ رستوران اور ہوٹل کہاں کر سکتے ہیں اور اُن کی گفتگو کا بیشتر حصہ کھانے کی لذت اور بدمزگی تک محدود رہتا ہے۔ دوستوں کی شکایت، محبت کی ناکامی، کسی پر ڈورے ڈالنے کی تجاویز، کاروبار میں نقصان اور فائدے کے تذکرے، طنز و مزاح، فوجی زندگی کے عیوب و محاسن، پڑوسیوں کی برائی یعنی یہ رستوران عام اور مانوس گفتگو کا مرکز ہوا کرتے ہیں۔

رستوران اور ہوٹلوں میں خاص گفتگو بھی ہوا کرتی ہے۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ یہی اوسط درجے کا رستوران جو ہوٹل بھی ہے، سال بھر ایک نہایت اہم گفتگو کا مرکز بنا رہا۔ یہاں بیٹھ کر زندگی کے مسائل طے کئے گئے۔ یہاں نہایت کارآمد باتیں ہوتی رہیں۔ انسانی زندگی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا گیا۔ انسانی زندگی کو بہتر اور منظم بنانے پر بحث ہوتی رہی۔ اس لئے اس رستوران کو نظرانداز کر دینا قطعاً بے انصافی تھی۔ لہٰذا آغاز ہی میں اس کا ذکر ضروری سمجھا گیا۔

یہ پُرمغز سلسلۂ مضامین کیونکر چھڑا — سنیئے :۔

ایک دن میں اسی رستوران 'فردوس' میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں ہوٹل کے مالک کی پُرلطف مگر توہم سے لبریز داستان سُن چکا تھا۔ اتنے میں مائیکل اور انصر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ انصر کچھ اُداس اُداس سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی اُداسی سے اندازہ لگالیا تھا کہ آج وہ اپنی بیوی سے جھگڑ کر آیا تھا۔ اس لئے میں نے اُس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی بات چھیڑے۔ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد اس نے کہا "مجھ سا بھی

رتی مظلوم ہوگا اس زمانے میں۔ میری بیوی کے نزدیک مقصدِ حیات یہی ہے کہ بیشمار دولت ہو اور میں کولھو کا بیل بنا رہوں"۔

میں نے اُسے چراغ پا کرنے کے لئے سوال کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا دوست بھرا بیٹھا ہے اور یہ سوال سنتے ہی وُہ مجھ پر برس پڑے گا۔ لیکن میں آج خوش ہوں کہ میرا وُہ سوال ایک نہایت پُر از معلومات مضمون کی شکل اختیار کر گیا۔ پہلے تو مجھے وُہ برافروختہ لہجے میں میرے سوال کا جواب دیتا رہا لیکن بعد میں ہماری گفتگو متانت کا رنگ اختیار کر گئی۔

"زندگی کا مقصد کیا ہے؟" میں نے پُوچھا

مائیکل :۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ نظامِ کائنات اور فطرتِ آدم میں ایک بہت بڑا بنیادی فرق ہے۔ سوائے انسان کے قدرت کی ہر چیز جاندار یا غیر جاندار کسی ایک اصول پر کاربند ہے۔ ایک ذرہ بھی قانونِ قدرت سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ جوہری بم اسی اصُول کی تشریح ہے جو یورنیم دھات کے ایک ذرے کو توڑنے سے وجود میں آیا۔ ذرہ ٹوٹا اور قیامت آگئی۔ یہی فرق انسان کو صرف اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وُہ آزاد ہے۔ اس کا عمل اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن درحقیقت یہی آزادی اس کے تمام مصائب کی بھی ذمہ دار ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ ایک فرض انجام دیتا ہے اور وُہ ہے انسانی خدمت — اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے ذمے کیا کیا فرائض ہیں۔ ارسطو کا قول ہے" جب ایک موچی یا ایک بڑھئی اپنا اپنا فرض انجام دیتا ہے تو کیا بحیثیت مجموعی انسان کے ذمے کوئی فرض نہیں؟" اس سوال کے جواب کی طلب کا نام علم الاخلاق ہے۔ اس سوال کے حل کے لئے فطرتِ آدم کا مطالعہ ضروری ہے۔ علمِ نفسیات کی رُو سے انسان حیوانوں کی طرح کسی فوری جذبہ کے ماتحت حرکت کرتا ہے اور نہ اس کا فعل فقط ادراک پر موقوف ہے انسان کی زندگی کی باگ ڈور اُس کی مرضی کے ہاتھ میں ہے۔ جس میں جذبات و ادراک دونوں کو دخل ہے۔ انسانی حرکات کی دو صورتیں ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری۔ غیر شعوری حرکات کی اقسام حسب ذیل ہیں۔ مثلاً دل کا دھڑکنا۔ آنکھوں کا جھپکنا۔ بچوں کا رونا۔ ہاتھ پاؤں مارنا۔ آگ کو چھوتے ہی ہاتھ کا پیچھے ہٹا لینا وغیرہ — ان تمام حرکات میں شعور یا مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا

حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں لیکن شعوری حرکات سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں مثلاً آپ کو غصہ آتا ہے یہ قدرتی فعل ہے لیکن قصوروار نوکر کو گالی دینا یا مارنا یا معاف کر دینا آپ کے اختیار میں ہے۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے حیوان کو تنگ کرو گے تو وہ مقابلہ کرے گا مگر انسان کیا کرے گا۔ یہ کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ اس کے اخلاق پر منحصر ہوگا۔"

"یہ قدرتی جذبہ کیا چیز ہے؟" میں نے کہا۔

گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔ ہوٹل کا مالک بولا۔ "چائے بس اب کوئی کسر نہیں۔ ذرا ...ا رسے دودھ لینے کے لئے گیا ہوا ہے۔"

مائیکل:۔ جذبہ ایک قدرتی فعل ہے جو مخصوص حالات میں اور مخصوص انداز میں رونما ہوتا ہے ...بلی کی کڑک یا کسی اور قسم کی ڈراؤنی چیخ سن کر انسان وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ اس کیفیت کو ... رہے علمی اصطلاح میں اس فعل کو سہم جانا یا دم بخود ہو جانا یا دبکنا کہتے ہیں۔ یہ مخصوص فعل ...مقصد کے پیشِ نظر وجود میں آتا ہے۔ یعنی بھاگنے کی تیاری۔ بلی یا شیر حملہ کرنے یا بھاگنے سے ...ی عمل کے زیرِ اثر اپنے ناخنوں کو پنجوں کو اندر کر لیتا ہے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ...سانس تیز ہو جاتا ہے۔ یہ انداز بھاگنے یا حملہ کرنے کا پیش خیمہ ہے اور یہی اثرات انسان ...طاری ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مختلف جذبات ہیں۔ ان کی ایک فہرست میں اپنے ...وقت رکھتا ہوں۔ یہ نقشہ نفسیاتی تحقیق میں بڑا کام دیتا ہے۔ میں اس کی مدد سے انسانی ...کے پیچیدہ مسائل حل کیا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک نقشہ میز پر پھیلا دیا۔ جسے میں ...نقل کرتا ہوں۔ اتنے میں چائے بھی میز پر آ گئی۔ واقعی یہ نقشہ تمام انسانی جذبات خواہشات ...ضروریات کا آئینہ تھا۔ چائے میں کوئی لطف نہ تھا۔

انسان کی فطری ضروریات

قدرتی جذبہ	خواہش یا ضرورت	احساسات
(۱) عام جذبات۔ مثلاً کھانا پینا کھیلنا کودنا۔ آرام چاہنا وغیرہ	جسمانی آسائش	بھوک۔ سردی۔ نیند۔ بیقراری وغیرہ

ضرورت اور رغبت کی نفسیات۔ میگڈوگل کا ایک اقتباس

۲۔ دم بخود ہونا	جان کی حفاظت	ڈر۔ خوف۔ دہشت
۳۔ بھاگنا	جان بچانا	سراسیمگی۔ ہراس
۴۔ گڑگڑانا۔ عاجز ہونا۔ خوشامد کرنا۔	جس چیز سے خوف آتا ہو۔ اس کو اپنانے کی خواہش۔ مثلاً حاکم وقت یا آقا وغیرہ جس کی خوشنودی پر زندگی اور روزی کا انحصار ہو	عاجزی۔ ذلت۔ خوشامد کرنے میں مسرت۔
۵۔ ظاہرداری۔ بناوٹ۔ بننا ٹھننا۔ اکڑنا وغیرہ	اپنے ہمجنسوں کی نظر میں۔ (۱) اہمیت حاصل کرنا (۲) عزت (۳) شہرت	خودداری۔ غرور۔ احساس برتری یا کمتری
۶۔ لڑنا یا حملہ کرنا	(۱) نقصان پہنچانا (۲) فتح یا مغلوب کرنا (۳) برتری کی خواہش۔	(۱) غصہ۔ حسد۔ دشمنی۔ نفرت۔ (۲) کسی چیز کو بس میں لاکر تسکینِ قلب حاصل کرنا۔
۷۔ عشق محبت اور جذباتِ شہوانی	صنفِ مقابل کی نظروں میں جچنا اپنی طرف مائل کرنا۔ خواہش وصل وغیرہ	جنسی کشش۔ وصل و فراق کی بے چینی۔ مایوسی اور اداسی۔ لذتِ وصال۔
۸۔ شفقت مہربانی اور ہمدردی	اپنے سے کمزور کی مدد کرنا مثلاً بیوی بچوں کی پرورش۔ دوسرے کمزور انسانوں کی مدد	ہمدردی۔ رحمدلی۔ سخاوت
۹۔ الفت۔ دوستی	اپنے ہمجنسوں کی صحبت	اجنبیت۔ اکیلاپن۔ اداسی
۱۰۔ نقل یا تقلید	اپنے ہمجنسوں جیسا بننا۔ رشک منظم ہونا۔	تعریف۔ توصیف۔ قدردانی مزاح۔ مذاق
۱۱۔ تعاقب کرنا۔	اپنے بس میں لانا	شکار کی جستجو کا لطف اور

		تسکین قلب - کامیابی
۱۲ - تلاش، تجسّس اور تحقیق	دریافت کرنا - خود تجربہ یا مشاہدہ کرنا - نئی معلومات حاصل کرنا - ایجاد کرنا	تسکینِ قلب - ذہنی مسرت کامیابی۔
۱۳ - تعلق رکھنا - وفاداری	اپنے وطن کو واپس ہونے کی خواہش - اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کی خواہش۔	حبُ الوطنی - پاسداری - وضع

"واقعی اس نقشے میں تمام انسانی خواہشات اور ضروریات آگئیں" میں نے کہا۔

مائیکل: آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ضروریات کیا ہیں - انہی ضروریات کی تکمیل پر انسانی زندگی کی مسرتوں کا دارومدار ہے۔ یہی ضروریات انسان کے ہر فعل کی محرک ہیں۔ یہ امر کسی سے مخفی نہیں۔ اب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے - انسان وحشی ہو یا مہذب خواہشاتِ نفسانی اور فطری ضروریات میں کوئی تغیر و تبدل نہ اب تک آیا ہے نہ آئیگا۔ سرشتِ آدم نہ کبھی بدلی ہے نہ بدلے گی مختلف زمانوں میں فرق یہی ہوتا ہے کہ ان خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ وحشی انسان اور جانور انہی ضروریات کو فطری جذبات سے مغلوب ہو کر بغیر کسی تصنع یا بناوٹ کے پورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن مہذب انسان دوسرے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ مثلاً ایک مہذب انسان دوسرے مہذب انسان سے نفرت کرتا ہے تو غصے میں آکر اس پر حملہ کرنے کی بجائے جو ایک بالکل فطری فعل ہے۔ وہ غصہ کو دبا لیتا ہے اور اپنے دشمن کو کسی اور طریق سے نقصان پہنچانے کی تدبیر کرتا ہے جو مارپیٹ سے زیادہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح برتری حاصل کرنے کے لئے وہ بناوٹ کا مظاہرہ کرنے کی بجائے، کونسل کی رکنیت حاصل کرنے یا ایورسٹ کی چوٹی کو . . . . . . تسخیر کرنے میں تسکین ڈھونڈتا ہے! اس سے پہلا نتیجہ یہ

یہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر ایک ذی شعور انسان کا اخلاق دوسرے انسان سے اس لئے مختلف ہے کہ اُس نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے جُداگانہ ذرائع اختیار کر لئے ہیں۔ یہ تمام جذبات و خواہشات ہم سب میں موجود ہیں۔ مگر ان کی شدتِ احساس میں فرق ہے۔ کسی میں غرور و تکبر زیادہ ہے تو کسی میں محبت اور ہمدردی۔ دوسرا نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ کوئی فطری جذبہ یا نفسانی اقتضا بذاتِ خود اچھا یا بُرا نہیں لیکن تسکینِ خواہش کا ذریعہ اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عشقیہ یا شہوانی جذبات کی تسکین ایک فطری اقتضا ہے۔ یہ مختلف طریقوں سے ادا ہو سکتا ہے مثلاً بالجبر سے۔ کسی کو زر کا لالچ دے کر یا خرید کر یا جائز طور پر نکاح کر کے یا داشتہ بنا کر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسا طریقہ اچھا اور انسان کے شایانِ شان ہے؟ —— اس مضمون پر آئندہ بحث کریں گے! آج کی شام فلم دیکھا جائے۔"

احباب چلنے کے لئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

دوسرا باب

زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا طریق ۔ اخلاقیات ۔ فلسفہ ۔ توہم اور دینیات

آج ایک عزیز دوست کی آمد کے سلسلے میں مَیں اور مائیکل دوپہر کو ہی ریستوران میں آ بیٹھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کیا: "اچھا تو مائیکل صاحب! یہ بتایئے کہ انسان کی فطری ضروریات کی تکمیل کس طریق سے کی جائے؟ یہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ زندگی کا سیدھا، سچا اور بہترین راستہ کون سا ہے؟"

مائیکل: کل کی گفتگو میں اس بات کی وضاحت ہو گئی تھی کہ انسانی اعضا کو حرکت میں لانے والی طاقت اس کی فطری ضروریات ہیں۔ ان ضروریات کے علاوہ انسان کے گرد و پیش بیشمار جاندار اور غیر جاندار اشیا ہیں جن کا اس کی زندگی سے تعلق ہے۔ انسان کا ان کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔ ان تمام معاملات میں اس کو فہم و ادراک سے کام لینا پڑے گا۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ اس کی رہنمائی کریں گے اور اس طرح وہ ایک رائے قائم کرے گا۔ اسی رائے پر وہ ایک رویہ یا طرز زندگی کو اختیار کرے گا۔ مثال کے طور پر ایک بچہ آگ کو کھلونا سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک جاہل آتش پرست آگ کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کرتا ہے۔ ایک سائنس دان آگ کو علمی طور پر تحقیق کر کے یہ معلوم کرتا ہے کہ آگ ایک کیمیائی فعل ہے اور اس سے بہت کام لئے جا سکتے ہیں۔ سائنسدان کا رویہ جاہل اور بچے کے رویئے سے بالکل مختلف ہوگا۔ کیونکہ جاہل کی رائے کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے اور بچہ کی رائے تجربہ کی بنا پر رد ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص جب تک ان اہم امور پر مثلاً زندگی کا مقصد کیا ہے؟ زندگی کا بہترین راستہ کون سا ہے؟ اس دُنیا کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ موت کے بعد بھی

کوئی زندگی ہے یا نہیں ، کے متعلق ایک واضح رائے قائم نہ کرے۔ وہ اپنے لئے نہ کوئی منزل تجویز کر سکتا ہے اور نہ کوئی راستہ۔ اور جس کی کوئی منزل نہ ہو وہ سوائے بھٹکنے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ان سوالات کا آپ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ، یا صرف سائنس دانوں فلسفیوں اور مذہبی رہنماؤں کے مشاغل ہیں ــــ نہیں بلکہ ہماری تمام زندگی کا دارومدار ان سوالوں کے جواب پر ہے۔ فرض کیجئے۔ دو اشخاص اپنے وطن سے روانہ ہوتے ہیں۔ ایک کی منزلِ مقصود بمبئی ہے اور دوسرے کی لندن۔ ان دونوں کی سفری تیاری میں جو فرق ہوگا۔ وہ صاف ظاہر ہے بمبئی پہنچ کر ایک کا سفر ختم ہو جائے گا اور ساتھ ہی اُس کی صعوبت بھی ــــ لیکن لندن جانیوالے کو بمبئی پہنچ کر بھی اگلے سفر کے لئے مزید تیاری اور تردّد کرنا پڑے گا۔ اس کے نزدیک حقیقی سفر پھر شروع ہوگا۔ بمبئی تک کا سفر اُس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھے گا۔ یہی مثال بالکل ہم پر بھی صادق آتی ہے۔ فرض کیجئے۔ آپ کی رائے میں حیات بعد الموت کوئی حقیقت نہیں یعنی آپ کا سفرِ زندگی بس موت کے گھاٹ تک محدود ہے۔ دوسرا شخص یہ رائے رکھتا ہے کہ اس گھاٹ سے گذرنے کے بعد اسے ایک دُوسری دُنیا میں جانا ہے، جہاں پہنچ کر اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا ہے۔ غور کیجئے، آپکے اور اس شخص کے رویّے میں کتنا فرق ہوگا۔ اس لئے سعید بھائی ان سوالات کا حل بڑی اہمیّت رکھتا ہے"۔

مائیکل واقعی سچ کہہ رہا تھا: "مگر ان سوالات کا حل بھی تو بتاؤ"۔ میں نے کہا

مائیکل :۔ بس اسی نقطہ پر پہنچکر زندگی کی سب سے بڑی اُلجھن پیش آتی ہے یعنی ان تمام سوالات کا حل کہاں سے حاصل کیا جائے۔ مشکل تو یہی ہے کہ نہ تو ان سوالات کا حل آسمان پر لکھا ہوا مل سکتا ہے کہ اسے پڑھ کر ہر کوئی اس پر عمل پیرا ہو اور نہ کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان فطرتاً آگاہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جوابات بھانت بھانت کے ہیں جتنے منہ اُتنی باتیں ــــ کس کا کہا مانا جائے۔ اسی لئے میں استدلالی منطقی اور علمی تحقیق سے کام لیتے ہوئے کسی واضح اور جامع نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں"۔

"تو آپ نے اس کا کیا حل ڈھونڈا ہے"؟ میں نے سوال کیا۔

مائیکل: "میں بتدریج آپ کو اس حل تک پہنچا دوں گا۔ اتنی جلدی نہ کیجئے۔ اب تک دنیا میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے تین طریقے اختیار کئے جا چکے ہیں اور یہی امکانی ذرائع بھی ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدات، تجربات اور علمی تحقیق سے کام لیتے ہوئے ان مسائل کے متعلق کوئی نظریہ قائم کیا جائے۔ اس طریق کار میں مفروضات کا کوئی دخل نہ ہو اور سوائے ٹھوس حقیقت کے کوئی بات قیاس نہ کی جائے۔ یہ ہے نظریۂ تحقیق۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فہم و ادراک، قیاسات، وہم و گمان اور دلائل کی اعانت سے کسی نتیجہ تک پہنچا جائے۔ یہ ہے فلسفیانہ نظریہ۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ مختلف مذاہب کے بانیان مثلاً پیغمبر، نبی، اوتار، رشی منی وغیرہ بتا چکے ہیں۔ ان پر یقین کر لیا جائے اور اس طرح تمام سر دردی سے نجات پا کر ایک راستہ اختیار کر لیا جائے۔ یہ ہے دینیاتی نظریہ۔ مگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ تلاش، تجسس اور تحقیق اس کے فطری تقاضے ہیں۔ لہٰذا یہ تحقیق کرنا ہی ہوگی۔ جب سے انسان نے شعور سے کام لینا شروع کیا ہے۔ دو نظریے ایک دوسرے کے مدمقابل رہے ہیں۔ ایک گروہ اس خیال کا حامی رہا ہے کہ انسان کی فطرت قطعاً جذباتی ہے۔ اس لئے اس کا مقصدِ حیات خواہشاتِ نفسانی کی بیدریغ تسکین یعنی تعیش اور لہو و لعب ہونا چاہیئے! ــــ مخالف گروہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات اسلئے کہلاتا ہے کہ وہ شعور یا فہم و ادراک کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی زندگی بالکل غیر جذباتی ہونی چاہیئے"۔ ......

مائیکل یہاں تک کہنے پایا تھا کہ شام لال جس کا انتظار تھا آ پہنچا۔ شام لال ہم دونوں کا باہمی دوست ہے۔ عجب شخصیت کا مالک ہے۔ آتے ہی بولا "مائیکل تمہاری یہ چرب زبانی کب ختم ہوگی؟ ــــ کوئی کام کی بات کرو۔ میں اتنی دور سے تم لوگوں کی خاطر یہاں آیا ہوں اور آج کی رات آخری ہے۔ موسم بھی خوشگوار ہے۔ ایک الوداعی مجلس ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں وہ زاہدِ خشک انصر بھی آ جائیگا۔ آج اس کو بھی لے چلو"۔

مائیکل: "شام بیٹھو تو سہی، ابھی چلتے ہیں۔ پارٹی کا سب سامان تو تیار کر لو۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہوٹلوں میں کیسا کھانا ملتا ہے۔ اپنا پکوا کر لے چلو۔ کچھ بھنا ہوا گوشت، مچھلی کے ڈبے

بنیر اور ٹماٹر۔ بھئی اچھی غذا نہ کھاؤ گے تو جیو گے کیسے۔ جب تک ہم باتیں کریں گے تم بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے ہو۔ پہلے اس سوال کا جواب دو۔ تمہاری رائے میں زندگی کا مقصد کیا ہے"۔

شام لال:۔ میں تو اتنا جانتا ہوں اور زیادہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ جب حال ہی ایک حقیقت ہے۔ مستقبل کی نہ کسی کو خبر ہوئی ہے نہ ہو گی۔ پھر حال کی مسرتوں کو ٹھکرا کر عاقبت کے سہانے خوابوں میں زندگی بسر کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ آئندہ کی فکر کرنا زندگی کا لطف کھونا ہے۔ زندگی کا مقصد ہے۔ مسرت چاہے وُہ ایک لمحہ کیلئے ہی کیوں نہ ہو۔ وُہی زندگی مسرت آگیں ہے جس میں شعور کو کوئی دخل نہ ہو اور فطری خواہشات جذباتی طور پر تسکین پائیں ؎

مانا جنت کی فضا ہے سحر کار — اب تو ہم ہیں اور ہے یہ روزگار
وعدۂ فردا ہے کتنا خوش فریب — مے کی نہریں اور حوریں بے شمار
یہ جہاں فردوس سے کچھ کم نہیں — ہر طرف ملتے ہیں نخلِ میوہ دار
ہر طرف فردوس کی رنگینیاں — گل بدن ساقی سرودِ آبشار
ساری دُنیا جب فنا انجام ہے — کل کے آنے کا کرے کون انتظار
سود کے لالچ میں دے دوں نقد مال — یہ تجارت کیوں کروں میں اختیار
"زندگی زندہ دلی کا نام ہے" — دل کی دُنیا میں رہے کیوں انتشار
خود کو کر دے عشق کے زیرِ نگیں — عقل کو تجھ پہ نہ ہو کچھ اختیار

زندگانی ختم ہوتی ہے یہیں
موت ہے اور اس کے آگے کچھ نہیں

بس میرا تو سیدھا سادہ یہی فلسفہ ہے۔ میں تو عمر خیام کا پیرو کار ہوں۔ مغربی فلسفی ہیوم بھی یہی راگ الاپتا ہے۔ گلشن میں بہار سدا نہیں رہتی۔ چاند کو بھی کبھی کمال ہے اور کبھی زوال۔ حیات بعد الموت اور دُنیا کی ابتدا اور انتہا پر غور کرنا کمزور انسانی ذہن کو خواہ مخواہ پریشان کرنا ہے۔ کثرتِ علم رنج کا موجب ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے مسرت کی تلاش کرو۔ خوب کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ یہی حقیقت ہے جو خُدا کی عنایت کردہ چند روزہ زندگی میں کام آ سکتی ہے"۔

مائیکل :- مگر نام صاحب، مشرق ہو یا مغرب۔ مسرت کا طالب جب بھی سنجیدہ ہوتا ہے تو اس کا ضمیر پکار اُٹھتا ہے کہ عارضی مسرت انسان کے شایانِ شان نہیں۔ انسان اشرف المخلوقات اسی لئے کہلاتا ہے کہ اپنے ماضی حال اور مستقبل پر غور کر سکتا ہے۔ اور اس کی وساطت سے وُہ اپنی تمام زندگی تعمیر کر سکتا ہے۔ ایک کامیاب جذباتی زندگی کے لئے بھی عقل و دانش کی رہنمائی ضروری ہے۔ اس لئے اس نظریئے کے حامی بھی اپنے اس فلسفہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ خرد کے بغیر مسرتِ دوام کا حصول غیر ممکن ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

چند لمحوں کے جو سُکھ پر ہو نثار ۔۔۔ دہر میں اکثر ہوا کرتا ہے خوار
عقل سے ہے فوقیت انسان کو ۔۔۔ اس کو ہر ذی روح پر ہے اختیار
یہ نفس اک سانپ ہے پھنکارتا ۔۔۔ عقل ہی کر سکتی ہے اس کو شکار
ہے خرد سے حق و باطل کی تمیز ۔۔۔ پھول چُن لو چھوڑ دو خاشاک و خار

دل تو خود ہے خواہشوں کا اک غُلام
حکمرانی سے نہیں کچھ دل کو کام

اس طرح ایک استدلال پسند گروہ وجود میں آیا جن کی نظر میں عقل و دانش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زندگی کا مقصد عشرت نہیں بلکہ دوامی مسرت اور ابدی راحت ہے۔ اسی مسئلہ پر زیادہ غور و فکر نے اسی گروہ کو قنوطیت پسند بنا دیا۔ جب مسرت کے معنی یہ ہیں کہ رنج و غم انسانی زندگی سے مفقود ہوں تو پھر ہر جذبہ و خواہش کی تسکین کے لئے تگ و دو کرنا بیکار ہے جب خواہش ہی نہ ہو تو تسکین کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ کیوں نہ ہر ضرورت سے انسان بے نیاز ہو جائے کیونکہ سب سے زیادہ امیر وُہ نہیں جس کے پاس سب سے زیادہ مال و دولت ہے بلکہ وُہ انسان ہے جس کی ضروریات برائے نام ہیں۔"

رُستوران کا مالک بول اُٹھا:- میرا بھی یہی خیال ہے۔ چند اشعار اس کے متعلق سنئے :-

دل تو رہتا ہے ہمیشہ بے قرار ۔۔۔ دل ہے اک اور آرزوئیں بے شمار
ایسے نادان کو بھلا بہلائے کون ۔۔۔ ہر حسین شے سے اُسے ہوتا ہے پیار

حسن سے وابستگی ہوتی نہیں — حسن ہر اک شے میں ہے ناپائدار
کس طرح ممکن ہے پھر دائم سکوں — جب اساسِ دل نہیں ہے استوار
اس جہاں میں تو بھی مثلِ سنگ رہ — غم خزاں کا کچھ نہ کچھ رنجِ بہار

دل کو اپنے اس طرح قابو میں کر
یاس و حرماں بھی ہو تجھ پہ بے اثر

اسی دوران میں زاہدِ خشک انصر صاحب بھی آ پہنچے تھے۔ فرمانے لگے:۔

انصرؔ۔ ان خیالات سے ظاہر ہے کہ مقصد بیشک تسکینِ جذبات ہے مگر ذریعہ جذباتی نہیں بلکہ شعوری ہے۔ دانشمندی اور ابدی مسرت ایک ہی حبیب کے دو نام ہیں عقلمند انسان کی زندگی جذبات سے بالکل عاری ہونی چاہئے۔ اپنی خواہشاتِ نفسانی پر کامل عبور رہے تاکہ کوئی جذبہ سرکشی نہ کرنے پائے۔ عقل ایسی ڈھال کا کام دے جس پر حرص و ہوا اور حوادث کے تیر بے اثر ہو کے رہ جائیں۔

عقل سے ہی آدمی کا ہے وقار — یہ فلک بھی جس کی ہے اک رہگذار
عقل کو جذبات سے کیا واسطہ — دل ہو تابع اور خرد ہو تاجدار
فطرتی جذبے سے کر حاصل نجات — راہبانہ زندگی تو پھر گذار
مردِ حق کردار بھی معراج ہے — جاوداں ہے جیسے گردوں وقار

شام لالؔ۔ لیکن انصر صاحب یہ پند و نصیحت زندگی کی دلکشیوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ ایسی نفس کشی نے تو اس خیال کے حامیوں کو دُنیا سے کنارہ کرنے کا سبق سکھایا مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں ؎

بُزدلی ہے یہ نہیں مردانگی
چھوڑ کر دُنیا سنبھالے ایک غار

انصرؔ۔ آپ نہ مانیں مگر حکیم ارسطو اور افلاطون جیسی جلیل القدر ہستیوں کے نزدیک بھی وُہی زندگی افضل اور برتر تھی جس میں جذبات کو دخل نہیں تھا۔"

شام: میں بھی جانتا ہوں۔ وہ دنیا کو ایک شہر تصور کرتے تھے جس میں سب انسانوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل تھے مگر اس دنیا میں انکو اپنے سنہرے خوابوں کی کوئی تعبیر نہ مل سکی۔"

مائیکل: عیسائیت میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ یعنی انسان کی جسمانی موت میں ہی اُس کی روحانی زندگی کا راز مضمر ہے۔ ایک سچا عیسائی حضرت عیسیٰ کا پیروکار ہونا چاہیئے یعنی نفس کشی اور ریاضت کا مجسمہ۔ انجیل میں یہی لکھا ہے کہ جو شخص اپنی جان کو بچاتا ہے وہ عاقبت کی زندگی کھوتا ہے اور جو اس زندگی کو قربان کرتا ہے۔ دوبارہ زندگی پاتا ہے۔" عیسائیت نے بھی انسانوں کو رہبانیت کا درس دیا۔ عیسائیت کو دنیاوی زندگی سے بہت کم واسطہ ہے۔ یہ زندگی ایک یاترا ہے اور اعلیٰ و بہتر زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے۔ جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے۔ مگر علمی تحقیق سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ تمام انتہائی اور معتدل محسوساتی نظریئے اور شعوری نظریئے خام ہیں۔ کیونکہ انسانی فطرت کے دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں ؎

عقل ہے دل کیلئے اک خضرِ راہ عقل ہے دل کے بغیر اک خانقاہ
چولی دامن کا ساہے دونوں کا ساتھ حُسن ہے گر عقل تو دل ہے شباب

النصر: مائیکل صاحب اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ عیسائی ہوتے ہوئے بھی عیسائیت کے عقیدوں کو قبول نہیں کرتے۔"

مائیکل: دنیا میں یہ مذموم رسم اب تک جاری ہے کہ انسان جس خاندان میں پیدا ہو۔ اس کے مذہب کو اپنا بھی مذہب قرار دے۔ آپ اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں۔ کیونکہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ سوسائٹی کے قانون ایسے ہی ہیں کہ کوئی بھی سرکشی کرنے کی مجال نہیں رکھتا۔ انسانیت کو غلامی میں جکڑنے والی یہ کڑی زنجیریں توڑ کے رکھ دینی چاہئیں۔ مذہب دل سے ہوتا ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ تمام مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے لئے ایک مذہب یا زندگی کیلئے۔ ایک راستہ چن لے۔ اس لئے میں ان تمام راستوں کو زیرِ بحث لا رہا ہوں۔ تاکہ آپ بھی کسی واضح اور روشن نتیجہ تک پہنچ جائیں۔ اُمید ہے کہ روزانہ ملاقات ہوتی رہے گی اور یہ سلسلۂ تحقیق جاری رہے گا۔ میرا جو

نظریہ ہے۔ وہ آپ پر واضح ہو جائے گا۔ اس وقت ہم پہلے طریقے سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اتنے میں ریستوران کے مالک نے آواز دی کہ کھانے کا سب سامان تیار ہو چکا ہے۔ جھٹ شام اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "مائیکل صاحب، باقی آج رات کی محفل میں۔ اب چلنے کی کیجیے۔"

ہم چاروں فردوس کا تصور لئے ہوئے چل دیئے۔ حور وش ساقی اور دہکتی بہاریں ہمارے انتظار میں تھیں۔

تیسرا باب

نظریہ خودی۔ تکمیل خودی کی تعریف۔ انفرادیت اور شخصیّت میں فرق۔ انفرادی زندگی کا قانون

انصر زاہد تھا اور شام عمرِ خیام ـــــ زاہد کو توبہ توڑنا ہی پڑی۔ کیونکہ حوروں کا اصرار توبہ شکن ہوا کرتا ہے۔ انصر عجب مخمصے میں گرفتار تھا کہ اتنے میں مائیکل بولا۔ "انصر صاحب! آپ کے عقیدہ کے مطابق آپ دُنیا میں اس لئے آئے ہیں تاکہ اگلے جہان یعنی جنت کی تیاری کر سکیں تو پھر جب یہاں پینا اور نازنینوں سے ملنا نہ سیکھو گے تو جنت میں جا کر شراب کی نہروں اور حوروں سے کیا لطف اُٹھا سکو گے۔ شاید وہاں بھی جا کر شام صاحب سے درس لینا پڑے۔ ممکن ہے وہاں شام صاحب اسی مضمون کے مدرس مقرر کر دیئے جائیں۔ اُنہوں نے کبھی کسی انسان کی دلآزاری نہیں کی۔ اُن کا دل سونا ہے سونا اور میرے نزدیک یہی انسانیت ہی سب سے مقدّس مذہب ہے"!

انصر: "تو آپ کے نزدیک یہ کوئی بڑا گناہ نہیں؟"

مائیکل: "گناہ کیا ہوتا ہے۔ اس پر اطمینان سے بحث کریں گے فی الحال تو شام کے فلسفہ پر عمل پیرائی کا تجربہ کر لو اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے فلسفہ کو جامِ رنگین میں غرق کر دو"۔

آخرکار انصر کو دختِ رز منہ سے لگانا ہی پڑی۔ بڑا منہ بنایا۔ بہت بڑبڑایا۔ مگر چند منٹ

بعد جب کیف و سرور کے جھونکے چلے تو اُس نے ساقی کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ساقی سے غزل چھیڑنے کی درخواست کی۔ شام اُچھل پڑا۔ "ہاں ہاں۔ ضرور گانا ہونا چاہئیے۔ مجھے گانا بہت پسند ہے"
فضا میں ارتعاش پیدا ہوا اور ساقی نغمہ طراز ہوا۔

آبِ حیواں کو مے سے کیا نسبت — پانی پانی ہے اور شراب شراب
مجھ سے وجہِ گناہ جب پوچھی — سر جھکا کر کہا شباب شباب
رند بخشے گئے قیامت میں — شیخ کہتا رہا حساب حساب

خوب حسب حال غزل تھی۔ شام مائیکل کے اصرار کے باوجود بھی جام پر جام پیئے جاتا تھا اور یہ دلیل پیش کرتا تھا کہ جب پینا ہی ٹھہری تو خوب پیو۔ ادھوری مے نوشی کس کام کی ہے۔ ہر روز یہ گھڑی کب نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ کل میں تم سے بچھڑ رہا ہوں۔"
اس کے بعد وہ جھوم جھوم کر دیہاتی گیت سنانے لگا۔ اُس کی باتیں۔ اُس کے گیت بہت پُر لطف ہوتے ہیں۔ عجب زود فطرت اور متلون مزاج انسان ہے۔ انصر بھی ترنگ میں تھا بولا۔" مائیکل صاحب، اب بتائیے گناہ کیا ہوتا ہے اور علمی تحقیق کی رُو سے زندگی کا مقصد کیا ہے؟"
مائیکل: "زندگی جینے کا نام ہے۔ اس لئے ہر ذی رُوح مخلوق انسان ہو یا حیوان، اُس کا لازمی فرض ہے یا فطری تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی ذات کی پرورش کرے۔ اپنی جان کی حفاظت کرے اور اس کی نشو و نما کے لئے کوشاں رہے یا دو لفظوں میں۔ اپنی ذات کی تکمیل کرے یعنی ذات یا خودی میں انسانی فطرت کے دو پہلو جذباتی اور شعوری اپنی اپنی جگہ تسکین اور ارتقا حاصل کریں۔ اس دُنیا میں جہاں جینے کے معنی جد و جہد ہیں۔ اپنی ذات کے لئے ایک مقام اور زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل بنانا ہی عالمگیر قانونِ حیات ہے۔ اخلاقیات کے دوسرے نظریئے بھی اسی مقصد کو پیش کرتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ محسوساتی نظریئے میں نفسانی ضروریات کی تکمیل مدِ نظر ہے اور شعوری نظریئے صرف روحانی اور ادراکی تکمیل چاہتے ہیں۔ لیکن نظریۂ خودی کے

---

* کیفی ملتانی کی ایک مشہور غزل کے چند شعر۔

پیشِ نظر دونوں پہلوؤں کی تکمیل ہے۔ انسان ہی اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وُہ ایک علیحدہ خودی۔ ذات یا انفرادیت کا مالک ہے اور اس طرح وُہ اپنے ہم جنسوں میں بھی ایک علیحدہ ہستی قائم رکھتا ہے اور یہی وُہ صفت ہے جو اسے حیوانوں اور تمام جانداروں میں ممتاز کرتی ہے۔ شخصیت کی تعریف ہی یہ ہے کہ خودی کو انفرادیت سے بہت بلند درجہ حاصل ہے۔ انفرادیت تو ہر حیوان اور جاندار چیز میں موجود ہے۔ اسی لحاظ سے ہر فرد اپنی اپنی جگہ زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسرے افراد سے برسرِ پیکار ہے۔ انسان بھی انہی معنوں میں جیو۔ ان سے مختلف نہیں ہے۔ جنگلی زندگی کا قانون "زبردستی حق بجانب ہے"۔ ایک فطری امر ہے اس لئے انسان کی زندگی کا بھی یہی اُصول ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسی نقطہ پر پہنچ کر حیوان اور انسان کے دو الگ الگ راستے ہو جاتے ہیں۔ انسانی قانون اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ انسان کی زندگی کا قانون "راستی ہی طاقت ہے" میں تبدیل ہو جائے اور یہی فرقِ اخلاق کا پیش خیمہ ہے۔ انسان ایک فرد ہونے کے علاوہ ایک خودی کا بھی مالک بن جاتا ہے۔ حیوان کیلئے تو فطرت کی طرف سے ایک راستہ معیّن ہے اور وُہ اپنی زندگی میں اسی پر گامزن رہتا ہے اور اس طرح اپنی ذات کی تکمیل کر لیتا ہے۔ فطرت ہر کام انجام دیتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے اُس کے ساتھ کوئی اخلاق منسوب نہیں کیا جاتا۔ شیر کبھی گھاس نہیں کھاتا اور گائے کبھی گوشت نہیں کھاتی۔ کیا آپ نے کبھی سُنا کہ فلاں حیوان کا چال چلن بڑا خراب ہے یا وُہ گناہ کرتا ہے۔ کبھی نہیں۔ حیوانی زندگی تو جذبات کی فوری تسکین کا نام ہے اور وُہ فطری طریق پر انجام پاتی ہے۔ حیوان کو شعور سے مدد لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بھُوک لگی تو کھا لیا۔ نیند آئی تو آرام کر لیا۔ اس کے لئے نہ ماضی کوئی حقیقت رکھتا ہے اور نہ مستقبل۔ حال کی ضروریات کی تسکین ہی اس کا نصب العین ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے راستے سے وُہ کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ مگر انسان میں فطری جذبات اور ضروریات تو موجود ہیں مگر فطرت نے اُس کے لئے کوئی قانون مقرر نہیں کیا۔ اس لئے اس کو اپنا راستہ آپ ڈھونڈنا پڑتا ہے یا دوسرے انسانوں کی ہدایات کے موافق عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے فطرت نے انسان کو فہم و ادراک بخشا تا کہ اس سے مدد لے سکے۔ انسان خود ہی اپنا آقا ہے

اور خود ہی اپنا غلام۔ وُہ فطرتاً آزاد ہے۔ اپنی حرکات خود ہی تجویز کرتا ہے اور خود ہی اُن پر تنقید کرتا ہے اس لئے اپنی زندگی کا معمار خود ہے۔ چاہے بنائے یا بگاڑے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آیا وُہ جذبات کا مالک ہے یا غلام۔ تکمیلِ خودی میں کامیابی یا ناکامیابی کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ وُہ اپنی فطری ضروریات کس طریق سے پوری کرتا ہے۔ یہی رازِ خودی ہے۔"

انصر: "اس علمی نظریئے سے تو یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ ہر انسان کو ایک قانونِ حیات کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ مذہب بھی تو اسی نقطہ پر اپنی ہدایات پیش کرتا ہے۔ پیغمبر، رسول یا نبی وُہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات اسی لئے ہے کہ اسے اپنے لئے قانونِ زندگی اختیار کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ہم کو خدا نے وُہ قانون انسانوں تک پہنچانے کا فرض سونپا ہے۔ کیونکہ خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اس لئے قانونِ زندگی یا بہترین طریقۂ زندگی سے انسان کو آگاہ کرنا بھی خدا کا فرض ہے۔"

مائیکل: "آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں تو صرف یہی رائے دے رہا ہُوں کہ کوئی قانونِ زندگی اپنانے سے پہلے اسے حقیقت کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے کہ وُہ انسانی ضروریات بھی پُوری کرتا ہے یا نہیں۔ آخر خُدا نے فہم و ادراک یُونہی بیکار تو عطا نہیں کیا۔ اگر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا مقصود ہوتا تو انسان کو بھی حیوانی راستہ پر لگا سکتا تھا۔"

اتنے میں شام جو بہت پی گیا تھا اُس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہُوئی اور وُہ قے کرنے لگا محفل کا رنگ بدمزہ ہو گیا۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے تانگہ پر سوار کر کے روانہ کیا۔ سب احباب اگلے دن کا ملنے کا وعدہ کرتے ہُوئے رُخصت ہُوتے!



چوتھا باب

انفرادی زندگی

آج اتوار تھا۔ اتوار کو کبھی صبح سویرے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے۔ کہ آج دل بھر کے سو رہو۔ چھ دن کی قید کے بعد ساتواں دن آزادی کا ہوتا ہے اور آج تو خاص طور پر طبیعت آرام چاہتی تھی۔ شاید یہ کل رات کے جشن طرب کا نتیجہ تھا۔ مائیکل صاحب سے اُس کی نفسیات پر مذاکرہ ہے گا۔ دوپہر تک شام اور انصر بھی آ گئے۔ ریستوران میں محفل حسب معمول گرم ہو گئی۔

شام "کل رات تو میرا بہت برا حال ہوا۔ ساری رات پانی پی پی کر گذاری۔ سر میں اب بھی شدت کا درد ہے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب اُٹھا ہوں۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ لیٹا ہی رہوں یہ شراب بھی کیا چیز ہے۔ بادۂ زریں میں کتنی کشش ہے۔ مگر بعد کے اثرات بہت خراب ہیں آئندہ میری توبہ جو اتنی پیوں۔ ماں بھی ناراض ہے اور بیوی الگ منہ پھلائے بیٹھی ہے۔"

مائیکل "۔ اسی لئے رات میں نے قانونِ زندگی پر بحث شروع کی تھی۔ اب بھی عقل سے کام لینا سیکھو۔ شراب سے بھی وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جو انفرادی زندگی کے اُصول پر عمل کرے۔ پرہیز یا اعتدال پسندی یا اپنی ذات سے محبت یا اپنے جذبات پر قابو یا اپنی نفسانی خواہشات پر عبور۔ یہ سب ایک ہی اصول کے مختلف نام ہیں۔ اخلاقاً کوئی خواہش نفسانی اچھی

ہے نہ بُری۔ لیکن اس کی تسکین کا ذریعہ یا طریقہ اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ کل رات کی بحث میں یہ بات طے ہو گئی تھی کہ تکمیلِ خودی ۔۔۔ مقصدِ حیات ہے۔ زیادہ شراب نوشی سے آپ نے یہ اُصول توڑ دیا اور اپنی ذات کی حفاظت اور پرورش کی بجائے اپنے جسم کو تکلیف پہنچائی۔ چند ساعتوں کے لطف کیلئے ایک رات اور دن کرب و اضطراب میں گذارا۔"

انصر: اسی بنا پر تو میں نے کہا تھا کہ جب کوئی شخص اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ جس کو اپنے جذبات پر قدرت نہ ہو۔ اُس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ شراب نوشی سے پرہیز کرے اس لئے اسلام نے مسلمانوں کے لئے شراب حرام کر دی۔ کیونکہ پینے کے لئے ایک مقدار مقرر کرنا مشکل امر تھا۔ مثال کے طور پر سعید صاحب آدھی بوتل بھی پی جاتے ہیں تو نشہ نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مائیکل صاحب دو جام پیتے ہی مخمور ہو جاتے ہیں اور اصرار کرنے پر بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس لئے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے عملی طریقہ یہی ہے کہ نفس کشی کی جائے۔"

مائیکل: آپ کا کہنا بجا ہے مگر اعتدال پسندی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ہی جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بیشک اگر ایک شخص بار بار کے تجربہ سے یہ جان گیا ہے۔ کہ وہ اپنی حد کے اندر نہیں رہ سکتا تو اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ بالکل اجتناب کرے۔ لیکن جو شخص اپنے جذبات پر عبور رکھتا ہے۔ اپنی حد کے اندر رہنا جانتا ہے۔ اس کو حق ہے کہ وہ شراب نوشی سے بھی حظ اُٹھا سکے۔ شراب کی اتنی مقدار پیئے جس سے اس کو یا کسی کو کوئی جسمانی یا اخلاقی گزند نہ پہنچے۔ ورنہ وہ اپنی ذات کو نقصان پہنچا کر خود ہی ظالم و مظلوم ہوگا۔ اس لئے اپنی ذات سے عشق پہلا اُصول ہے جو شخص اپنی ذات سے عشق کرنا نہیں جانتا۔ وہ دوسروں سے کیا عشق کر سکتا ہے عشقِ ذاتی سے یہ مراد ہے کہ اپنی جسمانی۔ دماغی اور اخلاقی قوتوں کو نشو و نما دی جائے انفرادیت کو شخصیت میں بدل دیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصل تربیت وہی ہے جس سے کسی فرد کی اپنی فطری قوتیں کمال حاصل کریں۔ خوش قسمت ہیں۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ قدرت نے ان کو کس کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ اُن کی خواہشات کیا ہیں؟ اُن کی ذاتی صفات کیا ہیں؟ اور پھر اُن کی نشو و نما کے لئے جدوجہد میں مصروف ہو گئے اور جنہوں نے زندگی کی منزلیں طے کرتے

ہوئے اپنے نصب العین کو پا لیا۔ ہندوستان میں ایسے خوش نصیب افراد بہت کم ہیں بیشتر افراد
کی زندگی تو بس ایک چکر ہے۔ جسم حرکت کرتا ہے۔ ہاتھ کام دیتے ہیں مگر روح بے چین رہتی ہے
دماغ کرب و اضطراب میں مبتلا رہتا ہے مگر پیٹ کے دوزخ کے آگے بس نہیں چلتا۔ روزی
کے لئے ان کو وہ پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے ان کو نفرت ہے۔ مثلاً اپنے سعید صاحب
شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں لیکن پیشہ ان کا کلرکی ہے۔ اکثر افراد کے جذبات مردہ ہو جاتے
ہیں۔ بعض اپنے پسندیدہ شغل کو شوقیہ طور پر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ظاہر
ہوتا ہے کہ خواہش ابھی زندہ ہے۔ ابھی اس میں دم خم باقی ہے۔ کاش ان کو کوئی اپنی حقیقی منزل
تک پہنچانے میں سہارا دے سکے! وہ لمحات کس قدر مسرت آگیں ہیں جو اپنے محبوب مشغلہ کے
لئے صرف ہوتے ہیں! جسم اور روح اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ کام کے بعد اس کی محنت کا ثمر
اس کے سامنے آتا ہے۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا ہے۔ یہ ہے مخلص کام۔ ہر فرد ایک سیارہ
ہے اور ہر سیارہ کے لئے گردش اور منزل کا مقام ہوتا ہے۔ اس طرح ہر فرد کے لئے بھی قدرت
نے ایک جداگانہ راستہ مقرر کیا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا۔ اپنی ضروریات کو جاننا کس قدر ضروری ہے
آپ کس کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں؟ قدرت آپ کی ذات سے کیا کام لینا چاہتی ہے؟ اگر نہیں
معلوم تو جاننے کی کوشش کرو اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاؤ۔ کامیابی آپکے قدم چومے گی! یہ
تمام عشقِ خودی کی بدولت ہو سکتا ہے۔



پانچواں باب

اجتماعی زندگی

دوپہر کے بعد مائیکل۔ انصر اور میں شام کو ریل پہ سوار کرنے کے لئے گئے۔ وہ واپس اپنے کام پہ جا رہا تھا۔ احباب پہ اُداسی کی کیفیت طاری تھی۔ یہ سوسائٹی کی بھی خواہش انسانی فطرت کا ایک اہم جزو ہے! ــــ انسان فطری طور پہ سماجی حیوان واقع ہوا ہے۔

مائیکل بولا۔ "بیشک انفرادی۔ اجتماعی اور سماجی زندگی ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ سوسائٹی افراد کی تنظیم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ بذاتِ خود سوسائٹی کوئی وجود نہیں رکھتی! حقیقی جُزو تو فرد ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کے کلچر کو بلند کرنا چاہو تو اُس سوسائٹی کے ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ تربیت دے کر انفرادیت کو شخصیت میں بدل ڈالو۔ سوسائٹی خود بخود سدھر جائے گی۔ سوسائٹی کے قیام اور وجود کا مقصد ہر فرد کی خودی کی تکمیل ہے۔ سوسائٹی بذاتِ خود کوئی منزل نہیں۔ بشر کے لئے راہنمائے منزل کی ضرورت ہے۔ ورنہ سوسائٹی کا کوئی فائدہ نہیں اس لئے سوسائٹی کا اُصول بھی وہی ہے جو ایک فرد کا ــ

عشق اپنی ذات سے احباب سے ــــ عشق سے سارا جہاں ہو فیض یاب
جس سے تکمیل تیری ذات کی ــــ ہے وُہی تیرا عمل کچھ کامیاب
عشق کی دُنیا محبت آفریں ــــ اس میں چھڑتا ہے اخوّت کا رباب

عشق خلاقِ جہاں نقشِ بقا
عشق ہی کا نام ہے شاید خدا

النصر: "مگر یہ تو واضح کیجئے کہ دوسروں سے عشق کیسے کیا جائے۔ ہر کوئی اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ انسان خود غرض پہلے ہے۔ سرشتِ آدم کی تاریخ یہی بتلاتی ہے اور یہ ہولناک جنگیں اس کا بیّن ثبوت ہیں۔"

مائیکل: "خود غرضی اور عشقِ خودی میں بہت فرق ہے! جو حیوان انفرادی زندگی بسر کرتا ہے وہ خود غرض ہوتا ہے مگر ایسے بھی جانور ہیں جو سماجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً ہنس کا جوڑا — کبوتر اور کبوتری — آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ کس طرح یہ پرندے اپنے بچوں کی چونچ میں دانے لا لا کر ڈالتے ہیں۔ اپنی مادہ سے بے حد عشق کرتے ہیں۔ ہنس کے جوڑے کی محبت تو بے مثل ہے! دوسروں سے عشق کے یہ معنی ہیں۔ خود جیو اور دوسروں کو جینے دو! اور جو دوسروں کے دُکھ میں بھی شریک ہو۔ یہی صفت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دے سکتی ہے۔ ورنہ انسان ہوتے ہوئے بھی وہ حیوانوں سے بدتر ہے۔

یہی وہ صفت ہے۔ جس کے فقدان سے آج بھی اقوامِ عالم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور آج تک ٹوٹتے آئے ہیں۔"

النصر: اجتماعی زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے ہر فرد کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟

مائیکل: "تمام انسان آپس میں ایک ہی برادری کے افراد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ہر فرد اپنی اپنی جگہ بذاتِ خود ایک منزل ہے۔ اس لئے ہر فرد کے ذمہ یہی فرائض ہیں کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کرے اور دوسرے افراد کی اس سلسلے میں مدد کرے۔ اس ہمدردی کے دو پہلو ہیں۔ انصاف اور سخاوت۔ انصاف اور نا انصافی دونوں ایک ہی وقت میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر خیرات کو لیجئے۔ غریبوں، مسکینوں اور لاچاروں کی خیرات کی شکل میں مدد دینا۔ سوسائٹی میں خوبی گنی جاتی ہے۔ مگر ذرا غور کیجئے۔ کیا یہ ان مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ بے انصافی نہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ سوسائٹی غربت و افلاس کو جڑ سے اکھیڑ دے تا کہ خیرات کی

کوئی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔ مگر یہ شرمناک فعل اب تک جاری ہے۔ امیروں نے تو سمجھ رکھا ہے۔ کہ مفلس اور لاچار دُنیا میں سسکیاں لیتے رہیں تاکہ ان کو سخاوت کرنے کے مواقع ملتے رہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ایسی کھُلی بے انصافی اور اُس پر انسان ہونے کا دعویٰ۔ خیال کیجیے جس وقت سب افراد انصاف کی زندگی بسر کریں گے۔ اُس وقت سخاوت کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی۔ انصاف اپنا کام کر چکا ہوگا۔ اس لئے سب سے بہتر سخاوت جو انسان دوسرے انسان پر کر سکتا ہے۔ وُہ یہ ہے کہ اسے خیرات سے بے نیاز کر دے۔ اسے اپنی مدد کرنا سکھلادے۔ یہ ہے حقیقی ہمدردی ــــ یہ نہیں کہ اسے ہمدردی یا خیرات کا آلہ کار بنا کر اپنے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ بنائے ا ــــ اندھی سخاوت بھی کسی کام کی نہیں جو دوسروں کو اپاہج بنا دے۔ مثال کے طور پر لاڈ کرنے والے باپ کی شفقت بچے کیلئے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہے۔ یہ مہربانی اُس کی زندگی کو نہ وبالا کر دیتی ہے ــــ بے جا سخاوت، خیرات، ہمدردی بھی دوسروں کی قوتِ خودی کو کمزور کر دیتی ہے حقیقی معنوں میں سخاوت وُہی ہے جو دوسرے اشخاص کی تکمیلِ خودی میں معاون ہو۔ اس کی مثال دو مخلص شخصوں کی بے غرض دوستی یا محبت ہے جس سے دونوں کی ذات تکمیل پاتی ہے۔ خیرات دینا آسان ہے۔ مگر اپنی ذات سخاوت کرنا مشکل کام ہے۔"

انصر: اجتماعی زندگی بسر کرتے ہوئے کیا تمام انسان کُلی طور پر آزاد نہیں رہ سکتے تاکہ تمام افراد اپنی اپنی جگہ آزادی سے تکمیلِ خودی کر سکیں۔ کیونکہ آپ کے نظریے کے مطابق ہر فرد ایک سیارہ ہے۔ اس کی اپنی ایک دُنیا ہے؟"

مائیکل: اجتماعی زندگی کے چار ادارے ہیں۔ گھر، سماج، ریاست اور ملت۔ ان سب کا مقصد ایک ہے مگر راستے جُدا گانہ ہیں۔ سب سے اہم ادارہ ریاست یا ادارۂ حکومت ہے۔ اس کے قیام کی ضرورت کیوں لازمی ہے۔ اس کی مثال یُوں سمجھئے۔ ایک جزیرہ میں ایک انسان تن تنہا ہے۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ اُس کی انفرادی زندگی میں اگر وُہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ یعنی عشقِ ذاتی کے اُصول کو توڑتا ہے تو اُس کا خمیازہ اُس کی اپنی ذات کو بھگتنا پڑتا ہے۔ فرض کرو ایک اور انسان بھی اسی جزیرہ میں آ نکلتا ہے۔ ایک دوسرے کی موجودگی

دونوں کو علم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ آپس میں ملاپ نہیں رکھتے۔ جزیرے میں ایک ہی آم کا درخت ہے۔
زیادہ سے زیادہ آم حاصل کرنے کے لیے دونوں اپنی اپنی جگہ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ درخت کسی کی
ملکیت نہیں۔ آم ختم ہونے کے قریب ہیں۔ دونوں میں سے ایک پہلے پہنچتا ہے اور بقایا آم چن کر
جانا ہی چاہتا ہے کہ دوسرا بھی آ پہنچتا ہے۔ لڑائی ہوتی ہے اور طاقتور کمزور سے آم چھین کر لے جاتا
ہے۔ اب بھی کسی جرم یا گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا۔ خودغرضی انسان کا فطری مذہب ہے۔ حیوانی اور
انفرادی زندگی کے قانون کے مطابق زبردستی حق بجانب ہے۔ کچھ وقت کے بعد دونوں میں میل ملاپ
بڑھ جاتا ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ یہ اس کا فطری اقتضا ہے۔ اب اگر وہ کبھی سابقہ طرزِ عمل اختیار
کریں تو وہ گناہ یا جرم ہوگا۔

اس طرح اگر سب افراد کو کامل آزادی میسر ہو تو افراد مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک
گروہ دوسرے گروہ سے وہی سلوک کرتا ہے۔ جو ایک فرد دوسرے فرد سے انفرادی زندگی میں روا
رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاتح گروہ کے افراد ہی اپنی تکمیل خود ہی کر سکتے ہیں۔ یہ خودغرضی کا دائرہ ایک
نقطہ یعنی فرد سے شروع ہو کر وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا اس کی لپیٹ میں آ جاتی
ہے۔ ایک ملک کے اندر کئی گروہ پیدا ہو جاتے ہیں جو آپس میں برتری کی خواہش کے ماتحت دست و
گریباں رہتے ہیں اور طاقتور گروہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ اسی طرح شخصی راج کی بنیاد پڑتی ہے۔ اور
ایک حکومت دوسری حکومت سے جنگ کرتی ہے اور اسے زیر کرنے کے بعد ایک سلطنت کی
بنیاد رکھتی ہے۔ پھر سلطنتیں آپس میں اسی جذبے کے ماتحت جنگ کرتی ہیں اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں
ہوتا۔ فاتح قوم اپنی تکمیل خود ہی چاہتی ہے۔ مفتوح اقوام صرف اسی مقصد کی آلہ کار بن کر رہ جاتی
ہیں۔ یہ ہے غلامی، بے انصافی اور ظلم انسانوں کے ایک گروہ کا دوسرے کے ساتھ شہنشاہیت
ایک عذاب اور قہرِ الٰہی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی انسانی خودغرضی ہمیشہ سے امن کی دشمن چلی آ رہی ہے
انسان نے آج تک انسانیت نہیں سیکھی۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ
اس کا تازہ ترین ثبوت ہے۔"

تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ کامل آزادی کا نتیجہ غلامی بے انصافی اور شہنشاہیت کی تخلیق

ہے۔ کیا اس کا کوئی حل ایسا نہیں جس سے ہر انسان آزادرہ سکے۔ اور اپنی تکمیلِ خودی بھی کر سکے اور اس مقصد کے حصول میں دوسرے انسانوں سے اسے کوئی مقابلہ یا جنگ نہ کرنی پڑے۔ اور شہنشاہیت کے پنجے کی دست بُرد سے امن میں رہ سکے" میں نے کہا۔

مائیکل: "یہ تو اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ افراد کی کامل آزادی کے معنی بدنظمی، جنگ اور غلامی ہیں۔ اس لئے آزادی پر پابندیاں لازمی ہیں اور یہی ریاست کا نظامِ عمل ہے۔ ریاست افراد کی اپنی تخلیق ہے اور سماج کی طرح یہ بھی بذاتِ خود کوئی وجود نہیں رکھتی۔ ریاست کے قیام کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ وہ ہر ایک فرد کو کسی فرد یا افراد کی دسترس سے محفوظ رکھے اور تکمیلِ خودی میں اس کی اعانت کرے۔ ریاست کے وہ فرائض ہیں مگر افراد کو قانونِ زندگی پر چلانے کے لئے حکومت کا حربہ لازمی ہے۔ اس لئے ریاست کے ہاتھوں میں حکومت بھی سونپ دی جاتی ہے۔ تاکہ حکم عدولی کرنیوالوں کو راہِ راست پر چلنے کے لئے مجبور کیا جائے! حکومت انہی افراد کو مجبور کرتی ہے جو اپنے آپ پر قدرت نہیں رکھتے۔ اجتماعی زندگی کے باقی ادارے مثلاً سماج یا مذہب افراد کے اخلاقی احساس پر چلا کرتے ہیں تاکہ قانونِ زندگی پر عمل پیرا ہوں کیونکہ اُن کی بھلائی اسی میں ہے۔ اس پر بھی جب وہ باز نہیں آتے تو حکومت اپنے اختیار اور اپنی طاقت کا استعمال کرتی ہے۔ مجرم کو سزا دیتی ہے۔"

انصر: "حکومت کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حکومت کا حربہ یا حکومت کا اختیار کن اشخاص کو سونپا جا سکتا ہے؟ کیا حکومت کی مرضی فرد کی مرضی کی جگہ نہ لے لے گی اور اس طرح کسی فرد کی خودی کو ضعف نہ پہنچے گا؟"

مائیکل: "ہمارے پیشِ نظر بھی تو یہی مقصد ہے۔ اگر خودی کو مٹا دیا گیا تو حکومت بیکار شے ہے۔ بیشک حکومت تو افراد کی ظاہری عادات و افعال پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ افراد کو طاقت سے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ قانونِ زندگی پر عمل کریں۔ مگر کسی فرد کے باطن یا ضمیر کو مجبور نہیں کر سکتی۔ یہ فرد کے اپنے اختیار میں ہے اور یہ اختیار اس سے کوئی دُنیا کی طاقت اس کی مرضی یا خودی کے بغیر نہیں چھین سکتی۔ ایک چور یا خونی مزید جرم کا ارتکاب نہ کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مگر ذہنی۔ اخلاقی یا روحانی طور پر وہ اپنی اصلاح کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ یہ اس کے

اختیار میں ہے جسم پر دوسرے کا تسلط ہو سکتا ہے۔ افعال پر نگہداشت ہو سکتی ہے مگر اس کی خودی حکومت کی مرضی کے ساتھ تعاون کرتی ہے یا نہیں۔ اس کا ظاہر و باطن ہم آہنگ ہوتا ہے کہ نہیں یہ فرد کی خودی پر موقوف ہے۔ فاتح قوم جسم کو غلام بنا سکتی ہے مگر کسی شخص کی خودی کو غلامی میں بدل دینا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ یہ کام تو خود خدا بھی نہ کر سکا۔ بندہ اپنے خالق کے آگے جھکے یا نہ جھکے اس کے اختیار میں ہے۔ بجبر و قہر سے بظاہر جھکایا جا سکتا ہے مگر باطنی طور سے کبھی نہیں۔ باطن کو تسخیر کرنے والی ایک ہی طاقت ہے اور وہ ہے عشق و محبت۔ عشق ہی وہ طاقت ہے۔ جس کے آگے خودی اپنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔

النصر: بیشک ایمان بھی عشق پر منحصر ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی"

مائیکل: اس حقیقت سے صاف نمایاں ہے کہ جبر۔ خوف۔ سزا اور جزا محض ذرائع ہیں۔ مقاصد نہیں ہیں۔ ظاہر کو رام کرنا پہلا قدم ہے۔ اشخاص کی باطنی رضامندی حاصل کرنا دوسرا قدم ہے اور یہ عشق ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ظاہر و باطن کو ایک کر دینا منزلِ مقصود ہے۔ اس طرح جب افراد کی رضا حکومت کی مرضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو حکومت کے لئے قوت کے استعمال کی گنجائش نہیں رہتی۔ افراد اپنی خودی پر آپ اختیار حاصل کر لیتے ہیں۔ حکومت اور افراد کی رضا میں کوئی تصادم اور تضاد نہ ہو۔ یہ ہے حکومت کا نصب العین! اس سے یہ اہم نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں ریاست اور فرد ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ایک ہی مقصد کے لئے دو راستے ہیں۔ فرد راہی ہے اور حکومت مشعلِ راہ۔ ریاست وہی ہے جس میں تمام افراد کی رضا شامل ہو اور صحیح معنوں میں حکومت بھی ایسی ہی ریاست کے سپرد ہونی چاہئے۔ حکومت ریاست کے ادارہ کی روحِ رواں ہے۔ یہ ہے جمہوریت کا آدرش۔"

النصر: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمہوریت افراد کی رضا سے تشکیل پاتی ہے۔ حکومت بھی تمام افراد کی رضا سے ریاست کی تحویل میں ہوتی ہے۔ مگر تمام افراد کی رضا شامل حال ہونا

بعید از حقیقت بات ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بیشتر افراد کی رضا باقی ماندہ افراد پر اُن کی مرضی کے خلاف حکومت کرتی ہے۔"

مائیکل: "آپ کا اعتراض بجا ہے اور میرا آپ سے تبادلۂ خیالات کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اس نقص کو کس طرح دُور کیا جائے۔"

القصر: "میں اپنی رائے سے بھی آپ کو آگاہ کروں گا۔ ابھی آپ اپنے نظریئے کی وضاحت کرتے جائیں۔"

مائیکل: "جمہوری نظامِ حکومت کو چلانے والے مختلف انسانی گروہوں کے نمائندے ہوتے ہیں مگر ان کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد یعنی ہر فرد کی تکمیلِ خودی ہونا چاہئے جس وقت حکومت اس آدرش کے خلاف قدم اُٹھاتی ہے۔ اس وقت بغاوت کرنے کا حق افراد کو حاصل ہے۔ اسی بغاوت میں بھی تمام شہری اپنا حق استعمال کرتے ہیں۔ جس چیز کی وہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس کی تخریب کا بھی حق انہی کو حاصل ہے۔ تخریب کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی جن اشخاص کے ہاتھوں میں تمام افراد کی امانت سونپی گئی ہے۔ وہ اس میں خیانت شروع کر دیں یا وہ تمام متفق ہو کر ایک امر کی صورت اختیار کر لیں اور اس طرح ایک ذاتی حکومت یا شہنشاہیت قائم کر دیں۔ اپنی خواہشات کو عوام کی ضرورتوں پر ترجیح دینا شروع کر دیں۔ ان حالات میں بغاوت عوام کا ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ دوسری صورتوں میں اطاعت اور رضا ۔۔۔! فرانسیسی اور انگریزی انقلاب اسی طرح وقوع پذیر ہوئے تھے۔ حکومت عوام کا حق ہے۔ اس لئے یہ حق انقلاب سے عوام کو واپس مل جاتا ہے اور پھر وہ نئے سرے سے ایسی حکومت کرتے ہیں جس میں بیشتر افراد کی رضا شامل ہوتی ہے۔ دوسری صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کسی ریاست کے موجودہ قوانین میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ یہ بھی عوام کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس لئے بغاوت یا تحریکِ اصلاح جو بھی مناسب ہو۔ اس سے عوام کام لے کر حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں۔ حکومت کا نظام بھی چل سکتا ہے۔ جب تک عوام اور حکومت میں تعاون قائم رہے۔ شہنشاہ ہو یا آمر، کونسل ہو یا پارلیمنٹ۔ جب تک وہ عوام کی بہتری کو ترجیح نہ دیں یا ان کی بھلائی کرتے ہیں برسراقتدار رہ سکتے ہیں۔ اگر فرمانروا

تو عوام ہیں حکّام تو محض عوام کے خدام ہیں۔ ایک جمہوری نظام کے حکّام اور شہنشاہیت یا آمریت کے حکّام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

انصری: "آپ کے نظریئے کا آدرش واقعی بلند ہے۔ مگر اس میں نقائص بھی ہیں۔ جو آپ نے بیان کئے ــــ اور اس کا مغربی جمہوریت کے پاس کوئی علاج نہیں۔ اس کا علاج فقط مذہب کے پاس ہے میں اس کا اسلامی حل پیش کروں گا۔ ابھی آپ اس مضمون پر جو اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ شوق سے کیجئے۔"

مائیکل: "اب یہ سوال رہتا ہے کہ جمہوری حکومت کے فرائض کیا ہیں؟ اس کے بھی فرائض وہی ہیں جو ہم ریاست یا حکومت کے لئے متعین کرتے ہیں یعنی ایک طرف فرد کو باقی افراد سے دامنِ امن میں یا دامانِ پناہ میں رکھنا تا کہ کوئی اس کی تکمیلِ خودی میں حائل نہ ہو اور دوسرے فرد کے ایسے مقصد کے حصول کے لئے مدد کرنا یعنی دو لفظوں میں انصاف اور سخاوت کے فرائض ادا کرنا انصاف قائم رکھنے کے لئے حکومت پولیس۔ فوج اور عدالتوں وغیرہ سے کام لیتی ہے اور سخاوت کا عملی ثبوت تعلیم و تربیت کے ادارے ہسپتال۔ ریلیں۔ سڑکیں۔ کارخانے وغیرہ بنا کر دیتی ہے۔ اس سے یہ تو صاف واضح ہو گیا کہ جمہوری نظام فرد کی انفرادیت کو کیسے قائم رکھتا ہے۔ جو ریاست یا حکومت فرد کو اپنے میں جذب کرلے۔ وہ صحیح معنوں میں ریاست یا حکومت نہیں بلکہ شہنشاہیت یا آمریت یا شخصی حکومت کے مترادف ہے۔"

انصری: "تو اس سلسلے میں اشتراکیت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا جمہوریت اور اشتراکیت کے اصولوں میں تصادم پیدا نہیں ہوتا؟"

مائیکل: "اشتراکیت کا انتہائی نظریہ تو واقعی خودی کے حق میں موت کے برابر ہے۔ یعنی ایسی ریاست جس میں کوئی فرد کسی چیز کا مالک نہ ہو اور تمام اشیاء عوام کی باہمی ملکیت ہوں۔ یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ ذاتی ملکیت کی خواہش انسان کو خود غرض بناتی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے اور اس طرح مال و دولت کے لئے جنگ و جدل کرنا لازمی امر بن جاتی ہے۔ مگر دوسری طرف ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ذاتی ملکیت کی خواہش ایک فطری ضرورت ہے۔ ملکیت

شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ "یہ میری کتاب ہے۔ یہ میرا گھوڑا ہے۔" "میرا نام یہ ہے"۔ یہ سب اسی جذبہ کا اظہار ہیں۔ ملکیت شخصیت سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ ملکیت انسان کا فطری اقتضا ہے اسی لئے کوئی شخص کسی کو خرید کر غلام نہیں بنا سکتا۔ اس کی خدمات ضرور خرید سکتا ہے۔ غلامی شخصیت کو فنا کر دینے والی چیز ہے۔ ایک انسان کو ایک بے جان چیز یا جانور میں مبدل کر دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے ریاست ملکیت کی محافظ ہونی چاہیئے، نہ کہ مخالف! جو چیز وہ عطا نہیں کرتی۔ اس کے چھین لینے کا بھی اسے کوئی حق نہیں۔ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی محنت کے ثمر کا مالک ہو۔ حکومت اشخاص کے تمام حقوق کی نگہداشت اور تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ اسی ملکیت کے متعلق قانون وضع کرنا بھی ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ اگر کوئی فرد دوسرے فرد کی ملکیت پر دست درازی کرے تو حکومت کا فرض ہے کہ عدالت کے ذریعے حقدار کو حق واپس دلائے۔ اس طرح ملکیت کو دوسرے کے حوالے کرنا یا بیچنا بھی ایک فرد کا حق ہے!

مالک ہونے کی حیثیت سے وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ لیکن جس وقت کوئی شخص اپنی ملکیت یا دولت کی مدد سے دوسرے انسانوں کو آزار پہنچاتا ہے۔ ان کی تکمیلِ خودی میں حائل ہوتا ہے تو حکومت کے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو روکا جائے یا سزا دی جائے اسی طرح حکومت کوئی بہتر طریقہ بھی عمل میں لا سکتی ہے جو عوام کے حقوق پہ دست درازی نہ کرنے پائے اور ساتھ ہی ان کے حالات کو بہتر بنائے۔ اس لئے عوام کی رضا کے مطابق طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ یہ طریقے کیا ہونے چاہیئے۔ ان کے متعلق ہم معاشی مسئلہ پر بحث کے دوران میں غور کریں گے۔ فی الحال تو اتنا کہنا کافی ہے کہ انتہائی نظریہ اشتراکیت کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ انسان کی فطرت اُسے قبول نہیں کرتی ؎

اشتراکیت فنا افراد کی   بحر میں ہو جاتی ہے گم جوئے آب
آمریت کا ستم رال دبدبہ   اس جہاں کے واسطے ہے اک عذاب
پادشاہی کا تحکم اور شکوہ   ذلتِ انسانیت کی اک کتاب
عشق کی دُنیا محبت آفریں   اس میں چھڑتا ہے اخوت کا رباب

مَیں نے تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ریاست یا حکومت اس کا نام خواہ کچھ ہی رکھ لو۔ مقصد تکمیلِ خودی ہونا چاہیئے۔ ریاست اسی مقصد کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اگر مقصد ہی فنا ہو جائے اور فرد کو شخصیت میں بدل سکے۔ ایسی ریاست بیکار ہے۔ اس کو توڑ دینا ہی مناسب ہے۔ اس لئے ایسا کوئی نظریہ جو خودی کو فنا کر دے۔ انسان کے لئے موزوں نہیں۔"

انصر:- "پھر آپ کے خیال میں جمہوری حکومت کو کن ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے؟"

مائیکل:- "میں مختصر طور پر یہ فرائض بیان کروں گا۔ ہر فرد کی جسمانی صحت کو بہتر بنانا۔ بچوں کی پرورش اور پیدائش پر پوری نگہداشت کرنا۔ آئندہ نسلوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنا۔ بیماری اور پیدائش کے نقائص کو نیست و نابود کرنا۔ اسی سلسلے میں تعلیم و تربیت۔ ہسپتال۔ زچہ خانے وغیرہ بنانا۔ یہ ہے پہلا فرض۔ دُوسرا فرض یہ ہے کہ ہر فرد کو تعلیم کے لئے موقع دینا۔ جبری تعلیم دینا۔ اور تعلیم کے بعد ہنر سکھانا اور ہر فرد کے لئے کام مہیا کرنا۔ تاکہ کوئی بیکار نہ رہ سکے۔ ہر فرد کو اس کے قدرتی رُجحان کے مطابق تربیت دینا اور اس طرح اس کی تکمیلِ خودی میں مدد کرنا۔ تیسرا فرض یہ ہے۔ معاشی زندگی کے نظام میں توازن قائم رکھنا۔ سرمایہ اور مزدوری کو ہم آہنگ کرنا۔ چوتھا فرض۔ افراد کو نسل۔ مذہب یا وطن پر فخر کرنے کی بجائے ذاتی اخلاق اور قابلیت کے بلند درجہ کی اہمیت ذہن نشین کرانا۔ پانچواں ہر مذہب و ملّت کے کلچر کو بلند کرنے کے لئے برابر مواقع پیدا کرنا۔ احساسِ برتری کی خواہشات کو بے ضرر طریقوں سے تسکین کی تعلیم دینا۔ چھٹا معاشی زندگی کے اصول مقابلہ کو نظرانداز کئے بغیر اس جذبہ سے کام لینا سکھانا۔ سیاسی زندگی میں سب کو برابر حصّہ دینا۔ ساتواں۔ دُنیا میں امن قائم رکھنا۔ ہر فرد کے اخلاق کو اس معیار تک پہنچانا کہ وُہ گناہ کا تصوّر بھی نہ کر سکے اور بغیر گناہ کے انسان تمام اپنی فطری ضروریات اور اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکے۔ ایسے ہی فرائض کو انجام دے کر ریاست اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہے۔"

انصر:- "کیا انسان جب اپنی تکمیل کر لے گا۔ اپنا آقا خود بن جائے گا؟ اس وقت ریاست کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ کیا حُبّ الوطنی کی محدود خوبی کی جگہ عالمگیر اخوت لے لیگی؟"

مائیکل:- "یہ سوالات ایسے ہیں جن کا جواب وثوق سے نہیں دیا جاسکتا۔ اغلب یہی ہے کہ

ریاست کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ جنگ کی بجائے عالمگیر امن قائم رکھنے کے لئے ایک ریاست کا دوسری ریاست کے ساتھ تعلق رکھنا ضروری ہوگا۔ شاید کبھی وہ دن بھی آجائے۔ جب تمام دنیا ایک عالمگیر ریاست میں تبدیل ہوجائے اور یہ ممکن ہے۔ اسی نتیجہ پر میں آپ کو بتدریج لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن فی الحال زمانے کے حالات کے مطابق چلنا پہلا قدم ہے۔ اسی عالمگیر ریاست کی تخلیق کے لئے ہر ریاست کو اس مقصد کی تیاری کے لئے ایک لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے۔ اسلئے عالمگیر اخوت کا خواب دیکھنے کی بجائے حقیقت سے دوچار ہونا چاہیئے۔ ہماری اپنے نزدیکی رشتہ داروں محلہ داروں۔ پڑوسیوں اور دوستوں کی خدمت یعنی ان کی تکمیل خودی کے حصول میں۔ اعانت سب سے پہلا زینہ ہے اور یہی زینہ ہمیں عالمگیر اخوت تک پہنچا دے گا۔ جب ہم اپنی ذات، اپنے خاندان دوستوں اور پڑوسیوں کی مدد نہیں کرسکتے۔ ان کے حالات نہیں سدھار سکتے۔ ان کی زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ ہمارے لئے تمام انسانیت کے سدھارنے کا دعوے بے معنی ہے۔ اوّل "خویش بعد درویش" ایک حقیقت ہے۔

وطنیت اور قومیت کے مسئلوں پر یہ لمبی لمبی بحثیں اور مقالات لایعنی ہیں۔ قومیت کے بارے میں میرے خیالات کیا ہیں۔ یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج تو بہت دیر ہوگئی۔ آپ کو اور بھی کام کرنا ہوں گے۔"



چھٹا باب

توہمات، فلسفہ اور مذہب

حسبِ معمول میں، مائیکل اور النصر ہوٹل میں موجود تھے۔ آج سرکاری اداروں میں تعطیل تھی۔ اس لئے فوجی جوق در جوق دکانوں اور ہوٹلوں کا طواف کرتے پھر رہے تھے۔ مگر اس ہوٹل میں کوئی اکا دکا گاہک ہی آتا رحالانکہ کاروباری لحاظ سے بہترین جگہ پر واقع تھا۔ گنجائش بھی کافی تھی مگر بدانتظامی کی وجہ سے جو کوئی ایک دفعہ آتا۔ دوبارہ نہ آتا۔ ہوٹل کا مالک ٹکٹکی باندھے ہوٹل کے پاس سے گذرنے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ جو اس کی نظروں کے سامنے سامنے کے ہوٹلوں میں داخل ہو رہے تھے۔ حسرت سے ہمیں مخاطب کر کے بولا "مجھے تو یقین ہے کہ میرا ہوٹل کسی نے جادو سے باندھ دیا ہے۔ کل ایک فقیر نے ہمیں بتایا ہے کہ اس ہوٹل کے کسی کونے میں کسی دشمن نے تعویذ زمین میں دفنایا ہوا ہے۔ یہ سب آفت اسی تعویذ کی وجہ سے ہے۔ اس نے مجھے پیر کرامت اللہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ میں کل ہی ان کی خدمت میں پہنچ کر آداب بجا لاؤں گا۔ اللہ والے ہی کچھ میری مدد کر سکتے ہیں۔ یہ کالا علم بڑی طاقت رکھتا ہے۔"

النصر نے پوچھا "کوئی گورا علم بھی ہے؟"

مالک "دیکھئے النصر صاحب، آپ ایسی باتیں نہ کہیں۔ آپ کو کیا معلوم، اس کلام میں کتنی طاقت ہے۔"

النصر: اچھا بابا اچھا !! ــــ آج بھی دُنیا میں بے شمار انسان ایسے بستے ہیں جن کا شعور آج سے ہزاروں سال بیشتر کے انسانوں سے ملتا ہے۔ توہمات نے اب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ سائنس اور مذہب برسوں سے انہی توہمات کی تخریب پر آمادہ ہیں۔ لیکن پھر بھی انسان کے توہمات زندہ ہیں۔ ہاں تو مائیکل صاحب، کل آپنے صحیح جمہوریت کے فرائض اور اُس کے آدرش کے متعلق گفتگو کو ختم کیا تھا۔ آج کون سا مضمون زیر بحث لانا چاہتے ہیں؟"

مائیکل: آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے تین طریقوں کا ذکر کیا تھا جن سے ہم زندگی کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ دو سوالوں کا جواب کل کی گفتگو میں مکمل طور پر دیا جا چکا ہے۔ یعنی مقصدِ حیات تکمیلِ خودی ہے۔ انسان کی فطری ضروریات کی تکمیل کا بہترین راستہ بھی وہی ہے جس سے نہ اپنی اور نہ کسی اور انسان کی ذات کو نقصان پہنچے۔ بقیہ سوالات ایسے ہیں جن کا وثوق سے ابھی سائنس کوئی جواب نہیں دے سکتی لیکن ان کے جواب کی فراہمی کے لئے تجسس اور تحقیق جاری ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سائنس خدا کی ہستی اور حیات بعد الموت سے قطعاً منکر ہے۔ بڑے بڑے سائنس دان بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ نظامِ عالم کے درپردہ کوئی قوت کارفرما ہے۔ جسے وہ ذہنِ کامل (Master Mind) کے لقب سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انسان کی روحِ رواں بھی یہی (Mind) ہے۔ لیکن وہ نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اس لئے یہ مسئلے بھی ابھی سربستہ راز ہیں اور سائنس اُن کے عملی ثبوت کی تلاش میں ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سائنس ابھی کوئی رائے نہیں رکھتی۔ سائنس بغیر ثبوت کے کسی نظریئے کو تسلیم نہیں کرتی ـــ اس لئے علمِ تحقیق موت کی منزل تک محدود ہے۔ اس سے آگے آپ کا مذہب جانے یا کوئی فلسفی دماغ سوزی کرے۔ مگر مجھے معلومات کا بہت اشتیاق ہے۔ اس لئے ان سوالات کا جواب جو مذہب یا فلسفہ کے پاس ہے۔ اس سے مجھے ضرور مستفید فرمائیں۔"

النصر: دوسرے طریقے پر عمل کرنے والوں نے تین بنیادی نظریئے دُنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ پہلا نظریہ سب سے قدیم ہے یعنی دُنیا کئی دیوتاؤں کی ملکیت ہے اور کسی کابینہ کے وزراء کی طرح ہر ایک دیوتا کے ہاتھ میں دُنیاوی سلطنت کی عنان ہے۔ مثلاً ہندو دھرم۔ مہادیو۔ یم راج اندر دیوتا۔ سرسوتی وغیرہ۔ دیوتاؤں کے وجود کو ماننا ہے اور اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے

نذرانے پیش کرتا ہے۔ اس عقیدہ کا ماننے والا یہ طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے۔ اس کی ساری زندگی توہمات کی نذر ہو جاتی ہے اور اس عقیدے کا انسان کسی دیوتا یا کسی تاریخی یا کسی غیر تاریخی ہستی کی پوجا کرتا ہے۔ اس کی قبر پر پھول چڑھاتا ہے۔ سجدے کرتا ہے۔ منتیں مانتا ہے۔ قربانیاں پیش کرتا ہے۔ تاکہ یہ مردے اُس کی مدد کریں اور اس کو مصیبت سے نجات دلائیں۔ کس قدر مضحکہ خیز ہیں یہ عقائد! — مگر جہالت کی افراط سے عقیدت مندوں کی کمی نہیں۔ ہندوستان میں ہزاروں مزار ہیں اور لاکھوں ان کا طواف کرتے ہیں۔ میں نے بڑی بڑی عجیب رسمیں ان مزاروں پر ادا ہوتی ہوئی دیکھی ہیں ان کے بیان کے لئے ایک کتاب چاہئے۔ اولیاء کو پکارا جاتا ہے کہ ان کی مدد کریں۔ میلے لگتے ہیں۔ ناچ رنگ ہوتے ہیں۔ شراب لنڈھائی جاتی ہے۔ مگر زبان پر "یا صابر" "یا خواجہ" ہوتا ہے۔ اچھے اور بُرے شگون پر بھی یقین رکھا جاتا ہے۔ کہاں تک بیان کروں۔ ایسے توہم پرست انسانوں کی زندگی رسومات کی ناقابلِ شکست سلاسل بن کر رہ جاتی ہے۔ جن سے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگ ریاکار اشخاص کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پیر اور پنڈت اپنا تسلط ان کے دلوں پر قائم رکھتے ہیں۔ مُرید نذرانے گذارتے ہیں۔ عورتیں اولاد کی طلب میں آتی ہیں اور بامُراد واپس جاتی ہیں۔ اُن کے شوہر فخر سے کہتے ہیں کہ فلاں پیر یا سادھو کی دُعا سے ان کے گھر کا چراغ روشن ہوا ہے۔ عقل کے اندھوں کو اتنا معلوم نہیں کہ اگر دعاؤں سے کام چلتا تو یہ ملاں اور پنڈت لوگوں کی خیرات پر نہ پلتے۔ اور یوں علم کی تحقیر نہ کرتے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ جعلساز لوگ اپنا ایسا رُعب جماتے ہیں کہ بیچارہ مُرید یہی سمجھتا ہے کہ اُن کو نذرانہ دئیے بغیر سورگ یا جنت نہ ملے گی اور نہ اس دُنیا میں کوئی مراد بر آئے گی۔ ایک مثال اور مائیکل صاحب آپ کے سامنے موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس ہوٹل کا مالک یہ نہیں سمجھتا کہ ہوٹل اس کی بد انتظامی کی وجہ سے نہیں چلتا۔ اُلٹا اپنی قسمت کو کوستا ہے۔ اب دوسرے گروہ کی سُنئیے۔ ان کے خیال میں یہ دُنیا پاپ کا گھر ہے۔ انسان کے رہنے کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ راحتِ ابدی حاصل کرنے کے لئے وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ یا کسی کُٹیا میں جا گھستا ہے۔ رات دن مالا جپتا ہے۔ اگر ان کا خدا یہ کہتا ہے کہ رات دن میری تعریف کیا کرو تو ایسا خُدا انسان سے

بھی بدتر ہے۔ انسان بھی رات دن اپنی تعریف سُن کر عاجز آجاتا ہے۔ عقیدتمند بڑے ادب سے بیان کرتے ہیں کہ سادھوجی مہاراج بڑے پارسا ہیں۔ اب تک مجرّد ہیں اور اکیلے جنگل میں ایک گھاس کی کٹیا میں بیٹھے بیٹھے رام رام جپتے رہتے ہیں۔ کبھی سینما یا تھیٹر دیکھنے نہیں جاتے۔ جھوٹ نہیں بولتے چوری نہیں کرتے۔ کسی عورت کو بُری نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ کیا کہنے ہیں ان کی پارسائی کے! مزا تو جب ہے کہ اس دُنیا میں رہیں۔ شادی کریں۔ بچے پیدا کریں۔ اپنی روزی آپ کمائیں اور پھر ایسے ہی پارسا رہیں تو خدا کی قسم اُن کی وُہ عزت کروں کہ دُنیا دیکھتی رہے۔ اب سنئے تیرے گروہ کا حال۔ یہ سب بازی سلے جا چکے ہیں۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ خدا ہر ذرّے میں موجود ہے۔ انسان کی نجات اسی میں ہے کہ وُہ اپنی خودی کو مٹائے اور قطرہ کی طرح فنا ہو کر سمندر یعنی خدا کی ذات میں سما جائے۔

اس سے دُوسرا خیال پیدا ہوا کہ جب کائنات کا کوئی ذرّہ یا کوئی پتّہ خدا کی مرضی کے خلاف جُنبش نہیں کرتا۔ اس لئے انسان جو کچھ بھی کرتا ہے خُدا کی مرضی سے کرتا ہے۔ اس کی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہی ہوتا ہے ـــــ اس فلسفے کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی اگر آپ چوری۔ زنا یا کوئی اور گناہ کرنے کے سزاوار ہوئے ہیں تو اُس میں عین خدا کی رضا شامل ہے۔ کیونکہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں پاتا۔ بڑا رنگیلا ہے خُدا ان لوگوں کا جو کسی سے باز پُرس نہیں کرتا۔"

مائیکل: "انصر صاحب، پھر آپ کون سے خدا کو مانتے ہیں۔ آپ کی نظر میں یہ توہمات فلسفہ۔ منطق اور دلائل سبھی ڈھکوسلے ہیں اور مَیں بھی آپ سے متفق ہوں۔ سائنس کی کسوٹی پر کھوٹا سونا تو کُجا یہ نظریئے پیتل اتنی وقعت بھی نہیں رکھتے۔"

انصر: "مائیکل صاحب! مجھے سائنس سے کوئی شکوہ نہیں۔ سائنس اپنے اصول پر قائم ہے وُہ تحقیق کرنا چاہتی ہے اور اسے ایسا کرنا چاہئے۔ ورنہ سائنس سائنس نہیں رہتی۔ مگر میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے۔ اگر کبھی سائنس دان کا ضمیر اس سے یہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی جاوداں ہے اس دُنیا کا کوئی خالق ہے تو یہی بہتر ہے کہ وُہ کوئی دین اختیار کرے اور اپنی تحقیقات جاری رکھے۔ تاوقتیکہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ خدا واقعی ہے یا نہیں۔ مگر جہاں تک میرا خیال پرواز کر سکتا ہے مجھے اس کے امکانات نظر نہیں آتے۔ یہ ایک سربستہ راز ہی رہے گا۔ ادراکِ نفس

کی تسکین کے لئے یہی بہتر ذریعہ ہے کہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا جائے جو اپنے دل کو پسند ہو وُہی راستہ اختیار کر لیا جائے۔"

مائیکل:۔ دوسرے طریقے کا نتیجہ بھی ظاہر ہو گیا۔ اب تیسرے نظریئے کی وضاحت آپ ہی فرمائیں۔ گو میں نے بھی مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر میں آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں میں کٹر قسم کے مذہبی لوگوں سے دُور بھاگتا ہُوں جو اپنے مذہب کے سوا دُوسرے کی بات سُننا بھی گوارا نہیں کرتے۔"

انصری:۔ مذہب کی مثال تو یُوں ہے کہ آپ کسی اجنبی مُلک میں ہیں۔ جہاں کی زُبان اور رُسوم وغیرہ سے آپ قطعاً ناواقف ہیں۔ آپ کو لازماً کسی گائیڈ یعنی رہبر کا سہارا لینا پڑے گا۔ جو آپ کو تمام حالات سے آگاہ کر سکے۔ مختلف مقامات کی سیر کرا سکے۔ اسی طرح پیغمبر یا رسُول عالمِ مخفی کے متعلق ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ نظریہ قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ پہلا قدم یہ ہے کہ رسول کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے اور اُن کے اقوال و افعال کا موازنہ کر کے یہ دیکھا جائے۔ آیا اُن میں مطابقت ہے کہ نہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ نبی (پیغمبر یا رسُول سب کی زندگیاں پاکیزہ تھیں) اقوال و افعال میں یکجہتی تھی۔ دُوسرا قدم یہ ہے کہ آیا اُن کی ہدایات تعلیمات یا طرزِ زندگی قابلِ عمل ہے کہ نہیں۔ زندگی کی حقیقتوں سے ان کا نظریہ کہاں تک دوچار ہو سکتا ہے۔ اور ان کا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں نے کیا نتائج پیش کئے ہیں۔ اگر اس سوال کا جواب تسلی بخش مل جائے تو پھر اسے اپنانے میں کوئی دیر نہیں کرنی چاہئیے۔ انبیاء فرماتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک حادثہ کی پیداوار نہیں بلکہ ایک خُدا کی تخلیق ہے۔ اس لئے وُہی اس جہان کا مالک ہے۔ دُنیا اُس کی سلطنت ہے اور تمام انسان اُس کی رعایا ہے۔ انسان کا جسم اور اُس کی ساری قوتیں خدا کی عطا کردہ ہیں اس لئے انسان ان سے خُدا کی مرضی کے موافق کام لے سکتا ہے۔ انبیاء خدا کی طرف سے انسانوں کو زندگی کا طرزِ عمل سکھانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اس لئے وُہ رسول کہلاتے ہیں۔ رسولوں کے اقوال ہیں کہ یہ دُنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ اس دُنیا کے اعمال ہی دوسرے جہان کی ابدی زندگی یا عذاب کا پیش خیمہ ہیں۔ خدا آج تک مستور ہے مگر اُس نے انسان کو یہ آزادی عطا کی ہے کہ

وُہ جو بھی چاہے راستہ اختیار کرے۔ جُرم و گناہ کی بھی کوئی سزا دُنیا میں خدا کی طرف سے نہیں ملتی۔ ان تمام رعایات سے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ خُدا کی بن دیکھے کون اطاعت کرتا ہے۔ خدا ظاہر ہو جائے تو امتحان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس امتحان کا نتیجہ قیامت کے دن نکالا جائے گا اور انسانوں سے بہشت و دوزخ آباد کر دئے جائیں گے جہاں وُہ ابدی زندگی بسر کریں گے۔ یہ ہے بنیادی عقیدہ جو دُنیا کے مختلف مذاہب اپنی تعلیمات میں پیش کرتے ہیں"۔

مائیکل:۔ فی الحال آپ اسلامی عقائد و تعلیمات کی وضاحت فرمائیں۔ کیونکہ آپ اپنے مذہب سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہوں گے"۔

انصری:۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق خدا نے ہر زمانے اور ہر مُلک میں وقتاً فوقتاً اپنے رسول بھیجے۔ تاکہ وُہ لوگوں کو خدا کے قانون کے مطابق زندگی میں عمل کرنا سکھائیں۔ انبیا کے سپرد یہی فرض تھا کہ وُہ خود خدا کے قانون پر عمل کریں اور خدا کی بادشاہت دُنیا میں قائم کریں۔ کیونکہ سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں۔ اس لئے تمام انسانوں کو علم اور ہدایت مہیا کرنا بھی اُس کے فرائضِ خداوندی میں شامل ہے۔ رسُولِ عربی سے پہلے جتنے انبیا آئے۔ ان کی ہدایات ایک محدود مُلک اور قوم کے لئے تھیں۔ یہ ارتقائی منزلیں تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے گریجویٹ بننے کیلئے بتدریج تعلیمی منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے ان کی تعلیم بھی وقت اور لوگوں کے شعوری معیار کے موافق تھیں۔ پھر وُہ وقت آگیا کہ رسول عربی پیدا ہوئے اور اُنھوں نے خدا کے دین کی عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت محمدؐ نے کوئی نیا دین دُنیا میں پھیلایا۔ یہ سلسلہ تو انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ حضرت آدم پہلے انسان ہونے کے علاوہ پہلے نبی بھی تھے اور اس طرح دُنیا کے ہر کونے اور ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی رہنما خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچاتا رہا۔ رسُولِ عربی اس سلسلے کی آخری کڑی تھے اور اس لئے آپ خاتم الانبیا کہلاتے ہیں اور آپ کا دین مکمل کہلاتا ہے۔ کیونکہ وُہ تمام فطری ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ سچائی کبھی نہیں بدلتی۔ جھوٹ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے سچائی کے یہ اصول رہتی دُنیا تک قائم رہیں گے۔ تاریخ اس بات

کی شاہد ہے کہ جس وقت آپؐ کا ظہور ہوا۔ اس وقت دنیا میں کئی دین موجود تھے مگر ان کی روح مردہ ہو چکی تھی۔ عیسائی کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ اور مریم کے بتوں کی پرستش کرتے تھے اور رہنمائے دین روحانی گدی سنبھالے انسانوں پر شخصی حکومت کر رہے تھے۔ ہندوستان میں خدا نے پتھر۔ لکڑی اور مٹی کی صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ ایران کے آتشکدوں میں آگ تو روشن تھی مگر لوگوں کے دلوں کی آگ بجھ چکی تھی۔ دنیا میں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اجالے کی سخت ضرورت تھی۔ اتنے میں ایک آواز عرب سے بلند ہو کر دنیا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

"اے نبی! اہلِ کتاب سے کہہ دو کہ آؤ ہم ایک بات پر متفق ہو جائیں یعنی ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی کو اللہ کا شریک نہ بنائیں اور سوائے اللہ کے کسی کی اطاعت و عبادت نہ کریں" انسانوں کے لئے اس سے بہتر اور کیا دعوت ہو سکتی تھی کہ تمام مذاہب مل کر ایک ہی مقصد کے لئے جدوجہد کریں یعنی خدا کی حکومت قائم کریں۔ اسی مقصد کے لئے تمام انبیاء دنیا میں بھیجے گئے تھے اس لئے مائیکل صاحب مذہب کا عناد تو ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خدا کی ہستی سے منکر ہیں اور کسی خدائی قانون پر عمل نہیں کرتے۔ کس قدر افسوسناک حقیقت ہے کہ مذہب مذہب کے ہی درپے ہے۔ ایک ہی خدا کے نام لیوا آپس میں مذہبی جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مذہب کا مقصد کیا ہے۔ صرف یہی۔ انسانوں کو صحیح معنوں میں انسان بنانا۔ کیا کوئی مذہب یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ جھوٹ بولو۔ ڈاکے ڈالو۔ خون کرو۔ انسانوں کا خون چوسو۔ عیسائیت کی تعلیم ہے کہ اگر تمہارے گال پر کوئی ایک تھپڑ مارے تو دوسرا رخسار بھی آگے کر دو۔ بدھ، جین اور ہندو دھرم کسی جاندار چیز مثلاً چیونٹی تک کو ہلاک کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس کے پیروکار چیونٹیوں کو آٹا بھی روز ڈالتے ہیں۔ گوشت بھی نہیں کھاتے مگر سارا دن غریبوں اور بے کسوں کا خون چوستے ہیں۔ انسانوں کو نگل جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ کیا مذہب یہی سکھاتا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دیکھو مسجد میں جا کر نماز ادا کرتے ہیں اور عربی زبان میں اقرار کرتے ہیں کہ سوائے خدا کے ہم کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ کسی کی اطاعت نہیں کریں گے۔ جھوٹ نہیں بولیں گے۔ مسکینوں، یتیموں، رشتہ داروں اور ہمسائیوں کی خدمت کریں گے۔ مسجد سے نکلتے ہی پھر وہی جھوٹ عود کر آتا ہے۔ فریب دہی،

کشت وخون کے منصوبے اور حاکمِ وقت کی خوشامد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ کیا جاتا ہے۔ شریعت کی جگہ انگریزی قانون کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیا بیان کروں۔ اللہ اکبر کہنے والے اس کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنے کا اقرار کرنے والے بھی غلام ہیں۔ میرا تو خون کھولتا ہے۔ کیا وُہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ یا پھر اتنے پست اخلاق ہو چکے ہیں کہ غیر کی غلامی پر فخر کرتے ہیں اور دعوٰے ہے کہ مسلمان ہیں۔ توحید کے پرستار ہیں"

مائیکل:۔ ایک ہی اللہ کی عبادت اور اُس کی اطاعت سے کیا مراد ہے؟ آپ نے مذہب کے مصنوعی نام لیواؤں کو کھری کھری سناویں۔ ہیں تو آپ خشک مگر باتیں پتہ کی کہی ہیں"

انصر:۔ شکریہ! اچھا تو غور سے سُنئے۔ لفظِ اللہ کے معنی ہیں آقا کے۔ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ "معبود" ہے۔ اسی ترکیب سے مُعبد وُہ فرد ہے جو اپنے مالک یا آقا کا حکم بجا لاتا ہے 'عبادت' ان تمام حرکات کا نام ہے جو ایک عبد ادا کرتا ہے۔ عبادت کے صرف یہ معنی نہیں کہ نماز ادا کر دی۔ نماز تو عبادت کی ظاہری صورت ہے۔ اصلی مقصد کی ترجمانی تو اس طرح ہوتی ہے۔ سیدھے کھڑے ہونا یعنی حکم بجالانے کے لئے مستعدی جیسے فوج میں سپاہی (اٹینشن) ہوتا ہے۔ ہاتھوں کے باندھنے سے مُراد احترام کرنا۔ رکوع اور سجدہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ عبد نے کلی طور پر اپنی ذات اور خدمات اپنے آقا کے لئے وقف کر دی ہیں۔ وُہ خدا کا ہر حکم بجالانے کے لئے مستعد ہے اور اپنی جان تک کی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔ یہ ہے عبادت کا مفہوم۔ اسی طرح رب کے معنی ہیں پرورش کرنے والا۔ پروردگار۔ ایسی ہستی جس سے اُس کی اُمیدیں وابستہ ہوں جس کی ناراضگی سے اسے خوف آتا ہو۔ جس کے رحم وکرم پر زندگی کا انحصار ہو۔ ان معانی کو ذہن میں رکھئے اور پھر دیکھئے کہ انبیاء اور عام انسانوں کے نقطہ نگاہ میں کیا فرق ہے۔ انبیاء یہ چاہتے تھے کہ انسان اللہ کو فقط اپنا اللہ اور رب قبول کرے۔ اللہ بحیثیت خالق صرف قابلِ پرستش ہی نہیں بلکہ مختارِ کل بھی ہے حاکم اور قانون ساز ہے۔ لیکن انسان اللہ کی ہستی کا قائل تو ضرور تھا اور اُس کی پرستش یا پُوجا بھی کرتا تھا۔ مگر وُہ عملی زندگی میں غیر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین پر چلتا تھا۔ یہ غیر اللہ کون ہو سکتا ہے صاف ظاہر ہے کہ سوائے انسان کے کوئی جاندار۔ حیوان۔ درخت۔ سورج یا چاند خدائی کا

دعویٰ نہیں کرسکتا۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو اللہ یا رب کی منزل تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ حرص و ہوا اس کو دوسرے انسانوں پر تسلط قائم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ جاہ و جلال اور حشمت و دولت کی خواہش اپنے ہم جنسوں کو غلامی کی زنجیریں پہناتی ہے۔ وہ آقا کہلوا کر خوش ہوتا ہے۔ خدائی کے ایسے دعویدار کی دو قسمیں ہیں جو خداگانہ طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔ پہلی قسم کے تحت ایسے اشخاص آتے ہیں۔ جن کے پاس دولت و قوت کی افراط ہوتی ہے اور اس کی وساطت سے وہ اپنی حکومت استوار کرتے ہیں۔ شہنشاہیت اور آمریت اس کی ادنیٰ مثال ہے۔ بادشاہوں پر ہی یہ خصوصیت موقوف نہیں بلکہ جو شخص بھی بر سر اقتدار آتا ہے۔ تکبر۔ نخوت و غرور اس کو اکثر گمراہ کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے اشخاص خدائی کا کھلم کھلا دعویٰ کریں۔ وہ ایسا کبھی نہ کہتے کہ ہم خدا ہیں مگر ان کے افعال ثابت کرتے ہیں کہ پس پردہ کیا جذبہ کام کرتا ہے۔ فرعون نے بھی یہ دعوے نہیں کیا تھا کہ میں خدا ہوں۔ وہ بھی جانتا تھا کہ زمین و آسماں کا خالق وہ نہیں بلکہ کوئی اس سے بھی بالاتر قوت ہے مگر اس کے ذہن میں یہ بات نہ آسکی کہ مصر کے لوگوں پر اس کی حکومت کے سوا خدا کی حکومت کیسے ہو سکتی ہے۔ نمرود نے بھی خدائی کا دعوے کیا تھا مگر اس نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں تمام جہانوں کا رب ہوں۔ سوال تو یہ تھا کہ بابل کی رعایا کا رب کون ہے۔ نمرود بھی یہ بات سمجھ نہ سکا۔ کیونکہ اس کو تو یہی معلوم تھا۔ کہ اس کی رعایا کی زندگی اور موت اس کے قبضۂ قدرت میں تھی۔ جس کو چاہے عزت بخشے۔ جس کو چاہے جان سے مروا دے۔ اس کا ہر لفظ قانون تھا اور کسی کی مجال نہ تھی جو اس کے سامنے دم بھی مار سکے مگر جب حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ وہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت کرنے کے لئے تیار نہیں تو نمرود ششدر رہ گیا۔ اس لئے رب ہونے کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ مگر فرعون اور نمرود کی طرح انسانوں پر حکومت ضرور کرنا چاہتا ہے۔ یہ شہنشاہیت رب اور اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں تو اور کیا ہے۔ چاہے زبان سے اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے۔"

"ان معنوں میں تو کوئی مسلمان توحید کا پرستار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا" مائیکل نے کہا۔ "اچھا تو دوسری قسم کے خدائی کے دعویدار کون ہیں؟"

النصر: "دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں۔ جن کے پاس اس قدر قوت و دولت نہیں ہوتی

جس کی مدد سے وُہ حکومت قائم کر سکیں۔ اس لئے یہ گروہ دُوسرے ذرائع استعمال میں لاتا ہے مثلاً ریاکاری یا فریب دہی ان سے سادہ لوح انسانوں کو مسحور کرتا ہے۔ ایک کارگر اور سہل ترکیب تو یہ ہے کہ کسی قبر۔ رُوح۔ بُت یا دریا کے ساتھ ایسے معجزات منسوب کر دیئے جاتے ہیں جو لوگوں کی کشش کا باعث ہوتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد یہی بے جان اور بے حقیقت چیزیں رب کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں اور اس ڈھنگ سے پیر اور مجاور۔ پنڈت اور پروہت بیشمار سادہ لوح افسانوں پر اپنا سکہ جما لیتے ہیں اور اس طرح حکومت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ خاندان بخاندان چلا جاتا ہے۔ سجادہ نشینوں، درگاہوں کے مجاوروں۔ رُوم کے پاپائے اعظم اور ہند کے پنڈتوں کی یہی اصلیت ہے۔ اگر آپ اس زاویہ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ امر مخفی نہیں رہ سکتا کہ انسان کے تمام مصائب کی جڑ یہی افسان پر انسان کی حکومت ہے چاہے بلاواسطہ یا بالواسطہ۔ اگر جرمنی میں ہٹلر انسانوں کا رب تھا تو اٹلی میں مسولینی۔ برطانیہ کے بنکوں کے ڈائرکٹر۔ اُونچے گھروں کے لارڈ اور سیاستدان بھی پہلی قسم کے گروہ میں شامل ہیں۔ اس طرح نیویارک کی وال سٹریٹ کے چند سرمایہ دار امریکہ کی باگ ڈور سنبھالے انسانوں پر خُدائی کر رہے ہیں۔ جس طرف نگاہ اُٹھاؤ۔ یہی منظر نظر آئے گا کہ ایک قوم دوسری قوم کی خُدا ہے۔ یا ایک پارٹی دُوسری پارٹی کے ساتھ اسی منصب کے لئے برسرِ پیکار ہے ــــ انسانوں پر انسانوں کی حکومت کے نتائج آپ کے سامنے ہیں پہلی حقیقت تو یہ ہے۔ جب ایک دفعہ حکومت۔ آمریت یا شہنشاہیت کی شراب کا ایک جام پی لیتا ہے تو پھر وُہ ہوش میں نہیں رہتا۔ یہی سبب ہے کہ جہاں بھی انسان نے افسان پر حکومت قائم کی۔ وہاں وُہ رعایا میں عدل و انصاف اور انسانی زندگی میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سوائے حکام اور خوشامدیوں کے کوئی اپنی تکمیلِ خودی نہ کر سکا۔ آزادی اور حصولِ مقصد کی دُشمنی یہی شہنشاہیت ہے۔ اور اس کا علاج یہی ہے کہ ان ہر دو قسم کے خدائی دعویدار اور ربانیت کے ٹھیکیداروں سے آزادی حاصل کر کے مالکِ حقیقی اور حاکمِ اعلےٰ یعنی صرف خدا کی اطاعت کی جائے۔ نجات کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان دہریہ اور مادہ پرست بھی ہو جاتے تو دُنیا کے خداؤں کے چنگل سے نہیں بچ سکتا۔ اطاعت اور عبادت تو اسے بہرحال کرنی پڑے گی۔ اللہ کی نہ کرے گا تو حکومتِ وقت کی کرنی پڑے گی۔ یہ تھا بنیادی اُصول جسکی

تشریع انبیاء کرتے آئے تھے۔ ان تمام رسولوں کا نصب العین تھا۔ انسان پر انسان کی حکومت کا خاتمہ۔ اس لئے ان کا ایک ہی پیغام تھا "اے لوگو صرف ایک اللہ کی عبادت اور اطاعت کرو" حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ اور دوسرے پیغامبر اسی مقصد کے لئے دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ یہی رسول عربی کا پیغام تھا "اے رسول! تمام انسانوں سے کہہ دو کہ آؤ ہم سب اس بات پر متفق ہو جائیں جو ہمارے سب کے درمیان مشترک ہے۔ یعنی سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کریں"۔ یہ تھا تمام انسانوں کی آزادی کا پروانہ!

مائیکل: النصر صاحب یہ تو بجا ہے کہ خدا خالق ہونے کی حیثیت سے حکومت کرنے کا بھی مجاز رکھتا ہے۔ مگر آپ کے بیان کے مطابق اللہ کی اطاعت اور عبادت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ بھی انسانی فرمانرواؤں کی طرح۔ تعریف و توصیف، خوشامد اور حکومت کی خواہش رکھتا ہے۔ کیا وہ ہم سے تخلیق کرنے کا صلہ چاہتا ہے۔ یہ تو تمہارے اللہ کے شایانِ شان نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر انسانی شہنشاہیت اور اللہ کی بادشاہت میں کیا فرق رہا؟

النصر: آپ کا اعتراض معقول ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ خدا ان تمام خواہشات سے بے نیاز ہے۔ وہ تمام کمزوریوں سے بالاتر ہے۔ کیونکہ وہ جسمانی وجود نہیں رکھتا۔ وہ انسان کی کی طرح تو ہے نہیں۔ کہ اس کو رام رام یا اللہ اللہ کہہ کے بہلا لیا۔ اگر ایسا ہوتا تو بازار وں میں اپنے جسم کو گھسیٹ گھسیٹ کر رینگنے والے اور رام رام کہنے والے برائے نام انسان یوں مفلس و نادار نہ رہتے۔ وہ خدا جس کو انصاف و رحمدلی کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے۔ کیا وہ اس نظارے سے متاثر نہیں ہوتا۔ عقیدت مند اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان غریبوں کا وجود دنیا میں اس لئے برقرار ہے تاکہ انسانی ہمدردی، سخاوت اور رحمدلی کا امتحان کیا جائے۔ فقیر کے روپ میں خدا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ اپنے بندوں کا امتحان لے اور اس کے عوض دوزخ یا جنت عطا کرے۔ واہ کیا فلسفہ ہے — یہ تو وہی بات ہوئی کہ "کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"۔ اس بات پر غور کیا کریں۔ کیا یہ وہی فلسفہ نہیں جس کا میں نے توہمات پر گفتگو کرتے ہوئے ذکر کیا تھا۔ کہ دنیا بہت سے دیوتاؤں کی ملکیت ہے اور ان کی ذاتی

خوشنودی اور ناراضگی پر انسانوں کی مسرت کا انحصار ہے۔ مذہبی رہنماؤں نے بھی خدا کو ایک دیوتا یا کسی درویش کا مزار بنا کر رکھ دیا ہے کہ اس کا نام جپتے رہو۔ پوجا کرتے رہو۔ نمازیں پڑھتے رہو دعائیں مانگتے رہو تاکہ تم دونوں جہانوں میں خوش رہو۔ ایسا کرنے والوں کو سورگ یا جنت ملے گی۔ اور ایسا نہ کرنے والوں کو جہنم یا نرگ میں دھکیل دیا جائے گا۔ یہ تو بچوں کا کھیل ہوا۔ مگر کھلونوں اور مٹھائیوں سے بچے ہی بہل سکتے ہیں۔

جنت کی پیش کش سے نادانوں کو لالچ دیا جا سکتا ہے۔ ان کو جہنم کا خوف دلا کر راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ مگر مجھ سے خشک طبع یا آپ جیسے سائنسدانوں کے لئے جو ہر چیز کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طفل تسلیاں کسی کام نہیں آسکتیں۔"

مائیکل :- "تو پھر آپ کے خیال میں خدا کی عبادت و اطاعت کا کیا مفہوم ہے؟"

انصر :- "خدا کی عبادت سے یہ مراد ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا دستور العمل خدا کی مرضی کے موافق ہو۔ اس کا اُٹھنا بیٹھنا۔ سونا کھانا پینا۔ عشق و محبت کرنا۔ دُوسرے انسانوں سے سلوک کرنا۔ مختصر یہ کہ انسانی زندگی کی ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ حرکات تک سبھی اللہ کے قانون کے مطابق ہوں۔ وُہ قانون کونسا ہے۔ اُس کی وضاحت پھر کروں گا۔ فی الحال یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اللہ سے تمام نیکیاں اور خُوبیاں منسوب ہیں۔ وُہ سچائی اور اچھائی کا سرچشمہ ہے اور اسی طرح شیطان بھی کوئی جسمانی وجود نہیں رکھتا۔ وُہ کوئی شخص تو ہے نہیں جو آ کر انسانوں کو بدی کی طرف مائل کرتا ہے۔ شیطان کے ساتھ تمام بدیاں منسوب ہیں۔ نیکی اور بدی کے مجسموں کی تخلیق انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ مذہب تو ان چیزوں کو بطور استعارہ استعمال کرتا ہے لیکن نادان ان کو حقیقت تصور کرتے ہیں۔ ان کا شعور اتنا بلند نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر سپاہی جب چوک میں کھڑا ہوتا ہے تو سب بائیں ہاتھ چلتے ہیں۔ یہ تو ظاہری فعل ہے مگر اب چلنے والوں کی نفسیات کا مطالعہ کیجئے۔ نادان یا کم سمجھ انسان اسے ایک قانون سمجھ کر اس ہدایت پر عمل پیرا ہوتا ہے کہ اگر اُس نے ایسا نہ کیا تو جرمانہ کا مستحق ہوگا۔ مگر ایک سمجھدار انسان اس قانون کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یعنی اپنے ہاتھ چلنے سے ایک دوسرے سے تصادم کا امکان

جاتا رہتا ہے اور یہ قانون اس کی اپنی بھلائی کے لئے ہی نافذ کیا گیا ہے۔ اگر سب کو آزادی ہوتی کہ جس طرح اس کا دل چاہے وہ چلے۔ تو بس کوئی شخص بھی حادثات سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ اس لئے سپاہی کی غیر موجودگی میں بھی ایک سمجھ دار انسان اپنے ہی ہاتھ پر چلے گا۔ اگر ایسا موقع یا وقت ہے کہ کوئی آمدو رفت نہیں تو وہ اس کے برعکس بھی عمل کر سکتا ہے ـــــ مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ اپنی جسم و جان کا تحفظ ہو اور کسی دوسرے انسان کی ذات کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو لیکن ایک نادان انسان دور سے نظر دوڑاتا ہے کہ کوئی سپاہی چورستہ پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پھر عجلت کے ساتھ دائیں ہاتھ کی طرف سے گزرنا چاہتا ہے اور حادثہ سے اکثر دوچار ہو جاتا ہے۔ قانونِ الٰہی بھی یہی حقیقت پیش کرتا ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان جو اس کی تخلیق کا شاہکار ہے جسے دنیا میں اس نے اپنا وائسرائے یا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ ایسے راستے اختیار کرے جو انسان کے شایانِ شان نہ ہوں۔ ایسے افعال کا مرتکب ہو جس سے خالق کی تذلیل ہو۔ یا مذہبی اصطلاح میں وہ شیطان کا پیروکار بنے۔ نفسانی خواہشات کو ذلیل طریقوں سے پورا کرے۔ اس لئے اس نے انبیاء۔ اور رہنما دنیا میں بھیجے تاکہ انسانوں کو صحیح طریقہ سے آگاہ کرتے رہیں۔ ان کو اس کا فرض یاد دلاتے رہیں۔ کیونکہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ اگر کوئی بھی انسان خدا کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عمل نہیں کرنا چاہتا تو پھر وہ یہ علم کہاں سے دستیاب کریگا لازمی امر ہے کہ یا وہ خود کوئی طریقہ اختراع کرے گا۔ یا کسی دوسرے انسان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوگا۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور صورت ممکن نہیں۔ اگر انسان اپنی ذات کو رہنما بناتا ہے تو خودغرضی اسے اصلیت سے دور لے جائیگی۔ انسانی نفس تو یہی مشورہ دیتا ہے کہ خوب عیش و عشرت کرو جیسا کہ میں نے اپنے نظریہ محسوساتی میں اس کی وضاحت کی تھی اور اگر وہ دوسرے انسان کا سہارا لیتا ہے تو وہ بھی خطروں سے خالی نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اس جیسا کمزور انسان ہے۔ اس لئے اس ہدایت کا اللہ ہی ایک ایسا سرچشمہ ہو سکتا ہے۔ اس قانونِ زندگی کا جو تمام انسانی آلائشوں سے پاک ہو جو سچائی کے اصولوں پر واضح کیا گیا ہو۔ ایسا راستہ جس میں سب انسان اپنی تکمیلِ خودی کر سکیں۔"

مائیکل: تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ کی اطاعت و عبادت میں انسان کی اپنی مسرتوں کا راز مضمر ہے۔ خدا کے قانون پر چلنے میں اس کی اپنی فلاح و بہبود پنہاں ہے۔"

انصر: بالکل یہی۔ آپ عبادت کا مفہوم تو سمجھ چکے ہیں۔ یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا۔ اب دیکھئے دوسرا رُخ جو عوام کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مسجدوں میں بڑی خوش الحانی سے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ نمازوں میں تلاوت ہوتی ہے۔ اللہ حکم دیتا ہے کہ کسی سے بے انصافی نہ کرو۔ یتیموں اور مسکینوں کا مال ہضم نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ کرو۔ لڑکیوں کو بھی اپنی جائداد میں سے ایک حصہ دو۔ زکواۃ ادا کرو۔ مندروں اور کلیساؤں میں گیت اور شلوک گائے جاتے ہیں کہ کسی جیوان۔ جانداراور انسان کو دُکھ نہ پہنچاؤ۔ معاف کردینا خُدائی صفت ہے۔ کسی سے بدلہ لینے کی فکر نہ کرو۔ مجرم کو معاف کردو اسی طرح سکھوں کے گرنتھ۔ پارسیوں کے ژندوستا اور جینیوں کے شاستر خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ مولوی۔ پنڈت۔ گرنتھی اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے ہر وقت یہی رٹ لگاتے رہتے ہیں لیکن ان کا عمل کیا ہے۔ ایک گالی دے کر دیکھ لیجیے۔ مجھے ایک مختصر افسانہ کبھی نہیں بھولتا۔ وہ اس طرح ہے۔ پادری وعظ کر رہا تھا کہ انسان کو معاف کردینا چاہیئے۔ یہ سب سے اعلیٰ طریقہ ہے انصاف کرنا اور سزا دینا یہ خُدا کے کام ہیں۔ ایک نادان نے خدا کو گالی دی۔ پادری چپ رہا نادان نے پادری کو گالی دی۔ پادری نے تھپڑ کھینچ مارا۔" مائیکل واہ واہ کر اُٹھا ــــ انصر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔ انہیں لوگوں نے تو مذہب کو بدنام کر رکھا ہے۔ مذہب کی روح رواں کو نہ خود سمجھتے ہیں نہ دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں۔ ان کی نظریں تو اس بات کا جائزہ لیتی رہتی ہیں کہ فلاں مسلمان نے ڈاڑھی مُنڈائی ہوئی ہے۔ وہ کوٹ پتلون پہنتا ہے۔ سر پر ہیٹ رکھتا ہے۔ فلاں سکھ داڑھی اور کیس نہیں رکھتا۔ فلاں جینی انڈے کھاتا ہے۔ آپ ذرا غور کریں کہ ان چیزوں کا اخلاق سے کیا تعلق۔ مذہبی اعتقاد سے کیا واسطہ۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ ہیٹ بڑی کام کی چیز ہے۔ آنکھوں اور گردن کو دھوپ سے بچاتی ہے۔ ٹوپی اور پگڑی ہیٹ سے خوبصورت چیز ہے۔ سردیوں میں ٹوپی یا پگڑی پہنو۔ گرمیوں میں ہیٹ پہنو۔ سوٹ سردیوں کے لئے بہترین لباس ہے۔ خوب پہنو۔ اچھے اچھے سوٹ پہنو۔ گرمیوں میں دھوتی اور ململ کے کرتے بھی پہنو۔ اپنے

مذہب کے بانی کا اس قدر احترام کرتے ہو۔ شوق سے کرو۔ ان کی تقلید کرو۔ داڑھی اور گیسو بھی پسند ہیں تو شوق سے رکھو مگر جو نہیں چاہتے۔ ان کو مجبور نہ کرو۔ ان کو بُرا کیوں کہو۔ ہاں ان کے اخلاق خراب ہیں تو ان کی اصلاح کرو اور اصلاح کرنے سے پہلے خود اخلاق کی بہترین مثال بن کر دکھاؤ۔ لوگ تمہیں دیکھ کر خود بخود سدھر جائیں گے۔ انڈا دُنیا کی بہترین غذا ہے۔ آپ اپنی صحت کو بہتر نہیں بنانا چاہتے نہ سہی۔ انڈے تو آج کل دیسے بھی نہیں ملتے۔ مگر مجھے کھانے دیجئے۔ مجھے آپ کے نہ کھانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ان مذہبی دیوانوں کی تو یہ مثال ہے کہ ایک بادشاہ کے بیشمار نوکر اور غلام ہیں دست بستہ اس کے دربار میں کھڑے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جاؤ میرے دُشمنوں اور مخالفوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دو۔ شاہی نوکر وہیں کھڑے رہتے ہیں ٹس سے مس نہیں ہوتے اور بڑی خوش الحانی سے آواز لگاتے ہیں کہ سلطانوں کے سلطان۔ زمین و آسمان کے مالک عدل و انصاف کے بحرِ ذخار یہ حکم دیتے ہیں کہ ان کے دُشمنوں اور مخالفوں کا صفحۂ ہستی سے نشان مٹا دیا جائے۔ آداب بجا کر پھر دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا کسی دُنیاوی فرمانروا کے ساتھ یہ سلوک اختیار کیا جا سکتا ہے ہرگز نہیں وہ کان پکڑ کر باہر نکال دے گا کہ مجھے ایسے ملازموں کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوچئے یہ مذہب کے اجارہ دار بھی یہی طرزِ عمل اختیار کئے ہوئے ہیں کہ نہیں ؟ گا گا کر خُدا کا کلام پڑھتے ہیں۔ یہ گیت نہیں بلکہ زندگی کے قوانین ہیں۔ یہ آسمانی کتابیں طاق کی زینت بنانے کے لئے نہیں بھیجی گئیں زندگی حرکت کا نام ہے۔ زندگی اعمال سے بنتی ہے اقوال سے نہیں۔ علامہ اقبال کا ایک مصرع ہے۔

—— عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"۔

مائیکل: انصر صاحب ذرا اس امر کی وضاحت فرمائیے کہ جب تمام انبیا یا بانیانِ مذہب کا مقصد ایک ہی رہا ہے۔ یعنی سوائے خُدا کے کسی کی اطاعت نہ کرنا تو پھر مختلف مذاہب کے پیروکار آپس میں کیوں دست و گریباں ہیں؟

انصر: اس مذہبی جنگ و جدال کی ایک ہی وجہ ہے۔ عوام دین اور شریعت کے الفاظ کے معنی سے لاعلم ہیں"۔

دین کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حکومت۔ عزت۔ اطاعت۔ غلامی۔ انصاف

کرنا اور اعمال کے مطابق سزا و جزا دینا۔ قرآن میں یہ لفظ ان تمام معانی کی ترجمانی کرتا ہے مختصر طور پر اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ تمام ستائش اور حکومت صرف خدا ہی کے لئے ہے۔ انسان کی زندگی خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق بسر ہو۔ انسان سوائے خدا کے اور کسی سے خوف نہ کھائے اور خدا کو اپنے اعمال کا منصف جانے۔ اگر آپ لفظِ دین کو اس روشنی میں دیکھیں تو یہ بات بالکل طے ہو جاتی ہے کہ تمام مذاہب کے رہنماؤں کا ایک ہی دین تھا یعنی اللہ کی اطاعت اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اطاعت کا طریقہ کیا ہے اسلئے شریعت کے معنی ہوئے زندگی کا راستہ یا طرزِ عمل یہ علم انبیاء کی وساطت سے انسان تک پہنچتا رہا۔ دین ہمیشہ سے ایک تھا اور ایک ہی رہے گا مگر قوانین ہر نبی کے ساتھ بدلتے رہے۔ یعنی شریعت ہر رسول کی جداگانہ ہے مختلف زمانوں میں ان قوانین میں تنسیخ و ترمیم کا عمل جاری رہا۔ لیکن دین میں بال برابر بھی فرق نہ آیا۔ اسی لحاظ سے تمام انبیا مثلاً حضرت ابراہیمؑ۔ سلیمانؑ۔ موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا دین ایک ہی تھا مگر شریعتوں میں معمولی سا اختلاف تھا۔ مثلاً نماز۔ روزہ۔ نکاح۔ طلاق اور وراثت وغیرہ کے متعلق الٰہی احکام میں کچھ فرق تھا مگر اصول وہی تھے۔ اس لئے اسلامی عقیدے کے مطابق وہ تمام کے تمام مسلم تھے مسلم کے لفظی معنی یہ ہیں۔ فرمانبردار۔ جو لوگ بھی ان رسولوں کے کہنے کے مطابق ایمان لے آئے۔ وہ مسلم یعنی اللہ کے فرمانبردار کہلائے۔ شریعت کے اختلاف کی یہ مثال ہے کسی بادشاہ کے بیشمار نوکر ہیں جو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ ان کے ذمے مختلف فرائض ہیں۔ ان کی فرمانبرداری کے طریقے جداگانہ ہیں۔ کسی ملازم کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ صرف وہی آقا کا تابعدار ہے۔ البتہ جو اس کے آقا کو بادشاہ ہی تصور نہیں کرتا۔ اس کی اطاعت کا شکوہ ہی بے بنیاد ہے۔ اسی طرح مختلف رہنمائے دین مختلف طریقے بتاتے رہے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں یہ تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے گئے اور نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ کیونکہ خدا نے اپنا دین مکمل کر دیا تھا۔"

مائیکل: اسلامی شریعت کی بھی تو ذرا وضاحت فرمائیے؟

النصرؒ: اسلامی تعلیم کے مطابق ایک مسلم کا فرض ہے کہ وہ تمام رہنمائے دین اور دینی کتابوں

کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ ان کو برحق تسلیم کرے اور کسی بھی شریعت کے پیروکار کو بُرا نہ کہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ کسی بھی انسان کے جھوٹے خدا کو گالی نہ دو۔ بُرا نہ کہو کیونکہ اگر تم اس کے جھوٹے خدا کو گالی دو گے تو وہ تمہارے سچے خدا کو گالی دے گا۔ اس لئے اسلام تو رواداری سکھاتا ہے اور انسانیت کا درس دیتا ہے۔ دیوتا بننا تو آسان ہے۔ لیکن مکمل انسان بننا مشکل کام ہے۔ رسُول عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک انسان تھے۔ دیوتا یا اوتار نہیں تھے۔ انسان کے لئے ایک مکمل انسانیت کی مکمل مثال قائم کی۔ اور یہی آپ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔"

مائیکل :"یہ سب کچھ بجا آپ نے فرمایا۔ مگر رواداری کا مطلب مجھے واضح طور پر سمجھائیں۔ فرض کرو ایک عیسائی یا یہودی اپنے اپنے نبی کو برحق جانتا ہے مگر دوسرے مذاہب کے انبیا کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔"

النصر :" اتنا تو ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ ایک مسلم کے لئے تمام انبیا پر ایمان لانا نہایت اہم ہے۔ اپنے نبی کو سچا سمجھنا اور باقی راہنمائے دین کو جھوٹا جاننا دین کی توہین ہے۔ جو مذہب یہ کہتا ہے وہ اپنی تردید خود پیش کرتا ہے۔ اس کی مثال میں پہلے بھی دے چکا ہوں —— ایک نوکر اپنے آقا کے حضور میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ دوسرا نوکر ادب سے آقا کا قصیدہ کہتا ہے۔ تیسرا گا کر آقا کی تعریف کرتا ہے۔ طریق بدل جانے سے آقا تو نہیں بدل جاتا۔ آقا کا حکم ہے شادی کرو۔ میں زنا کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہر ایک نوکر مختلف طریقوں سے شادی کی رسم ادا کرتا ہے۔ اس سے آقا کے حکم بجا لانے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر ایک نوکر دوسرے کو الزام لگائے کہ اس کا طریقہ آقا کو پسند نہیں ہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ آقا خود ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ جس سے وہ خوش ہو گا اسے زیادہ انعام عطا کرے گا۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے۔ مگر تعصب نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ کاش اس پٹی کو اُتار کر پھینک دیا جائے۔ مذہب کے ٹھیکیدار تو یہ درس دیتے ہیں کہ اگر کوئی ان کا بنایا ہوا راستہ اختیار نہ کرے گا تو وہ جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے۔ کہ تمہارا خدا سے کیا رشتہ ہے۔ ایسے بھی چند ایک مذہب ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جنت کے حصول کیلئے

چند عقائد کا تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے جن کے بغیر وہ جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر آپ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ اس لئے دار پر کھینچے گئے تا کہ اسکی بھیڑوں یعنی پیروکاروں سے کوئی گناہ کی بازپرس نہ ہو یعنی انکے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا گیا ہے اور اس لئے وہ نجات پا گئے ہیں۔ ایک محقق یا سائنسدان یا کوئی بھی۔

صحیح الدماغ انسان اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ حضرت عیسیٰ نے یہ کبھی نہیں فرمایا ہو گا مگر اس کے پیروکاروں نے مذہبی تبلیغ کی خاطر یہ حربہ اختیار کر لیا کہ اگر ہمارے مذہب میں داخل ہو کر اس عقیدہ کو تسلیم کر لو تو بس ہمیشہ کے لئے نجات تمہاری ہے جتنے چاہو گناہ کرو۔ اس پادری کے روبرو اقبال کر لینے سے پھر وہی بھیڑ معصوم بھیڑ بن جاؤ گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ مائیکل ۔ یا شام لال یا آپ نے جتنی بھی نیکیاں کی ہیں وہ سب اکارت گئیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں میں ان مذہبی دیوانوں سے کہیں زیادہ انسانیت ہے۔ بس اسی بات پر جنت کے دروازے ہم لوگوں پر بند ہو گئے۔"

مائیکل:۔ انصر صاحب ہمیں کوئی غم نہیں۔ جنت میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ ہزاروں برس کی بوڑھی حوریں ہوں گی۔ جہاں یہ کٹر اور متعصب پادری، پنڈت یا مولوی ہوں گے۔ اس کے برعکس جہنم میں دنیا کی تمام حسین عورتیں مثلاً قلوپطرہ۔ ہیڈی لیمار۔ دنیا کے تمام ادبا و شعراء مثلاً چچا غالب (کیونکہ شراب بہت پیتے تھے) سائنسدان۔ مصور اور انجینئر بھی وہاں ہوں گے۔ خوب جم کر رہے گی "ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں جنت"۔ اور ہاں انصر صاحب آپ کا جنت کے متعلق کیا خیال ہے؟

انصر:۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے اپنے بائیں ہاتھ جلنے کی مثال میں ذکر کیا تھا۔ گناہ کے ارتکاب کی روک تھام کے لئے دو ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ انعام اور سزا۔ یہ تو ہے ظاہری صورت۔ مگر نیکی اصل وہی ہے جو نیکی سے محبت کا نتیجہ ہو۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اس لئے ایک سچا مسلم تو عشقِ خدا اور عشقِ رسول میں اپنے محبوب کی خوشنودی کے سوا اور کسی چیز

کا طالب نہیں۔ باقی رہا جنت کے تخیل کے متعلق تو میری رائے میں جنت سے مراد ایک ایسی دنیا ہے۔ جہاں دنیا کے سب سامانِ عیش و راحت مہیا ہوں گے مگر وہاں دنیاوی تلخیاں نہ ہوں گی مثلاً شراب ہوگی مگر دنیاوی شراب کے بُرے اثرات سے بالکل مبرا ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز مکمل اور بے عیب ہوگی۔ قرآن فرماتا ہے کہ "جنتی آپس میں وہاں کی چیزوں کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یہ تو بالکل ویسی ہی ہیں جیسی کہ ہم دنیا میں دیکھا کرتے تھے اور وہاں وہ تمام مسرتیں میسر کی جائیں گی۔ جن کی ایک جنتی خواہش کرے گا۔" ان اشاروں سے مطلب واضح ہے کہ جنت ایک مکمل مقامِ مسرت ہوگا۔ دور کیوں جاؤ صحیح معنوں میں اگر تمام انسان انسان بن جائیں۔ خدا کی برائے نام اطاعت کا دعوے کرنے والے سچے مسلم یعنی خدا کی فرمانبرداری کریں تو دنیا ابھی جنت میں مبدل ہو جائے۔ جنت و جہنم میں اسی انسانیت کا فرق ہے اور یہی وہ پل صراط ہے جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے جس پر سے گذرنے کے بعد جنت قدموں میں ہوگی۔ اگر پھسلے تو جہنم کی گہرائیوں میں جا گریں گے۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہے۔ ذرا غور کیجیے اگر اس وقت کے لوگوں کو یہ کہا جاتا کہ جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں سینما یا ریڈیو ہوں گے۔ اور ہوائی جہاز اور موٹریں ہوں گی تو کوئی بھی نہ سمجھتا۔ حالانکہ ان چیزوں کے بغیر جنت مکمل نہیں ہو سکتی چلنے کی نہریں ہوں گی۔ کیونکہ ہیں تو دودھ ہضم نہیں کر سکتا ــــــ شہد کی نہر بھی کوئی خاص چیز نہیں۔ شراب البتہ کچھ کام کی چیز ہے اور حوروں کا کیا ہی کہنا۔ اس لئے عربوں کو وہی چیزیں پیش کی گئیں۔ جو ان کے لئے دلآویز ثابت ہو سکتی تھیں۔"

مائیکل: "مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ اب آئیے اصلی موضوع پر۔ مذہبی رواداری کے متعلق کچھ فرمائیے۔"

انصر: "زیادہ تو کیا کہوں۔ قرآن تو صاف اعلان کرتا ہے ــــــ " بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلم یا یہودی یا عیسائی جو خدا کے واحد ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور روزِ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ نیک اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بیشک ان کو اپنے رب کی طرف سے بہت انعام ملے گا۔ ان کے لئے کوئی تکلیف، کوئی خطرہ یا کوئی خوف نہ ہوگا۔"

مائیکل: "ایسی تعلیم سے تعصب رکھنا تو میرے خیال میں بے انصافی ہے مگر میرے خیال میں

قصور خود مسلمانوں کا ہے جو غلط مثال پیش کرتے ہیں"۔

انصر :۔ رونا تو یہی ہے۔ ورنہ ایک وہ وقت تھا کہ لوگ مسلمانوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی سے مسلمان ہو جاتے تھے۔ مذہب کا مقصد بھی یہی ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں برائے نام مسلمانوں سے چند سچے مسلمان بہتر ہیں۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں پر دو چار کروڑ انگریز حکمرانی کرتے ہیں۔ ایک مخلص انسان اگر چاہے تو دنیا کی تاریخ بدل سکتا ہے۔ ہٹلر اور سٹالین کی مثال ہی لیجئے روس کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی۔ لیکن آج وہ امریکہ سے بھی سبقت لے جانے کی سعی کر رہا ہے"۔۔۔

اتنے میں سینما کا وقت ہوا۔ محفل کل پر اُٹھا دی گئی ۔

ساتواں باب

اسلامی ریاست، حکومتِ الٰہیہ اور خلافت

ہمارے شہر میں بھی مسلمانوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ سوائے دو کے تمام مسلمانوں کی دکانیں بند تھیں۔ میں ریستوران کے بند دروازے کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہو کر اس کے دروازے پر کھڑا سوچ رہا ہو کہ اس کے بعد وہ کہاں جائے۔ کیا بیرونی دنیا اسے اپنی آغوش میں سما سکے گی یا پھر اسے جیل کی چار دیواری میں واپس سکونِ قلب کے لئے جانا ہو گا۔ اتنے میں مائیکل اور انصر بھی آ گئے۔ ہم تینوں کوئی پروگرام وضع کرنے کی فکر میں تھے کہ ریستوران کے مالک نے بادرچی خانے سے سر نکال کر ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور ہم چور دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ریستوران کا مالک بھی ہماری گفتگو سے دلچسپی رکھتا ہے۔ چوکور میز کانفرنس شروع ہو گئی۔

"بھئی آج کی ہڑتال کس سلسلہ میں کی گئی ہے؟" مائیکل نے کہا

ریستوران کا مالک: "کانگرس، یونینسٹ اور اکالی پارٹی نے مل کر وزارت بنائی ہے اس لئے مسلم لیگ نے بطورِ احتجاج ہڑتال کروائی ہے۔"

انصر: "تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ مسلم اکثریت والے پنجاب کے صوبے میں بھی کانگرس کا راج ہو گا۔ اس بات سے تو مسلم لیگ کے قول کو اور بھی تقویت ملے گی کہ جب پنجاب میں یہ حال ہے تو

مرکزی اسمبلی میں تو اُن کا خدا حافظ ہے۔ اس لئے پاکستان ہی اس کا واحد حل ہے۔"

مائیکل:۔ انصر صاحب۔ چلو بھئی آج اسی پر خیال آرائی ہو۔ مسلمانوں کی حکومت سے کیا مُراد ہے"۔

انصر:۔ "مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت میں بہت فرق ہے۔ مسلمانوں کی حکومت تو ہندوستان میں بھی سینکڑوں برس رہی اور اسلامی ممالک میں اب بھی قائم ہے مگر وُہ اسلامی حکومتیں قرار نہیں دی جاسکتیں۔ اس چیز کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اسلامی اصولوں کو جاننا ضروری ہے جن پر اسلامی ریاست یا حکومت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ میں نے کل کی گفتگو میں اس امر کی وضاحت کردی تھی کہ دین تمام مذاہب کا ایک ہے مگر شریعت جُدا جُدا ہے اسلام کے لفظی معنی ہیں 'امن' یعنی وُہ طریقہ یا راستہ جس سے انسان دُنیا میں امن برقرار رکھ سکتا ہے یا امن میں رہ سکتا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب تمام انسان ایک ہی اللہ کی اطاعت وعبادت اختیار کرلیں۔ اس لئے اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ یعنی قوانین الٰہی پر عمل پیرا ہوکر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ دُنیا کی ہر طرزِ حکومت کا یہ قاعدہ ہے کہ وُہ حکومت کے عہدہ داروں سے ایک حلف لیتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کی اسمبلی۔ کونسل یا فوج یا میونسپلٹی کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ میں اپنے ملک معظم کا وفادار رہوں گا اور اپنے قول وفعل سے حکومت کو ضرر نہیں پہنچاؤں گا۔ اسی طرح ہر پارٹی کا ایک پروگرام ہوتا ہے اور اُسکی رُکنیت حاصل کرنے سے پہلے پارٹی سے وفاداری کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ حلف اُٹھانے سے پہلے پارٹی کے اغراض ومقاصد سے واقفیت ہونا ایک لازمی امر ہے۔ فرض کرو۔ آپ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن جاتے ہیں۔ بعد ازاں اجلاس میں آپ یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ میں صنعت وحرفت کے شعبہ کو حکومت کے حوالے کرنے سے اختلاف رکھتا ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ لوگ آپ کا مذاق اُڑائیں گے ـــــ اور آپ پارٹی سے خارج کردیئے جائیں گے"۔

مائیکل:۔ "یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ یہ تو بڑی حماقت ہوگی کہ بغیر سمجھے کسی پارٹی کی رُکنیت اختیار کرلی جائے جس کے اغراض ومقاصد معلوم نہ ہوں۔ پروگرام"

انصر:۔ "فرض کرو میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ مسلمان ہو جائیے یعنی اللہ کی ایک خاص جماعت میں شامل ہو جائیے تو آپ کیا جواب دیں گے"۔

مائیکل :- یہی کہ پہلے مجھے تمام اغراض و مقاصد، پارٹی کے قوانین اور آئندہ پروگرام سے آگاہ کیجئے میں دوسری پارٹیوں سے موازنہ کرنے کے بعد کسی فیصلہ کا اعلان کروں گا۔"

انصر :- بیشک ہر خردمند انسان کا یہی جواب ہونا چاہیے اس روشنی میں اب اسلام کے بنیادی اصول کلمہ پر نظر ڈالیں لا الٰہ یعنی کوئی الٰہ نہیں اس کا مطلب میں پہلے واضح کر چکا ہوں، الا اللہ یعنی سوائے اللہ کے اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی شخص جو اس پارٹی میں شامل ہونا چاہتا ہے تمام خداؤں کو جنکی وہ پہلے اطاعت و عبادت کرتا رہا ہے مثلاً اپنا نفس۔ کوئی دیوتا۔ کوئی قبر یا مزار۔ کوئی انسان یا بادشاہ وغیرہ ان سے انکار کرے اور ایک ہی اللہ کی اطاعت کا حلف اُٹھائے۔ اس بات کا اقرار کرے کہ وہ اُس کے قوانین پر عمل پیرا ہوگا ـــ کون سے قوانین اس کا جواب ہیں۔ محمد الرسول اللہ وہ قانون جو محمدؐ کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا گیا۔ یعنی قرآن اور رسول کی مثال"۔

مائیکل :- تو اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ اتنا ذمہ دارانہ حلف اٹھانے سے پہلے اسلام کے قوانین کا مطالعہ ضروری ہے"۔

انصر :- اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ صرف ہندو کے گھر پیدا ہونے سے ہندو کہلانا۔ مسلم خاندان میں پیدا ہونے سے مسلم کہلانا وغیرہ صحیح معنوں میں درست نہیں ہے۔ ہر شخص کو تمام شریعتوں کے اصولوں سے واقفیت ہونا لازمی ہے تاکہ کھوٹے کھرے کی تمیز کر سکے اور اپنے لئے بہترین راستہ تجویز کر سکے"۔

مائیکل :- انصر صاحب! یہ علمی تحقیق بڑی دلچسپ رہے گی اور ہمارا مشغلہ بھی جاری رہے گا"۔

انصر :- مجھے منظور ہے۔ آپ کی سائنس کی کسوٹی ہو گی اور اس پر اسلام کو مجھے پرکھنے دیجئے اچھا خاصہ سائنس کا تجربہ ہو جائیگا۔ ہمیں فرصت ہی اور کام ہی کیا ہے"۔

مائیکل :- بہت بہتر آپ اسلامی حکومت کا ذکر کر رہے تھے"۔

انصر :- کلمہ سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ قوانین وضع کرنے کا اختیار کسی انسان کو نہیں بلکہ صرف خدا کو ہے۔ ایک رسول بھی اللہ کے قانون کا پابند ہوتا تھا اور اس کو بھی یہ اختیار نہیں تھا کہ اس میں ذرا بھی ترمیم و اضافہ کر سکے۔ خدا کے قانون کو لوگوں تک پہنچانا۔ اس پر عمل کرنا۔ اور

دوسروں کو اس پر عمل پیرا کروانا، یہی اس کا کام تھا۔ اسلامی حکومت کی بنیاد اسی اصول پر قائم کی جاتی ہے۔ اس کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں۔ کوئی شخص قبیلہ، خاندان، پارٹی، گروہ یا تمام کی تمام رعایا بھی حکومت کی مالک نہیں بن سکتی۔ مالک صرف اللہ ہے اور تمام مسلمان اس کی رعایا۔ کوئی بادشاہ، شخص یا لوگوں کے نمائندے قوانینِ الٰہی میں کسی قسم کے ردّ و بدل کے مجاز نہیں۔ حکومت کا کام صرف قوانین کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ بادشاہ ہو یا امیر، اسمبلی ہو یا کونسل، وُہ صرف خدا کے نائب کی حیثیت سے حکومت چلا سکتے ہیں، مالک نہیں بن سکتے۔ پہلی نظر ہی میں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت جمہوری نہیں، کیونکہ جمہوری نظام میں قوانین لوگوں کے نمائندے وضع کرتے ہیں اور وُہی اس میں تنسیخ و ترمیم عمل میں لاتے ہیں۔ حکومت الٰہیہ اس کو کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مگر یہ رُوم کے خدا کی بادشاہت سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ پاپائے اعظم ہی خدا کے پردے میں اپنی حکومت چلاتا ہے۔ لیکن ایک صورت سے یہ جمہوری نظام سے ملتی جلتی ہے، کیونکہ ایسے امور کے فیصلوں میں جس کے متعلق قرآن اور رسُول کی مثال نہ ملتی ہو، ہر وُہ شخص جو عاقلانہ رائے رکھتا ہو، اپنے اظہارِ خیال کی آزادی رکھتا ہے۔ کسی خاص گروہ یا شخص کی پابندی نہیں ہے۔ اس روشنی میں اسلامی طرزِ حکومت کو جمہوری حکومتِ الٰہیہ کہنا بالکل بجا ہوگا۔"

مائیکل "مگر اس صورت میں کیا انسان کی ذاتی اور روحانی آزادی خدا نے سلب نہیں کر لی حالانکہ آپ فرما رہے تھے کہ ایک ہی اللہ کی اطاعت پر ایمان لانے سے انسان سب انسانی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ تو وہی غلامی رہی۔ اپنی مرضی سے تو کوئی کام نہ ہوا۔"

انصر "میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انسان کے ہاتھوں سے قانون سازی کا اختیار خدا نے انسان کی ہی بہتری کے لئے سلب کیا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے مغربی دُنیا کی کسی جمہوریت کی مثال لے لیجئے۔ وہاں کیا ہوتا ہے۔ انتخابات میں وُہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ انسانوں کو اپنی طاقت اور مال و زر، ریاکاری، پروپیگنڈا اور چالاکی سے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے صحیح نمائندے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ آزادانہ ان لوگوں پر اپنے قوانین تھوپتے ہیں، جن کی ووٹوں سے یہ منتخب ہوئے تھے۔ برطانیہ اور امریکہ کی مثالیں

آپ کے سامنے ہے۔ دونوں ملکوں کے سرمایہ دار من مانی حکومت کرتے ہیں اور لاکھوں انسانوں کو ان کی خواہش کے برخلاف جنگ کے ہولناک شعلوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ سپاہی بن کر یہ لوگ اپنی تمام مسرتیں قربان کر دیتے ہیں۔ وہ قاتل خونی اور ڈاکو بننے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ بیشتر اپنی جان کا قیمتی سرمایہ لٹا بیٹھتے ہیں۔ اکثر اپاہج ہو کر گھر کو لوٹتے ہیں اور باقی جو صحیح وسلامت واپس آتے ہیں انہیں پھر نئے سرے سے دنیا میں روزی کے لئے جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔ ان حقائق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ قوانین عوام کی مرضی سے وضع نہیں کئے جاتے۔ فرض کر لو یہ تمام نمائندے عوام کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں مگر وہ بھی آخر انسان ہی ہیں۔ انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے قانون ساز بھی اکثر غلطیاں کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کے عوام نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ شراب واقعی بری چیز ہے۔ صحت اور اخلاق پر برا اثر ڈالتی ہے۔ اس لئے دونوں سے امتناع شراب کا قانون پاس کر دیا گیا۔ مگر جب یہی قانون عوام پر وارد کیا گیا۔ عوام اس کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ ناجائز شراب کا کاروبار بڑھ گیا۔ جرائم کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہی لوگوں نے جنہوں نے یہ قانون پاس کیا تھا۔ اس کی تنسیخ کا بھی حکم صادر کر دیا۔ اس کی یہ وجہ نہیں تھی۔ کہ شراب کے استعمال کا کوئی جواز مل گیا تھا جس سے شراب کو جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ لوگوں نے حکومت شیطان کے حوالے کر دی تھی یعنی اپنی نفسانی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے بجائے اللہ کے حکم کے کیونکہ مذہب شراب کی اجازت نہیں دیتا۔ اپنے نفس کو خدا تسلیم کر لیا تھا۔ یہ نیکی کی شکست تھی اور بدی کی فتح کامل۔ ایسی بہت سی مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان قانون سازی کا اہل نہیں۔ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ کوئی ذہن کامل یہ فرض انجام دے۔ آپ کے مشاہدہ میں یہ تو آیا ہو گا کہ مسلم سوسائٹی میں کوئی مسلمان اعلانیہ طور پر شراب نہیں پی سکتا۔ بشرطیکہ اسے اسلامی قانون کے آداب ملحوظ ہوں جو برائے نام مسلم ہے اس سے کیا شکوہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح حکام نے معاشرتی معاشی و مذہبی زندگی کی حدیں مقرر کر دی ہیں۔ یعنی فطری ضروریات کی تکمیل کے لئے شرائط عائد کر دی ہیں جن کا مقصد یہی ہے کہ انسان نہ اپنی ذات کو اور نہ کسی دوسرے انسان کی ذات کو نقصان پہنچا سکے۔

ان ضروریات کو پورا کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا مگر حد کے اندر رہنا یعنی اعتدال پسندی اسلام کی رُوحِ رواں ہے۔ ان پر تفصیل سے بحث اس وقت کروں گا جب آپ کی کسوٹی پر انہیں پرکھا جائے گا۔ فی الحال تو اتنا ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اللہ کے اس دستور العمل میں ترمیم و تنسیخ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس قانون سے بغاوت ہو سکتی ہے جیسی کہ تُرکی اور ایران میں ہوئی۔ اس لئے جو کوئی بھی اسے تسلیم کرتا ہے۔ خواہ وُہ کسی فرد کسی نسل، مُلک اور قوم سے تعلق رکھتا ہو بحیثیت جماعتی رُکن حکومتِ الٰہیّہ میں برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ عزت اور توقیر کا معیار انسان کی ذاتی قابلیت علم اور اخلاق پر منحصر ہے جو اس قانون کو تسلیم نہیں کرتا۔ وُہ اللہ کی دُوسری جماعت کا رُکن ہے۔ وُہ اسلامی حکومت میں رعایا کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اُس کی جان و مال اور اُس کی عزت کی محافظ اسلامی ریاست ہو گی۔ مگر وُہ حکومت کے نظام میں شرکت نہیں کر سکتا۔"

مائیکل: "کیا اسی لئے مسلمان اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں"۔

النصر: "فقط چاہنے کا سوال ہی نہیں۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے تو انسان اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ کسی ایک علاقہ یا مُلک میں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہو سکتی ہے۔ مغربی جمہوریہ میں بھی ایک عرصہ کے لئے ایک ہی پارٹی حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتی ہے اور مخالف پارٹی یا پارٹیاں برسرِ اقتدار پارٹی کی پالیسی وغیرہ پر تنقید کرتی ہیں بعض ایسی جمہوری حکومتیں ہیں۔ جہاں صرف ایک ہی پارٹی حکومت کر سکتی ہے۔ کوئی مخالف پارٹی وجود میں آنے ہی نہیں دی جاتی۔ مثلاً سوویٹ یونین جہاں صرف کمیونسٹ پارٹی حکومت کرتی ہے۔ اسی طرح دینی نظریئے کے مطابق ایک ہی پارٹی بیک وقت کسی جگہ حکومت کر سکتی ہے۔ شریعت کے جُداگانہ ہونے سے انسان مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر گروہ اپنی اپنی شریعت کو بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ مذہبی گروہ آپس میں اقتدار کی جنگ لڑ رہے ہیں جس مُلک میں ایک ہی مذہب ہے۔ چاہے اُس کے پیروکار برائے نام ہی کیوں نہ ہوں۔ وہاں اس قدر دقت پیش نہیں آتی جیسی کہ خاص طور پر صوبہ پنجاب میں جہاں مختلف گروہ خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک ہی مذہب کے پیروکاروں میں بھی کئی کئی گروہ ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں آریہ سماج۔ سناتن دھرم۔ جینی وغیرہ۔ مسلمانوں میں شیعہ۔ سُنّی۔ مرزائی وغیرہ عیسائیوں میں رومن کیتھولک اور

پروٹسٹنٹ وغیرہ مگر یہ اختلافات اس قدر اہم نہیں ہیں کہ جنگ کا باعث ہوں یہی وجہ ہے کہ یورپ برطانیہ۔ امریکہ اور اسلامی ممالک میں مذہبی جنگ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ہندوستان اور فلسطین میں آئے دن یہی قصہ دُہرایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی خودغرضی یا شیطنت جنگ کا بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ اگر مذہب اور ملک ایک ہیں تو لوگ سیاسی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اگر ملک ایک ہے اور مذہب جُدا جُدا تو لوگ مذہب کو بنائے جنگ ٹھہرا لیتے ہیں"۔

مائیکل: "بات تو واقعی سیدھی ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مذہب کے لئے ایک علیحدہ ریاست ہونی چاہیئے۔ جہاں وُہ اپنی من مانی کر سکے"۔

انصر: "مگر مشکل یونہی آسان نہیں ہوتی۔ اگر ریاستیں بھی علیحدہ علیحدہ مقرر ہو جائیں۔ تو آئندہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ ریاستیں آپس میں جنگ نہ کریں گی۔ جب برطانیہ اور جاپان ہزاروں میل دور دُوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے تو کیا ہندوستان میں جب سرحد کے ساتھ سرحد ملی ہوئی ہوگی۔ جنگ کے لئے بہانہ ایک معمولی بات نہ ہوگی۔ دو جاٹوں میں جبکہ کھیت کی منڈیر سانجھی ہو تو آئے دن مقدمہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ رونا تو اسی بات کا ہے۔ اگر سب مذاہب کے پیرو کار اتنا ہی سمجھ لیں کہ مذہب کا مقصد انسان کو انسان بنانا ہے تو لوگ انسانیت سے اپنی اپنی شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے جائیں اور آپس میں کم از کم اس بات پر متفق ہو جائیں کہ ہمارا خدا ایک ہے۔ اس لئے ہمارا اعتناد اس گروہ سے ہے جو خُدا کی ہستی سے مُنکر ہے ایک مذہب کا دوسرے مذہب سے جنگ کرنا سراسر حماقت ہے۔ اگر جنگ کرنی ہی ہے تو کافروں سے کرو۔ آپس میں کیوں کٹ کٹ کر مرتے ہو"۔

مائیکل: "اور میرے خیال میں جنگ تو احساسِ برتری کی خواہش کا بازگشاخسانہ ہے۔ اور یہ خواہش فطری ضروریات میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے۔ کیوں نہ اس جذبہ کی تسکین کے لئے کوئی دُوسری راہ نکالی جائے۔ تاکہ ایک گروہ دُوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہے اور جنگ سے بھی باز رہے"۔

انصر: "یہ سلسلہ ملاقات جاری رہا تو انشاء اللہ تعالےٰ کوئی صورت نکال ہی لیں گے۔

آپ کو بھی یہی خبط ہے تو مجھے بھی یہی عارضہ لاحق ہے۔ مجھے یہ علیحدہ علیحدہ ریاستوں کا نظریہ کچھ بھلا معلوم نہیں دیتا۔ یہ تو انسانوں کے ٹکڑے کر دینے کے مترادف ہے۔ کوئی خشک اور کٹر قسم کا مسلمان یہ باتیں سن لے تو مجھے ابھی کفر کے فتوے کی سند عطا فرما دے۔ اب چلنا ہی چاہیئے۔ کوئی مولانا ادھر نہ آنکلیں"۔

مائیکل اور انصر کے جانے کے بعد میں تنہا سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ ذہن میں آج کی گفتگو کا ایک ایک لفظ گونج رہا تھا جو مائیکل اور انصر کے درمیان ہوئی تھی۔ میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں اب تک جو کچھ زیر بحث آیا تھا۔ اُسے دُہراتا رہا۔

انسان کی چند بنیادی اور فطری ضروریات ہیں جن کی تکمیل کے لئے وُہ غیر جذباتی طریقے اختیار کرتا ہے۔ ہر انسان کے اخلاق اور کردار کا انحصار اسی طریقے پر ہے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ فطری ضروریات کی تکمیل کا اچھا طریقہ کون سا ہے۔ کائنات کا کوئی خالق ہے کہ نہیں؟ ــــ زندگی لافانی ہے یا صرف موت تک محدود ہے۔ پہلے دو سوالوں کا جواب مائیکل نے علمی تحقیق سے ثابت کر دیا تھا کہ بحیثیت ایک جاندار انسان پر پہلا فرض یہی عائد ہوتا ہے کہ وُہ اپنی جان کی حفاظت اور جسمانی قوتوں کی نشو و نما کرے۔ کیونکہ انسان شعوری اور محسوساتی حیوان ہے۔ اس لئے ان تمام پہلوؤں کی تکمیل بھی لازمی ہے۔ یعنی دو لفظوں میں تکمیلِ خودی مقصدِ حیات ہے ــــ اور تکمیلِ خودی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہر فرد اپنے سے اور اپنے ہمجنسوں سے عشق کرنا سیکھے۔ خود بھی جئے اور دوسروں کو بھی جینے دے۔ اپنی تکمیلِ خودی کرے اور دوسروں کو بھی اسی مقصد کے حصول میں مدد دے۔ انسانی زندگی کا جہاں تک اس دُنیا سے تعلق ہے۔ یہ جواب مکمّل ہے۔ موت کی سرحد کے اس پار کا علم سائنس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے ــــ اس لئے سائنس دوسرے دو سوالوں کا ابھی کوئی حل نہیں پیش کر سکی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سائنس خدا کی ہستی اور حیات بعد الموت سے انکار کرتی ہے دینی نظریات کو سائنس بغیر کسی عملی ثبوت کے تسلیم نہیں کر سکتی۔ حقائق کو ماننے سے سائنس کبھی انکار نہیں کرتی۔ موت کے بعد جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔ روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی مگر فلاسفر اور مذاہب اپنی اپنی مشعلیں لے کر خضرِ راہ ہونے کی

خدمات پیش کرتے ہیں۔ سائنس کچھ دور تک سہارا لیتی ہے مگر اندھوں کی طرح لاٹھی کا سہارا لے کر چلنے میں وہ اپنی تذلیل سمجھتی ہے۔ مفروضات کو قبول کر لینا اس کی فطرت نہیں۔ انصر صاحب نے دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ فلسفہ رہنمائی کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہم و گمان بذاتِ خود کور چشم ہیں۔ وہ کیا راستہ سمجھا سکتے ہیں۔ جس کا ضمیر یہ کہتا ہے کہ نہیں اس جہان کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہیئے۔ انسان کی زندگی یونہی ختم نہیں ہو سکتی تو وہ تمام شکوک کو دل سے نکال دے اور ایک راستہ اختیار کر لے۔ دور لبے پر کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ رہنمایانِ دین کی تمام زندگی سامنے ہے۔ ان کا اخلاق اور چال چلن اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے اقوال پر یقین کر لیا جائے۔ ان کے اقوال اور افعال میں ریاکاری کی بو تک نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ رسولِ عربی تو "امین" کہلاتے تھے۔ دشمنوں نے بھی یہ الزام کبھی نہیں لگایا کہ انہوں نے کبھی جھوٹ بولا ہو تو پھر اتنا بڑا جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا۔ اس قدر مصائب اور سختیاں جھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ دنیا کا ہر عیش اُن کے قدموں پر نچھاور کیا گیا مگر ٹھکرا دیا گیا۔ انبیا کیا کہتے ہیں۔ اس کی بھی وضاحت ہو گئی کہ صرف اللہ کی اطاعت کرو۔ خدا کی ہستی سے کوئی انکار شاذ و نادر کرتا ہے مگر انصر کہتا ہے کہ خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے کے یہ معنی نہیں کہ زباں سے یا دل سے یہ اقرار کر لیا کہ خدا ایک حقیقت ہے خدا کو تسلیم کرنے کے معنی ہیں اُس کی رضا پر چلنا اور دین کہتا ہے کہ خدا کی رضا کا طریقہ بھی وہی ہے جس میں انسان راضی رہیں یعنی قانونِ خدا انسان کی اپنی بھلائی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ایک نیک انسان نہ جنت کا خواہاں ہے نہ دوزخ سے ہراساں۔ وہ تو اللہ کی رضا کا طلبگار ہے۔ اور یہی ما ئیکل کہتا تھا کہ نیک وہ ہے جو نیکی کو اپنے افعال کا صلہ جانتا ہے جو خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر لوگوں سے نیکی کا برتاؤ کرتا ہے۔ یعنی انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب ہے۔ مذہب کا بھی یہی مقصد ہے تو اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مذہب یا دین کا راستہ یا اس کے قوانین بھی وہی ہونے چاہئیں جو انسانیت کے شایانِ شان ہوں انسان کی فطری ضروریات کی تکمیل کے لئے راہنمائی کریں اگر دین بھی تکمیل خودی کی اعانت کرتا ہے اور کسی طرح اس مقصد کے حصول میں حائل نہیں ہوتا تو سے باقی نظریات پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ آخر ہر انسان کو زندگی کا ایک راستہ تو اپنے لئے معین کرنا ہی

ہوگا۔ جو راستہ یا طرزِ عمل وہ اختیار کرتا ہے۔ وہی اس کا مذہب ہے۔ اس لئے مذہب کے بغیر تو
کوئی انسان جی نہیں سکتا۔ دین کے زاویۂ نگاہ سے بھی تو دو ہی گروہ ہونے چاہئیں۔ ایک ایمان
لانے والا دوسرا کافر۔ ایمانداروں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو برائے نام ہیں یعنی اپنی شریعت
پر عمل نہیں کرتے اور دُوسرے جو عمل کرتے ہیں۔ یعنی وہ نیک انسان ہیں۔ دوسری طرف کافروں
کے بھی دو گروہ ہیں۔ خدا کی ہستی کو وہ گو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر ایک گروہ ان میں نیکی۔ راستی۔ اچھائی
اور انسانیت کو اپنا خدا مانتا ہے اور دوسرا گروہ بدی یعنی شیطنت کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اگر اللہ
سے تمام نیکیاں منسوب ہیں اور شیطان سے تمام بدیاں۔ تو پھر اصل میں دُنیا کے تمام انسان دو
گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک انسانوں کا دُوسرا شیطانوں کا۔ یعنی ایک فرمانبرداروں کا اور
دوسرا شیطان کے پیروکاروں کا یعنی کافروں کا۔ نیکی اور بدی میں ہمیشہ جنگ ہوتی چلی آئی ہے۔
ناولوں۔ کہانیوں اور قصوں میں بھی یہی ہوتا ہے —— نیکی کی آخر کار فتح ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے
کہ بدی بہت دلکش ہوتی ہے مگر اس مسرت کی زندگی چند روزہ ہے۔ نیکی میں جاذبیت نہیں مگر
اس کی چاشنی دیرپا ہے۔ اچھی اور بُری چیز میں تمیز کیسے کر سکتے ہیں۔ کل مائیکل اور انصر سے یہی موضوع
چھیڑوں گا۔ میں زندگی کا بہترین طریقہ دریافت کرنا چاہتا ہوں اور اسی طریقہ پر گامزن ہونے کا تہیہ
کروں گا۔ یہ بے راہ روی کسی کام کی نہیں۔ مجھے اپنی زندگی کے لئے مناسب شاہراہ انتخاب
کرنا ہے!——

دُوسرا حِصّہ

پہلا باب

فطری ضروریات کی تکمیل کا بہترین طریق

دفتر کے کسی کام میں بھی جی نہیں لگتا تھا۔ دماغ زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا یہی انتظار تھا کہ کب چار بجیں اور ہم تینوں اکٹھے ہوں ۔۔۔ عین چار بجے میں دفتر سے رخصت ہوا۔ اور سیدھا ریستوران پہنچا۔ وہاں مائیکل اور انصر بھی موجود تھے۔ میں نے ان دونوں کو اپنی پریشان خیالی سے آگاہ کیا۔ مائیکل سے میں نے درخواست کی کہ آج زندگی کے بہترین راستہ کو گفتگو کا موضوع بنائیں

مائیکل :۔ آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے فطری ضروریات کا نقشہ آپ کو سمجھایا تھا۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی کی مسرت کا انحصار انہیں خواہشات و ضروریات کی تکمیل پر ہے۔ میں بتدریج ان تمام ضروریات کی تکمیل کے مختلف طریقوں کو زیر بحث لا کر بہترین طریقہ پیش کروں گا اور انصر صاحب اس کا اسلامی طریقہ پیش کریں گے اور سعید صاحب آپ ان دونوں پر تنقید کرنے کے بعد ایک غیر جانبدارانہ فیصلہ فرمائیں گے۔"

"بہتر ہے" میں نے کہا

مائیکل :۔ پہلے اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ سائنس کی کسوٹی حسن کے اصول بہتر سے بنائی گئی ہے۔ اسی پر سب طریقوں کو پرکھا جائے گا۔ یہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ انفرادی زندگی کا بنیادی اصول اپنی ذات سے عشق ہے۔ میں انسان کی اولیں ضروریات سے شروع کرتا ہوں

یعنی جسمانی ضروریات۔ اچھی صحت اور جسمانی خوبصورتی کی اہمیت جتانے کی چنداں ضرورت نہیں صحت کی خرابی انسان پر تمام مسرتوں کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ فطری ضروریات کی تسکین کے تمام سامان اور ذرائع کی موجودگی کے باوجود خرابی صحت ان تمام مسرتوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ بیمار یہی کہتا ہے کہ مجھ سے سب کچھ چھین لو مگر مجھے میری صحت واپس دے دو ــــ اس لئے اگر اپنی ذات سے عشق ہے تو سب سے پہلے اپنی صحت کو بحال رکھنا اور جسم کی نشوونما کرنا سیکھو۔ اچھی صحت کے لئے اچھی غذا لازمی امر ہے۔ اس کے علاوہ کھانا اور پینا انسانی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ قدرت کی پیدا کردہ انواع و اقسام کی اشیا سے لطف اندوز نہ ہونا کہاں کی دانائی ہے۔ کھاؤ پیو اور عیش کرو کا یہ مفہوم نہیں کہ جو چیز دل چاہے استعمال میں لے آیئے۔ اور نہ ہی پرہیز کا یہ مطلب ہے کہ تمہاری غذا صرف جسم اور صحت کو برقرار رکھنے کے لئے دوا کا کام دے۔ غذا میں دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ غذا ذائقہ دار بھی ہو اور صحت کے لئے فائدہ مند بھی ــــ قدرت نے تو اس معاملہ میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ دودھ، پھل اور سبزیاں، گوشت وغیرہ اسی موضوع پر بیشمار کتابیں اور رسالے ملتے ہیں۔ اس لئے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ اصول مدِنظر رکھنا چاہئے۔ ہر اس چیز سے لطف اٹھاؤ جس سے تمہاری صحت کو کوئی ضرر پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر انسان ایک خووی کا مالک ہے۔ اس لئے ایک چیز جو آپ کے لئے امرت ہے، وہ دوسرے کے لئے زہرِ قاتل ثابت ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر دودھ اور لسی کے استعمال سے مجھے سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے میرے لئے مضر ہیں۔ حالانکہ یہ بہترین غذا میں شامل ہیں۔ اس لئے میں چائے میں دودھ زیادہ استعمال کر لیتا ہوں۔ اس طرح مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"آپ کی علمی تحقیق کے مطابق انسان کی معیاری غذا کیا ہونی چاہئے؟" ــــ میں نے استفسار کیا۔

مائیکل: سارا دن کھاتے رہنا یا ایک دو دفعہ پیٹ بھر کر کھانے سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ غذا دن میں تین دفعہ کھانی بہتر ہے اور شام کی چائے بھی شامل ہو سکتی ہے۔ غذا کی مقدار ہر شخص کے لئے جداگانہ ہے۔ جسمانی محنت کرنے والوں کو دماغی کام کرنے والوں کی نسبت زیادہ

غذا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ صبح کے ناشتے میں انڈے۔ مکھن۔ روٹی اور دودھ ہونا چاہیئے۔ دودھ چائے اور لسی کی صورت میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوپہر کو روٹی، دہی یا پنیر اور موسمی پھلوں کے ساتھ دودھ یا لسی بہترین ہے۔ رات کے کھانے میں گوشت مچھلی۔ آلو۔ روٹی۔ دالیں یا سبزیاں اور کوئی خشک میوہ یا میٹھی چیز ہونی چاہیئے۔ شام کی چائے جو اشخاص پسند کرتے ہیں۔ پی سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ زیادہ کھانا نہیں چاہیئے۔ زیادہ مرغن اور مسالے دار غذاؤں سے پرہیز رکھنا اچھا ہے۔ کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ قدرت کی تمام غذاؤں کی صورت کو مسخ نہ کر دیا جائے۔ آپ کہیں گے کہ اتنی غذا تو عام آدمی فراہم نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں تو فراہمی کا سوال ہی نہیں۔ سوال ہے فطری ضرورت کا۔ اور یہ ضرورت سب سے اہم ہے۔ اس لئے حکومت۔ ریاست یا سماج کا اوّلین فرض یہ ہے کہ ہر انسان کو پوری غذا مہیا کرے۔ ورنہ زندہ مُردے تو چلتے پھرتے کروڑوں کی تعداد میں ہندوستان اور چین میں موجود ہیں۔ اتنی پیدائش سے فائدہ کیا جب ایک سو انسانوں میں بمشکل دو چار کو معیاری غذا نصیب ہے۔"

انصر: "آپ کا کہنا بجا ہے۔ زندگی فاقہ کشی اور افلاس کا نام نہیں۔ خدا نے انسانوں کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ دُنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ صرف انسانیت کا فقدان ہے اچھا تو اس کے بعد۔"

مائیکل: "دُوسری لازمی ضرورت ہے لباس اور گھر۔ آرام کے لئے ضروری ہے کہ کوئی محفوظ اور آرام دہ جگہ میسر ہو۔ وحشی انسان بھی غاروں میں پناہ لیتا ہے اور کپڑوں کی بجائے جانوروں کی کھال پہنتا ہے۔ یہی غار جھونپڑوں میں مبتدل ہو گئے۔ ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جھونپڑیوں کی جگہ مکانوں نے لے لی اور زمانہ حال کی شاندار عمارتیں اسی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ یعنی ایک ایسی جگہ جہاں ایک فرد اطمینان سے انفرادی زندگی بسر کر سکے یا ایک خاندان کی بلیا در کھ سکے اور اس کی پرورش کر سکے۔ ایسی جگہ کے لئے دیگر لوازمات بھی ضروری ہیں۔ انسانی تہذیب کے حسب ارتقاء ان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج کے ایک معیاری گھر میں تمام ضروری فرنیچر۔ برتن۔ بجلی۔ ریڈیو اور لیمپ کا ہونا لازمی ہے۔ ایسی اشیاء کا میسر آنا مسرت میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر ان اشیاء کی کمی سے کسی شخص کو افسردہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ خواہشات کی حد نہیں۔ اس لئے قناعت اچھی ہے۔ مگر

قناعت کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے حصول کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ عیش و راحت کے سامان کے لئے جدوجہد لازمی ہے۔ ان چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں کوئی برائی نہیں۔ اگر تمام راحتیں میسر نہ آسکیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ سب سے مقدم چیز تو صحت ہے اور اس کے حصول کے لئے صرف غذا پر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ باقی چیزیں مثلاً ہوا، پانی، سورج کی شعاعیں ورزش اور غسل سب کی سب قدرت کے عطیئے ہیں۔ ان انمول چیزوں کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی۔ اور انہی پر صحت کا دارو مدار ہے۔"

النصرۃ:- آپ کے خیال میں ایک معیاری گھر کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟"

مائیکل:- پہلی بات یہ ہے کہ گھر کی ساخت اتنی مضبوط ہونی چاہئے۔ جو بارش۔ آندھی۔ اور طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ دوسری یہ کہ دھوپ اور ہوا کا گذار مکان میں آزادانہ ہو۔ اب اسی پر غور کیجئے۔ اتنی لازمی ضرورت کتنی کمیاب ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندوستان کے شہروں پر نظر کرو کتنی عمارتیں ایسی ملیں گی جہاں دھوپ اور ہوا کا گذر تک نہیں۔ ضرورت تعیش میں مبدل ہو گئی ہے۔ ایسی جگہ تو بنگلے اور کوٹھیاں ہی ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اندرونی شہر رہنے کے قابل نہیں۔ ایک اچھے شہر کے لئے ضروری ہے کہ سڑکیں نہایت فراخ ہوں۔ مکان اور عمارتیں معیاری ہوں۔ شہر کو گنجان کرنے کی بجائے پھیلا دینا زیادہ بہتر ہے۔ پانی اور نالیوں کا زمین دوز انتظام نہائت ضروری ہے۔ یہ انسان کی ابتدائی ضروریات ہیں۔ اس لئے حکومت کا فرض یہ ہے کہ رہنے کے لئے سب کو معیاری گھر فراہم کرے!

دوسرے لوازمات مثلاً فرنیچر، کپڑے۔ برتن۔ ریڈیو۔ موٹر کار وغیرہ کے لئے اتنا معاوضہ دے جس سے یہ سامان سب کو میسر آسکے۔ ایسے تاریک اور گندے مکانوں میں رہنے سے تو وحشی زندگی کا غار بدرجہا بہتر تھی۔ کیا یہ تہذیب کی بے انصافی نہیں کہ اس نے انسانوں کو ایک لازمی چیز سے محروم کر دیا۔ مجھے تو حیرانی ہوتی ہے کہ گاؤں میں رہنے والے بھی اس مرض کا شکار ہیں۔ حالانکہ ان کے ذلیل گھروں سے (انہیں گھر کہنا بھی حماقت ہے) باہر جہاں تک نگاہ جاتی ہے۔ ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہیں۔ تازہ اور فرحت بخش ہوا ایک نغمہ سناتی ہے۔ مگر یہ بدنصیب کسان ایک

تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر میلے کچیلے لحافوں میں پڑا ساری رات کھانستا رہتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اپنے کھیتوں میں اپنے گھر تعمیر کریں۔ آپ کہیں گے کہ اس طرح وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے کوئی حرج نہیں۔ چند اشخاص آپس میں اکٹھے مل کر کاشتکاری کرنا سیکھیں اور اپنے اپنے گھر ایک ہی جگہ کھیتوں میں بنا لیں اور ایسی تمام چھوٹی چھوٹی بستیوں کے درمیان ایک مارکیٹ قائم کر دیں۔ جہاں تمام کاروباری سلسلہ ہو۔ مثلاً پولیس۔ بینک، پنچایت گھر وغیرہ یہ فرض بھی حکومت ہی کا ہے۔ افراد کا نہیں۔ وہی اس کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے۔ اس لئے میں نے ریاست کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی تھی۔ ریاست تعلیم اور قوت کے ذریعے لوگوں کو بہتر طریقے پر چلا سکتی ہے۔ خیال کیجئے۔ ایک جنگلی انسان بھی کھالیں بچھا کر سوجاتا ہے اور کھالیں پہن لیتا ہے مگر تہذیب کے اس دور میں بیشتر افراد ایسے ہیں جنہیں تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سونے کے لئے چارپائی تک نصیب نہیں۔ ایسے بھی ہیں۔ جن کے پاس اس قدر مال و زر ہے کہ انہیں اُسے خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس افراط کو نادار لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ رہا لباس کا معاملہ۔ لباس کے پسِ پردہ دو ضروریات کام کرتی ہیں۔ ایک تو ہے تن ڈھانکنا تاکہ سردی اور گرمی سے خود کو محفوظ رکھا جائے۔ دوسرا مقصد ہے زیبائش۔ لباس کا یہ مفہوم ہے کہ سر سے لے کر ایڑی تک زیبائش۔ تہذیب کے اس دور میں یہ دوسرا مقصد زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اپنی طرف مائل کرنے کی خواہش یا دُوسروں کی نظروں میں بچنے کی خواہش اچھے اچھے لباس پہننے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کا جمالیاتی ذوق بھی اچھے لباس کا متمنّی ہے۔ بعض لوگ فیشن پرست اشخاص کے لباس پر بڑی تنقید کرتے ہیں۔ مگر میری رائے میں ایک فیشن پرست شخص اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو میلے کپڑے پہنتا ہے۔ یا بے سلیقہ لباس پہنتا ہے۔ جس سے جمالیاتی ذوق کو ٹھیس لگتی ہے کم از کم لباس کا شائق آنکھوں کو ایک مکروہ نظارہ سے تو دوچار نہیں ہونے دیتا"۔

"لباس کس قسم کا ہونا چاہیئے؟" میں نے استفسار کیا۔

مائیکل:۔ لباس کسی قسم کا بھی ہو مگر پہننے کا سلیقہ ضرور آنا چاہیئے۔ سلیقہ سے پہنا ہوا

سادہ سے سادہ لباس بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لباسِ فاخرہ ہی زیبِ تن کرنا چاہیئے۔ سلیقہ سے یہ مُراد ہے کہ سر سے لیکر پاؤں تک لباس ہم آہنگ ہو۔ اس میں یکرنگی اور نفاست ہو۔ مثال کے طور پر انسان کے جمالیاتی ذوق کو کس قدر ٹھیس لگتی ہے۔ جب کوئی شخص کالے سوٹ کے ساتھ براؤن بوٹ پہنتا ہے۔ یا کالے جُوتے کے ساتھ براؤن جراب مطلب یہ ہے کہ پگڑی یا ٹوپی سوٹ یا اچکن رٹائی وغیرہ یہ چیز یکرنگ ہونی چاہیئے۔ میں وحدت رنگ کا قائل ہوں۔ لباس پہننا بھی ایک آرٹ ہے۔ لباس ظاہری سے کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وُہ نفاست پسند ہے یا کور ذوق۔ جمالیات کا پرستار ہے یا مکروہات کا۔ اچھا لباس سماج میں ایک خاص وُقعت رکھتا ہے مگر بھڑکیلے لباس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ لباس سادہ ہی بہتر ہے مگر کہیں اس قدر سادگی بھی اختیار نہ کرلو کہ برہنہ ہی نظر آؤ۔ جیسا کہ کوئی برہنہ سوسائٹی کا ممبر۔"

"برہنگی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے"؟ میں نے کہا۔

مائیکل:۔ شاید تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ برہنگی کے پیرو کار اس کے جواز میں دو دلائل پیش کرتے ہیں یعنی سورج کی شعاؤں میں صحت کا راز مضمر ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر یہ عمل تو پوشیدہ طور پر بھی ہو سکتا ہے یا سمندر کے کنارے تیراکی کے لباس ہیں! مگر بالکل برہنہ ہونے میں کیا خصوصیت ہے۔ کم از کم جنسی اعضا تو مستور رہنے چاہئیں مگر یہی تو وُہ مقام ہے جس کی ستر پوشی انسانی اخلاق پر اثر ڈالتی ہے۔ اس خیال کے حامی یہ بیان دیتے ہیں۔ کہ ہم جب تمام لوگ برہنہ حالت میں ہوتے ہیں تو کسی کی نظروں سے کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا اور حقیقت سامنے آجاتی ہے اور اس سے اخلاق کو تقویت ملتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ انسانی اعضائے تناسل قابل دید چیز نہیں ہیں۔ ایسے بدصورت اعضا کو مستور رکھنا ہی بہتر ہے تاکہ جنسی کشش باقی رہے۔ حقیقت کڑوی ہے مگر زندگی کی حقیقتوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے رُومان کی نگاہوں سے کام لینا چاہیئے۔

ہاں تو ایک بات یاد رکھئے۔ یہ بات کبھی فراموش نہ کیجئے کہ آپ ایک شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لئے دوسروں کی بے جا تقلید مناسب نہیں ہے۔ لباس کے معاملہ میں بھی نقل کرنا درست نہیں۔ یہ ضروری

نہیں کہ ایک لباس جو دوسرے کے جسم پر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ وُہ تمہارے جسم پر بھی دلآویز نظر آئے
اس لئے لباس کے معاملے میں تجربات کرو۔ سوٹ پہنو۔ اچکن بھی پہن کر دیکھو۔ شلوار
قمیص بھی پہنو۔ ہر قسم کا رنگ۔ ہر کاٹ اور ہر فیشن کا تجربہ کرو۔ اور پھر کوئی نتیجہ اخذ
کرو کہ تمہیں کون سا لباس زیادہ زیب دیتا ہے۔ دوستوں سے صلاح و مشورہ لے سکتے ہو۔
لباس کے رنگ کی جسم کے رنگ سے مطابقت ضروری ہے۔ ایک حبشی کو سفید رنگ
زیب نہیں دیتا۔ ہلکا آسمانی یا نیلا یا بھورا زیادہ موزوں ہوگا۔ لباس کی خوبصورتی اتنی
اہم نہیں جتنی کہ تمہاری شخصیّت۔ اس لئے ایسا لباس پہنو۔ جس سے تمہاری شخصیّت
کو چار چاند لگ جائیں۔ دُور سے لوگ تمہیں پہچان لیں۔ یہ نہ ہو کہ ہجومِ افراد میں تم بھی گم
ہو جاؤ ——— اچھا تو اب آپ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان امور پر روشنی ڈالیں۔"

انصر:- کھانے پینے کے متعلق قرآن پاک یہ احکام دیتا ہے کہ کھاؤ پیو۔ مگر حد سے
تجاوز مت کرو۔ جو چیز صاف ستھری اور صحت مند ہو۔ اُسے کھاؤ۔ مگر شیطان کی پیروی مت
کرو۔ کیونکہ وُہ تمہارا دشمن ہے ——— جو لوگ ایمان دار ہیں۔ اُن پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں
یعنی مُردہ جانور کا گوشت۔ خُون۔ سُور کا گوشت۔ وُہ غذا یا گوشت جو غیر اللہ کے نام پر ذبح
یا قربانی میں پیش کیا گیا ہو ——— کوئی جانور جو گلا گھونٹنے سے مر گیا ہو۔ یا گر کر مر گیا ہو۔
یا سینگوں سے زخمی ہو کر مر گیا ہو۔ یا کسی درندے کا شکار ہو گیا ہو۔ حلال وُہ گوشت ہے جو
خدا کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان کے جواز میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ کوئی تہذیب یافتہ
انسان یہ چیزیں کھانے کی طرف رغبت نہیں کر سکتا۔ اعتراض صرف سور کے گوشت اور
غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کا ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے طبّی سائنس شاہد ہے
کہ سُور کا گوشت صحت کے لئے مضر ہے۔ وُہ بے حیا جانور ہے۔ اس کے کھانے سے بےحیائی
پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ تم وُہی کچھ بنتے ہو۔ جو کچھ کہ تم کھاتے ہو اور یہ ایک حقیقت ہے۔
کیونکہ سُور گندگی بھی کھاتا ہے ——— اس کا گوشت بھی ناپاک ہے اور غیر اللہ کے نام پر ذبح
یا قربان کئے ہوئے گوشت کو کھانا تو وحدتِ حق کو تسلیم کرنے والے کی خود اپنی تذلیل ہے۔

آپ کو مائیکل صاحب کوئی اعتراض ہو تو بتلایئے۔"

مائیکل:۔ سائنس کا اصول میں بتا چکا ہوں۔ باقی اپنی اپنی پسند ہے۔ جاپان کے لوگ چوہے تک کھا جاتے ہیں۔ فرانسیسی مینڈک کے بہت شائق ہیں۔ کھانے والوں کا دعوےٰ ہے کہ مینڈک کے گوشت ایسا لذیذ اور کوئی گوشت نہیں۔ بعض افراد ایسے ہیں۔ جو بکری کا گوشت پسند کرتے ہیں۔ مگر گردے اور پھیپھڑے۔ زبان دُم وغیرہ کو چھوتے بھی نہیں۔ اس لئے ان باتوں پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ جو لوگ اپنے مذہب کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ شوق سے کر سکتے ہیں ہاں سعید صاحب آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟"

سعید:۔ جو چیز کسی کو پسند آئے کھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ طبی نقطہ نگاہ سے مضرِ صحت نہ ہو۔ اگر کوئی شخص مذہب کا احترام کرتا ہے اور کسی خاص چیز سے پرہیز کرتا ہے۔ تو اس میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ کھانے پینے کے معاملے میں اگر کوئی غلط روش اختیار کرتا ہے تو اُسے مشورہ دینا سماج کا فرض ہے۔ محبت سے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ انصر صاحب آپ نے لباس کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

انصر:۔ اسلام اچھے لباس کی تلقین کرتا ہے۔ لباس کا پاک و صاف ہونا اسلام میں نماز کے لئے ضروری ہے۔ خُدا کی نعمتوں سے لطف اندوز نہ ہونا کفرانِ نعمت ہے۔ اللہ تو صرف فضول خرچی سے منع کرتا ہے تاکہ مفلس و نادار انسانوں کو بھی فائدہ پہنچا سکو۔ لباس کو مخصوص کرنے سے مختلف مذاہب کا مقصد یہ ہے۔ کہ ان کے پیروکاروں کی شناخت ہو سکے۔ مسلمانوں کو داڑھی۔ سکھوں کے بال۔ ہندوؤں کی چوٹی اور عیسائیوں کی صلیب اس اصول کی آئینہ دار ہے۔ مگر ان ظاہری صورتوں کا مذہب کے مقصد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ تقلید جذبہ احترام سے منسوب ہے۔ مذہب کسی مخصوص لباس پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ مذہب

کا تعلق دل سے ہے۔ اپنے مذہب کے بانی کا کوئی جتنا چاہے احترام کرلے۔ یہ اس کا انفرادی فعل ہے۔ کسی کو مجبور کرنے کا اُسے کوئی حق نہیں۔ جو جی میں آئے۔ پہنو اور دُوسروں کو اُن کی اپنی مرضی کے مطابق پہننے دو۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ رواداری تہذیب کی روح رواں ہے ـــــ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مختلف پسند کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو وُہ مہذّب کہلانے کا حق دار نہیں۔ ایک ہی لباس کسی قوم یا جماعت کو منظّم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں۔ اس لئے کوئی مخصوص لباس یا ظاہری صُورت وجۂ منافرت نہ ہونی چاہئے"۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

دوسرا باب

عشق۔ جنسی بھوک۔ شہوت۔ خوبصورتی اور عورت کا باہمی تعلق

ریستوران جو پہنچا۔ تو شام لال کو وہاں موجود پایا۔ بغلگیر ہونے کے بعد میں نے اس سے جلدی اور اچانک آجانے کی وجہ دریافت کی۔ بڑی افسردگی سے بولا "آؤ علیحدہ کمرے میں بیٹھ کے باتیں کریں"

شام لال "پچھلے چند دنوں کے قیام کے دوران میں ایک دن میں مندر چلا گیا تھا۔ آپ کو میری طبیعت کا حال معلوم ہے۔ جب بھی کوئی حسین صورت نظر آئی خوش ہو گیا۔ میں عشق کا تو قائل نہیں ہوں جب دل چاہا۔ دو چار گھڑی کے لئے معشوق مہیا کر لیتا ہوں۔ مگر میرے دوست خدا جانے اس دن میرے دل کو کیا ہو گیا۔ بس اسے دیکھ کے محوِ حیرت ہو گیا۔ سفید ساری میں ملبوس یوں نظر آتی تھی۔ جیسے سنگِ مرمر کا تراشا ہوا بُت حرکت میں ہے۔ اس پر ستم یہ تھا کہ اس کے شانوں پر دو بدمست ناگ جھومتے ہوئے نظر آتے تھے۔ آنکھیں تھیں کہ کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پیارا اور کومل جسم بل کھا رہا تھا۔ کیا بتاؤں کہ وہ کیا تھی۔ بس سمجھ لو کہ ایک پیکرِ نور تھی۔ ایک شعلہ جوالا تھی۔ اس کا نام ہے ونیا کماری۔ ملٹری میں کلرک ہے"۔

مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ "آخر تم بھی حسن کی گرفت میں آ ہی گئے"۔

شام لال :- سُنو تو ---- ہاں میں نے ملنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ کیونکہ مجھے واپس جانا تھا۔ اس لئے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا۔ مگر وہاں اتنے دن کس طرح کاٹے ہیں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ آہ ----

یہ خالِ سیہ زُلفِ دُوتا گیسوئے مُشکیں
تجھ سی نہیں دُنیا میں طرحدار حسینہ"

"مکرّر!! مکرّر!!" مائیکل اور انصر نے بلند آواز سے کہا۔

میں نے شام لال کی داستان دُہرائی اور مائیکل سے اُس کی نفسیات پر گفتگو کرنے کی درخواست کی۔ مائیکل نے فطری ضروریات کا نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا اور پھر بولا :-

مائیکل :- "عشق و محبّت کے احساسات کے پسِ پردہ دو جذبات کام کرتے ہیں۔ ایک تو شہوت یا جنسی کشش۔ دُوسری خواہش تعاقب اور لذّتِ شکار ---- جب آپ یہ کہتے ہیں کہ مجھے فٹ بال۔ ناولوں یا فلموں سے عشق ہے۔ تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ ان مشاغل میں آپ کو بے حد دلچسپی ہے۔ اُن کے تعاقب سے آپ کو مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک سائنس دان، شاعر اور فلسفی کو اپنے علم یا آرٹ سے عشق ہوتا ہے۔ آرٹ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جدوجہد کرنا۔ یا علوم میں اضافہ کرنا سب اسی جذبہ کے ماتحت عمل میں آتے ہیں۔ وحشی انسان جذباتی طور پر شکار کا تعاقب کرتا ہے اور کسی جانور کو شکار کر کے تسکینِ قلب حاصل کرتا ہے۔ مگر تہذیب یافتہ انسان اسی جذبہ کی بے شمار طریقوں سے تسکین کرتا ہے۔ انسان خوبصورت اشیاء۔ مثلاً عورت۔ تصاویر۔ عمارات۔ زیورات لباس وغیرہ کا شائق ہے حُسن میں بے پناہ کشش ہے اور یہ کشش تعاقب کرنا کسی حسین شے کے حصُول کے لئے سعی کرنا اور اُس چیز پر تسلط پا کر مسرّت محسوس کرنا وغیرہ تمام خواہشات و جذبات اور احساسات کا پیش خیمہ ہے۔ جو چیز آپ کی نظروں میں حسین نہیں۔ جو آپ کی کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ اس کے حصُول کے لئے آپ کوشش نہیں کرتے۔ اُس کو شکار کرنے کی آپ کو فکر نہیں ہوتی۔ یعنی آپ کو اُس چیز سے کوئی عشق یا محبّت نہیں ہوتا۔ یہ ہے حقیقت۔ ایک حسین عورت یا کسی حسین جانور یا بے جان چیز کے عشق کی۔ اب دُوسرے پہلو کو لیجئے۔ جب آپ والدین۔ رشتہ داروں۔ دوستوں۔ عزیزوں۔ ہمسایوں

یا اپنے بیوی بچوں سے عشق و محبت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُس سے مُراد اُنس۔ اُلفت۔ شفقت۔ ہمدردی وغیرہ ہوتی ہے۔ ان تمام تعلقات کے پس پردہ جذبۂ شفقت کام کرتا ہے۔ اسی لئے ان تعلقات کو پاک محبت یا بے غرض عشق کا نام دیا جاتا ہے ـــــ اس عشق کی روحِ رواں عشقِ انسانیت ہے۔ فیاضی، رحمدلی، ایثار، سخاوت ان سب کا اسی جذبے میں شمار ہوتا ہے۔ ایک ماں اور اُس کے بیٹے کی محبت، دو دوستوں کی باہمی محبت ایسی ہی بے غرض محبت کی مثالیں ہیں۔ ایک شاعر کی نظم کا میں مطلب پیش کرتا ہوں۔ اس کا محبوب بضد تھا کہ وُہ اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ جب تک وُہ اپنی ماں کا دل نکال کر اُسے بطور ہدیہ پیش نہ کرے عشق اندھا اور دیوانہ ہوتا ہے۔ ماں کا سینہ چیر کر دل نکال لیا۔ راستے میں ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اسی وقت ماں کے دل سے ایک پیار بھری آواز آئی۔ "میرے پیارے بیٹے، کہیں تیرے چوٹ تو نہیں آئی"ـــ ماں کی ممتا ضرب المثل ہے مگر پھر بھی ایسے انسان موجود ہیں۔ جو اپنے والدین کو دُکھ پہنچاتے ہیں اور اُن کی بے عزتی تک کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس محبت کے بعد بہن، بھائی اور دوسرے رشتہ داروں اور ہمسائیوں وغیرہ کی اُلفت ہے۔ جذبہ ایک ہی ہے مگر شفقت کی شدت کے درجے کم اور زیادہ ہیں۔ مگر خون کے رشتوں سے بڑھکر دوستی کا رشتہ ہے۔ جو بے غرضی اور ایثار کا مرکب ہے ـــــ دوستی میں دو جذبے کارفرما ہیں ایک شفقت اور مہربانی، دُوسرا اپنے ہمجنسوں کی صحبت کی تشنگی۔ ایک مثل مشہور ہے کہ تمہارے دوست تمہارے اپنے انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ مگر تمہارے رشتہ دار واقعات کی پیداوار ہیں اور یہ حقیقت ہے۔ تمہاری چچی اس لئے چچی ہے کہ وُہ تمہارے باپ کے بھائی کی بیوی ہے۔ خواہ تمہیں اس سے رغبت ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح تمام خون کے رشتے ہیں۔ اگر کسی رشتہ دار سے تمہاری دوستی ہو جاتی ہے۔ یا باہمی اُنس یا پیار کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو پھر تمہارے محسوسات میں مخلصانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ معاملہ وضعداری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر میں الفت مگر باطن میں حسد اور دشمنی۔ یہ عام اصطلاح میں محبت کے معنی ہیں۔ اب لیجئے عشق و محبت کا مخصوص اصطلاحی مطلب۔ یعنی جنسی مواصلت کی خواہش اس زبردست خواہش کے پس پردہ میں جنسی کشش کارفرما ہے۔ جو مخالف جنسوں کو ہمکنار کرتی ہے۔ اس کی وضاحت میں ابھی کرتا ہوں۔ مگر اس امر کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ جنسی کشش یا شہوانی

جذبات ایک ہی جنس کے دو افراد میں بھی عام طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ دونوں مخالف جنسوں کا ایک دوسرے سے دُور رہنا ــــ جس سماج میں عورت اور مرد کے درمیان دیواریں حائل ہوں۔ وہاں لازمی طور پر یہ فطری جنسی کشش ایک غیر فطری طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔ عام طور پر سکول کے لڑکے اور لڑکیاں آپس میں اپنے ہم جنسوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جذبہ تو ایک دریا ہے۔ جو اپنے لئے راستہ بنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ البتہ آپ بہاؤ کا رُخ بدل سکتے ہیں۔ بند لگا کر اس بہاؤ کو نہروں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مگر دریا کی ہستی کو نہیں مٹا سکتے۔ اس لئے جب جنسی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو راستہ اُس بہاؤ کو اپنے سامنے کھلا ہوا دستیاب ہوتا ہے۔ وُہ اس پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ــــ جس سماج میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ وہاں کسی لڑکے کی لڑکی سے محبت ہونا لازمی امر ہے۔ جہاں لڑکے لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہاں لڑکے لڑکوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اور لڑکیاں لڑکیوں پر۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ سکول سے فارغ ہونے کے بعد جب اپنی مخالف جنس سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہی جذبہ اپنا صحیح راستہ اختیار کر لیتا ہے جنسی کشش وُہ سرزمین ہے جس سے عشق و محبت کا حسین پودا پھُوٹ کر کھِل اُٹھتا ہے ــــ حُسن بھی ایک خاص فعل سرانجام دیتا ہے۔ یعنی مواصلت کے لئے ترغیب۔ مرد عورت کے تعلقات میں اس لئے دو قسم کی کششیں کار فرما ہیں۔ ایک تو جنسی کشش ہے جو جنسی بھُوک کی تسکین چاہتی ہے۔ دُوسری حُسن کی کشش جو شکار اور تعاقب کے جذبات کی تکمیل چاہتی ہے۔ اس لئے مرد عورت کی محبت بُہت شدت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تو عشق کا ظاہری رُخ ہے۔ اب باطنی یا محسوساتی پہلو پر غور کیجئے۔ انسان میں دو اور جذبات بھی اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ یعنی شفقت اور دوستی کی خواہش۔ مثلاً مرد یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی جو اُسے پیار کرے۔ اُس کی خاطر ایثار کرے۔ اس کا دُکھ سُکھ میں ساتھ دے اُس کی زندگی میں صحیح معنوں میں رفیق کار اور رفیقِ حیات بن سکے۔ ان جذبات کو ہم محبت کا نام دیتے ہیں۔ اس لئے مرد عورت کے تعلقات دو اقسام میں بٹ جاتے ہیں عشقیہ اور محبانہ۔ صرف عشقیہ جذبات کو ہم جذباتی محبت یا زکام کہہ سکتے ہیں حقیقی عشق وہی ہے جو دیرپا ہو۔ جو وفا کی رسی سے مضبُوطی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو ــــ جسمانی محبت تو ہر عورت سے ممکن ہے ــــ شہوت

کو تو اور طریقوں سے بھی تسکین دی جاتی ہے۔ مثلاً جلق اور اغلام کی قبیح عادات سے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنے دوست اور اُس کی محبوبہ کی صحبت میں بیٹھا ہوا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کی قربت سے اور اُس کی مربات سے لطف اندوز ہوگا۔ اس کے جسم میں بجلیاں دوڑ جائیں گی۔ مگر دوست کو اس عورت کے لمس سے کوئی سنسناہٹ پیدا نہیں ہوگی۔ کیونکہ شہوت تو جسمانی اتصال کا تقاضا کرتی ہے۔ مگر محبت روحانی یا ذہنی ملاپ کا۔ لبوں کی چاشنی سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جس کو وہ لب محبوب ہوں۔ ورنہ لبوں کا کوئی ذائقہ نہیں حقیقت میں وہ بالکل پھیکے ہیں مگر عاشق کے لئے شہد بلکہ شہد سے بھی زیادہ شیریں۔ یہ ہے فرق شہوت اور عشق میں۔ میں نے ان تمام جذبات کی وضاحت اسلئے کی ہے تاکہ آپ شہوانی جذبات، عشق اور حقیقی محبت میں امتیاز کر سکیں۔ صحیح طور پر جان سکیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ کھوٹے اور کھرے میں تمیز کر سکیں۔ کیونکہ ہر کوئی عاشقی کا دعویٰ کرتا ہے۔ شہوانی جذبات کی بیداری اور اشتعال کو محبت تصور کرتے ہیں۔ پھر بعد میں پچھتاتے ہیں عشق و محبت کے موضوع پر مجھے ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر سب سے پہلے حسن اور عشق پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ حسن و عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حسن میں وہ جادو ہے جو عشق کے دیوتا کو بیدار کرتا ہے"......

شام لال: "مائیکل صاحب! مجھے کوئی تدبیر بتاؤ۔ میری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔"

انصر: "گھبراؤ نہیں۔ یہ سب تمہارا ہی علاج ہو رہا ہے۔ قابل ستائش ہے وہ خالق جس نے دنیا حسین اشیاء سے مزین کی اور انسان کو شرف بخشا کہ وہ ان سے لطف اندوز ہو سکے۔"

مائیکل: "لفظ حسن بھی کئی معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہر حسین شے باعثِ مسرت ہے۔ کوئی بھی انسان جو کور ذوق نہیں۔ ایسے دلآویز مناظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً قوس قزح۔ ساون کے بادل۔ پھول۔ سرسبز وادیاں۔ برفانی چوٹیاں۔ دریا کا تلاطم۔ منجمد آبشاریں۔ یہی نہیں ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھو تو تمہیں ہر چیز میں حسن موجیں مارتا ہوا نظر آئے گا ــــ مثلاً سفید مرمریں پلیٹیں اور پیالے۔ کیمل کا مردانہ بوسہ۔ ایک بھاری انجن کے دل کی دھک دھک مرجھائے ہوئے پھول اور پتے ــــ فولاد کی سختی۔ چادروں کا پُر لطف لمس۔ چھیلے ہوئے آلو۔ ایک نرس کی شفقت بھری انگلیوں کا لمس۔ کہاں تک بیان کروں حسن میں ہزاروں نیرنگیاں ہیں۔ ڈوبتے سورج اور چڑھتے ہوئے

سورج کا شعلہ گوں چہرہ۔ بارش سے نہائے ہوئے پھول اور گھاس کی پتیاں۔ جہاز کے عرشہ پر کھڑے ہوئے اجنبی ساحل کا اوّلین منظر سبھی حسن کی دولت سے مالامال ہیں مگر ایک عورت کے حسین جسم کے سامنے سب ماند ہیں۔ بیشک اگر جادو دنیا میں کوئی حقیقت ہے تو وہ عورت کی آنکھیں ہیں۔ اس کے ہونٹ اور اس کے بال ہیں۔ اس کی آواز ہے۔ عورت سرتا پا حسن ہے۔ جمالیات سے متاثر نہ ہونے والے انسان کیلئے عجائب گھر میں موزوں جگہ ہو سکتی ہے۔"

شام لال "حسن کا عشق کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے ــــــ اور خدا کے لئے میرے لئے نسخہ بھی تجویز کیجئے۔"

مائیکل "حسن سے آنکھوں کو راحت اور روح کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ حسن میں ایک کشش ہے۔ ایک سحر ہے جو دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دل اس حسین چیز کا قرب چاہنے لگتا ہے۔ تعاقب اور شکار کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ تسکین قلب حسن کے حصول پر منحصر ہے۔ جس قدر شدت سے یہ جذبہ ابھرتا ہے۔ اسی قدر عشق بھی شدت اختیار کرتا ہے۔ اس لئے عشق کی لذت اور مدت خواہش حصول یا آرزوئے اتصال کی شدت پر موقوف ہے اور جب تک حسن عشق کی گرفت میں نہیں آتا عشق بیقرار رہتا ہے۔ بس یہی حقیقت عورت اور مرد کے تعلقات پر بھی عائد ہوتی ہے جب حسن کی کشش یا جنسی کشش مرد یا عورت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تو جذبہ عشق بیدار ہو جاتا ہے خواہش وصل اس کا لازمی نتیجہ ہے اور اس لئے عاشق محبوب کے حصول کی ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتا ہے۔ ایک بات قابل غور یہ ہے کہ عاشق کی ہر ممکن قربانی بھی خود غرضی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنے محبوب کی رضا میں خود اس کا نفس ایک مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس لئے عشق یا جنسی محبت بے غرض نہیں کہی جا سکتی۔ عشق اور حسن لازم و ملزوم ہیں۔ قدرت نے حسن میں جو بے پناہ کشش رکھی ہے۔ اس کا بھی ایک مقصد ہے۔ یعنی مخالف جنسوں کا وصال پودوں اور درختوں کے پھول بھی یہی فعل سرانجام دیتے ہیں ــــ

نباتیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ پھول بھی نر اور مادہ قسم کے آلات جنسی رکھتے ہیں۔ چند پرند اور کیڑے مکوڑے کبھی اس پھول پر بیٹھتے ہیں۔ کبھی اس پر۔ اور اس طرح پھولوں کے باہمی اتصال

کا موجب بنتے ہیں۔ جب مادہ پھول حاملہ ہو جاتی ہے تو پھول مرجھا کر پھل یا بیج میں بتدریج متبدل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حیوان اور تمام جانور جنسی کشش کے باعث مواصلت کرتے ہیں اور وصل سے قبل ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ تعاقب کرتے ہیں اور شکار کر کے اپنے بس میں لاتے ہیں۔ وحشی انسان اسی لئے جذبہ عشق کی فطری طور پر تکمیل کرتا ہے یعنی اپنے محبوب کو زبردستی شکار کر کے لے جاتا ہے اور پھر اُس کی دلداری اور ناز برداری کرتا ہے۔"

شام لال :- "تو کیا مور اور کبوتر اپنی اپنی مادہ کے آگے پَر پھیلا کر اور اکڑ اکڑ کر اسی لئے مٹر گشت کرتے ہیں؟"

مائیکل :- "بس یہی وجہ ہے کہ آج آپ بھی سر سے پیر تک نفاست کا مجموعہ نظر آ رہے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ عشق کا جذبہ کس قدر زبردست ہے۔ اسی قوت کے پسِ پردہ دو قسم کی کشش کارفرما ہیں۔ ایک حُسن کی، دوسری جنس کی اس لئے عام انسان اس جذبہ پر مشکل سے قابو پا سکتا ہے۔"

انصر :- "مگر حُسن کا معیار کیا ہے؟ یہ کیسے معلوم ہو کہ حسین چیز کونسی ہے؟ مثال کے طور پر شام صاحب کی وینا کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ مجھے تو کوئی خاص جاذبیت یا حسن اسمیں نظر نہیں آیا۔ حالانکہ سُننے میں آیا ہے کہ اس کے چاہنے والے ایک درجن سے کم نہیں۔"

مائیکل :- "معیاری حُسن کے متعلق ہم عام لوگوں کی رائے سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً بڑی بڑی آنکھیں۔ گول چہرہ۔ نکھرا ہوا رنگ۔ کالے بال۔ گداز جسم۔ یہی ہندوستان کا معیاری حُسن ہے۔ گلابی رنگ۔ سنہری بال، بلوریں آنکھیں، متناسب جسم۔ ستواں ناک وغیرہ مغربی حُسن کا معیار ہے۔ اسی طرح حبشیوں اور چینیوں کا اپنا اپنا معیار ہے۔ جسے دوسری قومیں قبول نہیں کر سکتیں۔ مثلاً بے حد موٹے ہونٹ، سیاہ چمکدار رنگ حبشیوں کو پسند ہے۔ اگر کوئی بچہ سانولے رنگ کا ہو تو اُسے تیل مل کر دھوپ میں لٹا دیتے ہیں۔ تاکہ وہ بھی سیاہ اور چمکدار ہو جائے۔"

شام لال :- "چینی تو اُس کو حسین تصوّر کرتے ہیں۔ جس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں ہوں اور آنکھوں کی جگہ دو لکیریں ہوں۔ سینہ سپاٹ ہو اور جسم پر کہیں بال نہ ہوں۔"

مائیکل :۔ یہ تو ہوا معیاری حُسن۔ انفرادی مذاق کے مطابق ہر فرد کا اپنا اپنا معیار ہے۔ مثال کے طور پر انفر صاحب نے دنیا کو اپنے معیار کے مطابق رد کر دیا۔ ان کو اس میں کوئی حُسن نظر نہ آیا۔ مگر شام صاحب کے دل سے پوچھئے۔ یا ان کی آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھئے۔ یہی دنیا ماہ جبین ہوگی۔ اسی لئے عشق کا جذبہ ایک بالکل انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں اس کا رومان یا عشق ایک علیحدہ نوعیت رکھتا ہے۔ حالانکہ ہر عشقیہ افسانے کا یہی پلاٹ ہے کہ کسی کے حُسن کا کوئی گرویدہ ہوگیا۔ یا کسی سے محبت ہوگئی۔ فراق و وصل کی منزلیں طے کرنے کے بعد کوئی کامراں لوٹا۔ کوئی سماج کی مداخلت کا شکار ہوگیا۔ شادی کی اجازت نہ ملی۔ کوئی سسکتا ہے۔ کسی نے زندگی کو ختم کر لیا۔ افسانے کے جذبات یہی ہوں گے۔ الفاظ البتہ ضرور مختلف ہوں گے ـــــ اور واقعات میں بھی نیرنگی ہوگی مگر جذبات وُہی ہوں گے۔ اس لئے ہر عاشق کے لئے۔ اس کا ذاتی تجربہ ایک الگ اہمیت رکھتا ہے۔ جس شخص نے کبھی عشق نہ کیا ہو ـــــ وُہ اُس کی حقیقی لطافتوں مسرّتوں اور اندوہناکیوں سے واقف نہیں ہو سکتا ہر انسان ایک علیحدہ شخصیت کا مالک ہے۔ اس لئے ہر زمانے کا انسان یہی قصّہ دُہراتا آ رہا ہے۔ افسانہ فرسودہ ہی سہی مگر اس کی چاشنی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شام صاحب، مَیں بھی عشق و محبت کے دَور سے گذر چکا ہُوں۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کا مُنہ دیکھ چکا ہُوں۔ اس لئے مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ کی دنیا آپ کے معیار پر پوری اُتری کشش پیدا ہُوئی۔ عشق نے محبوب کے گرد ہالہ سا بنا دیا جس سے آپ کی نظروں میں اور کوئی چیز نہیں۔ اگر ایک لڑکی کا محبوب دراز قامت ہے تو وُہ یوں کہتی ہے۔ کہ دراز قد مرد اسے بہت پسند ہیں۔ پست قامت مرد سے کیا عشق ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا محبوب شام صاحب کی طرح ہے تو وُہ یہی کہتی ہے۔ کہ دراز قد مرد بھی کوئی عشق کے قابل ہے۔ وُہ تو مجھے اونٹ دکھائی دیتا ہے۔ ایسے مرد کے ساتھ چلنا ایک مصیبت ہے۔ بات کرنی ہو تو گردن اُوپر کھینچو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عشق ہے تو محبوب کی خامیاں بھی خوبیاں ہیں۔ اگر عشق نہیں ہے تو خوبیاں بھی کوئی معنی نہیں رکھتیں۔"

"مگر مائیکل صاحب! آپ کی رائے میں کیا عورت ہی حسین ہے۔ عورت کیا ہے۔ ایک چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والی بھدّی سی مخلوق ـــــ بچے پیدا ہُوئے اور بس حُسن و جمال رُخصت۔ کیا مرد کا حُسن، عورت سے زیادہ پائدار نہیں ہے؟ اُس کی طویل قامت، فراخ سینہ، ورزشی جسم۔ ایک بے پناہ

حسن رکھتا ہے"۔ میں نے کہا۔

مائیکل:" بلا شبہ مرد بھی حسین ہے اور اپنی نظیر آپ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عورت رعنائی نزاکت اور لطافت کا مجسمہ ہے۔ مرد توانائی اور قوت کا آئینہ دار ہے۔ مرد کا طاقتور جسم اس بات کا متمنی ہے کہ عورت کے حسین اور گداز بازو اسے اپنی آغوش میں لے لیں اور عورت کا نرم و نازک جسم یہ اقتضا کرتا ہے کہ مرد کے طاقتور بازو اس کی حفاظت کریں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے بغیر تشنہ ہیں۔ اس کے متعلق قدیم یونانیوں کا نظریہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان کے خیال میں ابتدائی انسان بالکل گول تھا۔ اس کے چار بازو اور چار ٹانگیں تھیں۔ سر ایک تھا مگر چہرے دو تھے۔ وہ بڑی تیزی سے چاروں ہاتھ پاؤں کو حرکت میں لے آتا تھا۔ اس کی قوت بے پناہ تھی۔ وہ دیوتاؤں پر بھی حملہ کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ دیوتاؤں نے سوچا کہ اس مخلوق پر برق گرا کر اسے ہلاک کر دیا جائے مگر ساتھ ہی نذر و نیاز اور پرستش کا خاتمہ بھی گوارا نہیں تھا۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد سورج دیوتا کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے یہ مشورہ کیا کہ انسان کو دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے۔ اس طرح اس کا غرور اور قوت آدھی رہ جائیگی۔ تحائف اور قربانیوں کی تعداد دوگنی ہو جائیگی۔ وہ دو ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلے گا۔ اگر پھر بھی وہ باز نہ آیا تو پھر میں اسے مزید دو حصوں میں کاٹ دوں گا اور پھر وہ ایک ٹانگ پر اچھلتا پھرے گا۔ یہ کہہ کر اس نے ابتدائی انسان کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اور اس دن سے لیکر آج تک دونوں نصف حصے باہمی اتصال کیلئے بیقرار رہتے ہیں اور جب کبھی ایک نصف اپنے دوسرے حقیقی نصف سے آملتا ہے تو دونوں باہمی اتصال کی لذت و مسرت میں کھو جاتے ہیں ان کی ذات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ خیال بڑا اچھوتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ مرد ہو یا عورت جب تک اسے سچا رفیق حیات نہیں ملتا۔ زندگی تشنہ تکمیل رہتی ہے"۔

انصر:" تو گویا شام کو ان کا نصف حصہ باعث کشش معلوم ہوتا ہے"۔

مائیکل:" یہی امر لائق تحقیق ہے عشق و محبت کے سارے ڈرامے کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عشق و محبت کے جذبات کی بیداری۔ دوسرا محبوب کو اپنانا۔ تیسرا وصال محبوب عشق و محبت کے جذبات ہر انسان کے خمیر میں داخل ہیں کسی میں یہ جذبات بیدا

ہونے نہیں پاتے۔ یا کبھی کبھی صرف ان جذبات کی آنکھ کھل جاتی ہے مگر جلد ہی پھر سو جاتے ہیں جب کبھی پُوری طرح پیدا ہوتے ہیں تو یہ آگ کی ننھی چنگاری شعلہ بن جاتی ہے کبھی یہ آگ آہستہ آہستہ سُلگتی ہے اور کبھی ایک دم بھڑک اُٹھتی ہے۔ پہلی قسم کو ہم تدریجی عشق یا محبت کہتے ہیں اور دوسری قسم کو پہلی نظر کا عشق یا جذباتی عشق کہتے ہیں۔ پہلی ہی نظر میں عشق کے جذبہ کا بیدار ہونا ایک حقیقت ہے۔ کوئی مفروضہ نہیں۔ جو لوگ انکار کرتے ہیں۔ وُہ فطرتِ آدم سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس فوری عشق کی نفسیات پر غور کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ہر مرد عورت کے لاشعور میں اپنے پسندیدہ محبوب کی خیالی تصویر ہوتی ہے۔ یہ تصویر اس کے اپنے ہی تخیلات یا آدرش کا عکس ہوتی ہے۔ زندگی میں آدرش کا حصول بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدرش سے ملتی جلتی حسین و جمیل صفات کے مالک سے سامنا ہو جاتا ہے یا کوئی آدرش کے لگ بھگ پہنچتا ہے۔ اکثر اوقات دو اجنبی مرد عورت ایک دُوسرے سے مُلاقات کرتے ہیں اور پہلی نگاہ ہی تاڑ لیتی ہے کہ آدرش سامنے ہے۔ ہر نوجوان مرد عورت اپنے دل میں یہ الفاظ مختلف صُورتوں میں دُہراتا ہے کہ دُنیا میں کہیں نہ کہیں ایسی ہستی ضرور ہے جو میرے آدرش پر پُوری اُترتی ہے جسے میں جان و دل سے پیار کر سکتا ہوں۔ ایک خردمند انسان ایسی ہستی سے دوچار ہوتے ہی۔ اپنے آدرش کے حصول کے لیئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ لیکن جوانی میں عشق کا جذبہ بڑی کچی نیند سوتا ہے۔ ذرا سی آہٹ پر بیدار ہو جاتا ہے۔ ہر حُسنِ راہگیر پر قُربان ہونا چاہتا ہے۔ اپنے آدرش کے حصول کا بھی انتظام دُوبھر معلوم ہوتا ہے۔ ذہن کچھ دن متاثر رہتا ہے۔ پھر عکس دُھندلا پڑ جاتا ہے۔ یعنی عشق پھر سو جاتا ہے۔ ہر انسان کی طبیعت مختلف واقع ہُوئی ہے۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو ایک دفعہ کسی پر فریفتہ ہو کر اپنے ذہن سے محبوب کا عکس مشکل سے مٹا سکتے ہیں۔ چنگاری ایک دم ایسی سُلگتی ہے کہ تن من کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک دُنیا میں ایک ہی عورت سے عشق ممکن ہے۔ وصال نصیب ہو نہ ہو۔ وُہ دُوسری عورت سے محبت گناہ سمجھتے ہیں۔ لیلےٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کے عشق کی یہی حقیقت ہے۔"

الفسر: "شام صاحب کا عشق کس قسم کا ہے؟"

مائیکل :- یہ امر تو واضح ہوگیا ہوگا کہ عشق و محبت کے جذبات کی دو صورتیں ہیں۔ ایک فوری اور دوسری تدریجی یا جذباتی یا محسوساتی عشق۔ منبع دونوں کا جنسی کشش ہے۔ فرق صرف شدت اور مدت کا ہے۔ اکثر انسان اپنے آدرش سے ملاقات کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک آدھی روٹی نہ ہونے سے بہتر ہے۔ بعض اس اصول پر کاربند رہتے ہیں کہ ملے تو ساری ورنہ کچھ نہیں۔ ایسے صابر انسانوں کے لئے آدرش کا حصول کوئی غیر ممکن چیز نہیں۔ وہ اپنے نصف کے اتصال کا انتظار کرتے ہیں اور جب اتفاق سے اُن کی کہیں ملاقات ہو جاتی ہے۔ تو وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے لوہا اور مقناطیس۔ عشق ہر حالت میں عشق ہے۔ کسی شاہراہ پر ایک خانہ بدوش اور اسکی محبوبہ کی آنکھیں جب ایک شہزادہ سے اور اُس کی محبوبہ سے دوچار ہوتی ہیں تو ایک ہی قسم کی مسکراہٹ ان چاروں آنکھوں میں چمک اُٹھتی ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ وہ اکیلا زندگی بسر کرنا نہیں پسند کرتا اکثر افراد کی زندگی میں عشق کے جذبہ کی بیداری اُن کو مسرت سے ہمکنار کرتی ہے یا مایوسیوں کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیتی ہے۔ ایسے بدنصیب انسان کے ذہن کے پردہ پر ایک ایسے چہرے کا پرتو رہتا ہے۔ جو اسے تمام دُنیا کے چہروں سے عزیز ترین ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی ذہنی تصویر حقیقت میں مبدل ہو جائے۔ جوانی کے دن بیت جانے پر بھی جوانی کی جھلک جلوہ گر رہتی ہے۔ جب ایک تبسم ریز آواز یہ کہتی ہوئی سُنائی دیتی ہے کہ میرے محبوب مجھے اب بھی تم سے محبت ہے۔"

شام لال :- میرا بھی شمار اُنہیں بدنصیب لوگوں میں ہوتا ہے جن کی قسمت میں محبوب سے ہمکنار ہونا نہیں لکھا گیا۔ وہ کم سے کم مجھ سے بات ہی کر لیا کرے۔"

میں نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا ؎

ہزار مجمع خوباں ماہ رُو ہو گا
نگاہ جس پہ ٹھہر جائیگی وہ تُو ہو گا

انصر :- جذباتی عشق میرے بس کا روگ نہیں۔ ہندوستانی سماج میں عشق و محبت گناہ ہے تدریجی عشق کی ذرا وضاحت فرمائیے۔"

مائیکل :- تدریجی عشق اس قدر جذباتی نہیں ہوتا۔ دو انسان سرسری طور پر ملتے ہیں۔ ایک

دوسرے کی جسمانی۔ ذہنی اور اخلاقی صفات کو پسند کرتے ہیں۔ یہ پسند رفتہ رفتہ عشق میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اُلفت اور دوستی اس درجہ ترقی کر جاتی ہے کہ ایک دُوسرے کے بغیر وُہ ملول رہتے ہیں انہیں احساس ہونے لگتا ہے کہ وُہ ایک دُوسرے کے بغیر زندگی خوشگوار طور پر بسر نہیں کر سکتے۔ یہ محبت مرد عورت اور ہمجنسوں میں دوستی کا سنگِ بنیاد رکھتی ہے۔ ایسی محبت عشق کی طرح اندھی اور جذباتی نہیں ہوتی عشق کے جذبہ میں ظاہری حُسن یا جنسی کشش کام کرتی ہیں۔ اس لئے خواہش وصال بہت شدت اختیار کر لیتی ہے اور عام طور پر وصال سے یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ قُدرت کا اُصول ہے کہ جو محبت دیر میں حاصل ہو وُہ کم ہی بتدریج ہوتی ہے جو عشق ایک دم شدت اختیار کر لے۔ وُہ عارضی طوفانِ جذبات ہوتا ہے اور بخود بخود فرو ہو جاتا ہے عشق میں شعور کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ لیکن محبت شعور کے سہارے پروان چڑھتی ہے۔ محبت انجام پر غور کرتی ہے عشق اندھا ہوتا ہے۔ وُہ فوری تسکینِ جذبات کا خواہشمند ہوتا ہے۔ عقل کی رہنمائی سے عشق کو نفرت ہے۔ محبت کی بُنیاد اس کے برعکس شفقت اور دوستی کے جذبات پر قائم کی جاتی ہے۔ عشق اسی وقت تک استوار ہے۔ جب تک وصل کا حصول نہ ہو"۔

شام لال:۔ میری محبت نہ ہوئی عشق ہوا۔ مگر اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟"

مائیکل:۔ اس سے قطع نظر کہ عشق جذبہ شکار یا جنسی کشش کی پیداوار ہے یا تدریجی محبت کا نتیجہ ہے۔ خواہش سر صورتوں میں ایک ہی پیدا ہوتی ہے یعنی وصال محبوب کی تمنّا۔ عاشق کی تمام بیقراری بے خوابی بےچینی اور آہ و زاری کی بُنیاد یہی خواہش ہے۔ عاشق کیا چاہتا ہے؟ وُہ محبوب کا قرب چاہتا ہے۔ اس سے ملاقات اور گفتگو کرنے کا خواہاں رہتا ہے۔ اُس کی نظروں سے اوجھل ہونا نہیں چاہتا۔ اُس کے جسم پر تسلط چاہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور خواہش بھی کروٹ لیتی رہتی ہے۔ یعنی اُس کا محبوب بھی اُس کے لئے بیقرار ہو۔ جسمانی تسلط تو زبردستی بھی قائم کیا جا سکتا ہے مگر یہ وحشیانہ فعل ہوگا۔ انسان تسکینِ قلب تو اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے۔ جب محبوب خود اپنی رضا سے عاشق کو اپنا آپ سونپ دے۔ محبت کا جواب پیار سے دے۔ عاشق کے جذبات کا احترام کرے یعنی محبوب بھی خود محب میں مبدل ہو جائے۔ یہ عاشق کی حقیقی فتح ہوگی۔ شکار خود شکاری کے جال میں آ جائے۔ کسی بے جان چیز پر بھی تسلط قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مالک

کی رضا حاصل کی جائے۔ خواہ دام دے کر یا کسی اور طرح مگر چوری یا زبردستی قابو میں لانا ناجائز ہے۔ صرف زبردستی عشق و محبت کے معاملے میں کام نہیں آتی۔ محبوب کی رضا حاصل کرنے میں ایک زینہ کا کام ضرور دے سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک وحشی اپنی محبوبہ کو زبردستی اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ ایک چالاک شخص اپنی مکاری سے محبوبہ کو اغوا کرتا ہے۔ یا سماج ایک مرد عورت کو جو ایک دوسرے سے قطعاً ناواقف ہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتا ہے۔ یا ایک آزاد سماج کے افراد محبت کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں ان تمام صورتوں میں وصل کے دو ہی مُمکن طریقے ہیں۔ رضامندی سے یا مجبوری سے۔ زبردستی یا مجبور کرنا انسانیت سے گرا ہوا فعل ہے۔ وحشی انسان بھی اپنی محبوبہ کو اپنے بس میں لا کر وصال سے قبل اس کی رضا حاصل کرتا ہے۔ محبت اور ایثار سے اس کے دل پر فتح پاتا ہے۔ اس لئے ایسی شادی جس میں طرفین کو مجبور کر کے یکجا کر دیا گیا ہو حیوانیت سے بدتر فعل ہے۔ کیونکہ وحشی انسان یا حیوان بھی اپنے قوتِ بازو سے محبوبہ کو حاصل کرتا ہے۔ اس کی محبوبہ اس کی اس جرأت کو پسند کرتی ہے۔ مگر اپنے جیسے ذلیل انسانوں کی اعانت سے اپنے محبوب کو شادی کے ذریعے بس میں لانا انسانیت کی توہین ہے۔ شادی سے قبل مرد عورت کا قطعاً ایک دوسرے سے ناواقف ہونے کی صورت میں رسم شادی کو ایک تعارف کی صورت تصور کر سکتے ہیں۔ اس تعارف یا پہلی ملاقات کا نتیجہ عشق بھی ممکن ہے اور تدریجی عشق بھی مگر وثوق سے کہنا محال ہے۔ کیونکہ ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وُہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

اس لئے یہ شادی شُدہ جوڑا یہی کر سکتا ہے کہ وُہ ایک دوسرے کو اپنانے کی کوشش کرے اور مل کر کشتیٔ حیات کو کنارے لگائے یا غرق کر دے۔ دوسری طرف عاشق کے لئے بھی دو ہی راستے کھُلے ہیں یعنی محبوب بھی محبت کا جواب دے یا انکار کر دے۔ اس لئے عشق و محبت کی دو صورتیں ہیں۔ یک طرفہ محبت اور دو طرفہ محبت۔ اس مقام پر آ کر دو راستے ہو جاتے ہیں۔ ایک راستہ لق و دق صحرا کو جاتا ہے اور دُوسرا سر سبز وادی میں۔ یک طرفہ عشق ناکام محبت کہلاتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ بعض لوگ قدرتی طور پر ثمر ملیے واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ وُہ انتہائی شدّت سے کسی کو

چاہتے ہیں۔ مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس طرح اپنے محبوب کو دل میں بٹھا کر اس کی پرستش کرتے رہتے ہیں عمر یونہی بیت جاتی ہے۔ ایسی محبت کو خاموش محبت کہتے ہیں۔ سچی اور گہری محبت اکثر اوقات خاموش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ الفاظ ہی محبت کا ثبوت نہیں ہیں۔ بیشک محبت بھرے الفاظ سُننے کی خواہش ہر دل میں موجزن ہوتی ہے۔ محبوب کی زبان سے ادا کیا ہوا ایک لفظ بھی جام کوثر سے کم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی پیام محبت کو محبوب تک پہنچانا ایک لازمی امر ہے۔ یہ عشق کا دوسرا زینہ ہے۔"

شام لال :- بھئی میرے مطلب کی بات اب کہی۔ پیام پہنچانے کی صورت مجھے جلدی بتا دیجئے

مائیکل :- محبوب تک پیام دو ہی طریقوں سے رسائی پا سکتا ہے۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ۔ یعنی اپنی زبانی یا پیامبر کی وساطت سے۔ خط بھی پیامبری کا فرض سرانجام دیتا ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ عشق و محبت سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔ عشق اپنا راستہ خود ہی تجویز کرتا ہے۔ جذبات موجود ہوں تو الفاظ خود بخود لبوں سے دھارے کی طرح بہنے لگتے ہیں۔ ایک شہزادہ ہو یا کنگال۔ اظہار محبت کا لمحہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ اس وقت طویل گفتگو کی تاب کہاں ہوتی ہے۔ یہ صرف افسانوں اور کہانیوں کی باتیں ہیں کہ ایک ان پڑھ شخص بھی محبت کے موضوع پر تقریر کرنی شروع کر دیتا ہے حقیقت یہی ہے کہ جذبات کی فراوانی الفاظ کو بھلا دیتی ہے اور عاشق بمشکل یہ الفاظ ادا کر سکتا ہے کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ ہیں وہ لافانی الفاظ جو رہتی دُنیا تک ادا ہوتے رہیں گے۔ کس قدر خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا محبوب یہ جواب دیتا ہے کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے اور اس اقرار نامے پر ہونٹوں کے بوسے کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ یہ ہے عشق کی کامرانی۔ میں اس کو کامیاب عشق تصور کرتا ہوں۔ وصال اور شادی تیسرا اور آخری زینہ ہے۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ کہ یہ کامرانی دوسرے زینہ پر قدم رکھنے کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی جس کو آپ چاہتے ہیں اس سے اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور وصل کے حق دار بن بیٹھیں۔ میرے خیال میں تو اپنی بیوی سے بھی اس کی مرضی کے خلاف واصل ہونا زنا بالجبر سے کم نہیں۔"

"مائیکل بھئی! مجھے اجازت دیجئے۔ دوسرے زینہ پر قدم رکھنے میں میری اعانت کیجئے۔" شام

بیتابی سے بولا۔

انصر:۔ مائیکل بھیا! مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ آپ کی مس آبنوس سے تھوڑی بہت راہ و رسم ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ اور روبینا دونوں ایک ہی کمرے میں رہتی ہیں۔ اس لئے اس کے نام ایک رقعہ لکھ دو کہ ہمارے مریضِ عشق کا روبینا سے تعارف کروا دے۔ آگے شام جانے اور اُس کا عشق!

رُقعہ لکھا گیا اور شام کوئے یار کی جانب بھاگا۔ اس کے جانے کے بعد انصر یوں گویا ہوا۔

انصر:۔ شام صاحب پر جو گذرے گی۔ اس کا قصّہ توکل پر چھوڑیئے۔ اب یہ بتلایئے کہ ایسا شخص جو شرمیلا ہو۔ جو اپنے محبوب کی پرستش کرتا ہو مگر اظہارِ عشق کی جرأت نہ رکھتا ہو۔ وہ کیا کرے؟"

مائیکل:۔ ایسے شخص کی نفسیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی زبان سے وہ انکار سُننا نہیں چاہتا جس کی اس کو توقع ہو سکتی ہے۔ قومیت، مذہب اور دولت کی بلند دیواریں اکثر اوقات راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ وصلِ محبوب کے تمام راستے مسدود ہوتے ہیں۔ ان حالات میں عاشق اپنے عشق کی تذلیل گوارا نہیں کرنا چاہتا۔ اگر محبوب اظہار ہمدردی ہی کر دے تو عاشق کے زخموں کے لئے بہترین مرہم کا کام دے سکتا ہے۔ مگر محبت ٹھکرا دی گئی تو عاشق کے دل کو وہ ٹھیس لگے گی جس کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عشق کی رسوائی پر ضبط کو ترجیح دی جاتی ہے۔ عشق کسی کے بس کا روگ نہیں۔ دل ہی تو تھا۔ اگر کسی پر آگیا تو آگیا۔ مگر عشق کی تذلیل خودی کی ہتک ہے اور یہ اپنے اختیار میں ہے۔ ایسا عشق کبھی فراموش نہیں ہوتا۔ یہ ناکامی ہمیشہ پس منظر میں رہتی ہے۔ چاہے وُہی شخص کسی بعد کے معاشقے میں کامیاب بھی ہو جائے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ وقت اور فاصلہ عشق کے نقش کو دُھندلا کر دیتا ہے مگر سراسر مٹا نہیں سکتا!"

انصر:۔ ایسے عاشق کے لئے آپ کیا مشورہ دیں گے؟

مائیکل:۔ میری نصیحت تو یہی ہے کہ عاشق محبوب کو بھُولنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اُس کو یہ اُمید ہے کہ کسی دن وہ محبوب تک پہنچ سکے گا۔ تو اس اُمید کو قائم رکھے اور اس آدرش کے حصُول کے لئے جدوجہد کرے۔ اپنی زندگی کو کامیاب بنائے۔ تاکہ وہ محبوب کی نظروں میں اہمیت حاصل کر سکے۔ اس جدوجہد کے درمیان اگر اتفاق سے کوئی عورت اس کو محبت کی پیشکش کرے تو اُسے

قبول کرلے۔ اپنے عشق کی تشنگی اس کی محبت سے بجھائے۔ یہ محبت بہترین مرہم کا کام دے گی۔ اگر ایسا کرنا بھی ممکن نہ ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ مفروضہ ذہن سے نکال دینا چاہیئے کہ وُہ اور کسی عورت سے عشق نہیں کر سکتا۔ یہ قدرتی امر ہے کہ عشق کی تشنگی بدستور قائم رہے گی۔ وُہ کامرانی کے بغیر تسکین نہیں پا سکتی۔ اس لئے عشق دوبارہ۔ سہ بارہ بھی شدت سے عود کرتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وُہ پہلی سی شدت اختیار کرے۔ اس شدت کا انحصار تشنگی پر ہے اور تشنگی کا انحصار کشش پر ہے۔ اگر آپ کو آورش سے بھی زیادہ حسین کوئی محبوب مل جائے تو لازمی طور پر محبت کی شدت میں اضافہ ہوگا۔ اگر آدرش سے اس کا حُسن کمتر ہے تو تشنگی قائم رہے گی۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ عشق کا انحصار حُسن اور جنسی کشش پر ہے۔ یہ دونوں قسم کی کشش اپنا کام جاری رکھتی ہے۔ کوئی اپنے آپ کو اس کشش کے سُپرد کر دیتا ہے۔ کوئی اس کشش سے مُنہ موڑ لیتا ہے۔ وصال سے تشنگی بُجھتی ہے۔ اس لئے عشق کی شدت میں کمی آجانا قدرتی فعل ہے۔ ایثار، قربانی، خدمت اور محبت سے عشق کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ وقت محبت کے بندھن کو مستحکم کرتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے مرد عورت جُوں جُوں بُوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ جذباتی عشق کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر محسوساتی عشق بڑھتا جاتا ہے۔ موت بھی اس رشتہ کو توڑ نہیں سکتی۔"

القصر:۔ ان ناکام عاشقوں کو تو اپنے حال پر چھوڑیئے۔ اب یہ بتایئے کہ جس کا محبوب بھی محبت کا اقرار کرے۔ اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟"

مائیکل:۔ وصل کی خواہش عشق کی روح رواں ہے۔ عشق کی مدت کیا ہے۔ یہ امر عشق کی شدت پر موقوف ہے۔ اکثر عشقیہ جذبات وصل تک محدود ہوتے ہیں۔ وصل کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک شادی کے بغیر اور دُوسری محبوب سے شادی کرنے کے بعد۔ حقیقی عشق و محبت کا جائز اور لازمی نتیجہ شادی ہے۔ میں نے پہلے مثال دی تھی کہ عشق کا ایک راستہ صحرا کو جاتا ہے اور دُوسرا سرسبز وادی میں۔ اس سرسبز وادی میں ایک ہی پہاڑی ہے۔ جہاں مسرت کے سامان مہیا ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اکیلے عاشق کے لئے یہ مقام ممنوع ہے۔ محبوب ساتھ ہو تو مسرت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ورنہ سماج یا حالاتِ زمانہ عاشق اور محبُوب کو الگ الگ رکھتے ہیں۔ وُہ عشق میں کامراں ہو کر بھی اس سرسبز وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں مگر ایک دُوسرے سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی یا کسی ایک کی شادی

کسی دُوسری جگہ ہو جاتی ہے۔ وصل کی راہ مسدود ہو جاتی ہے مگر عشق اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اس لئے حقیقی عشق کی صفت یہی ہے کہ وُہ وفا شعار رہو۔ عاشق و محبوب خواہ شادی کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ یا ویسے باہم رہیں یا ملتے رہیں یا بالکل جُدا ہو جائیں۔ وفا کا تقاضا یہی ہے کہ ایک دوسرے کے سوا کسی اور سے عشق نہ کریں۔"

دُوسرے دن ریسٹوران میں شام صاحب کا بیتابی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام صاحب کیا آئے۔ ایک حزن و ملال کا قافلہ ساتھ لے آئے۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیص کا کالر باہر لٹک رہا تھا۔ نہ ٹائی تھی۔ نہ شیو بنائی ہوئی تھی۔ سوٹ گول ہو رہا تھا۔ یاروں نے حال دریافت کیا تو یُوں گویا ہُوا۔

شام لال "۔ کیا سناؤں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ مس آبنوس نے ہمارا تعارف کروا دیا۔ اس کے بعد ہم بیٹھے چائے پیتے رہے۔ مس آبنوس بہانہ کر کے باہر تشریف لے گئیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور سب حال کہہ سُنایا۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے سُنا اور جواب دیا۔ میں آپ کی عزت افزائی کی ممنون ہُوں مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمت نہیں کر سکتی۔ جب سے میں ملٹری میں بھرتی ہُوئی ہوں میرے چاہنے والوں نے ایک ایک کر کے مجھُ سے اظہارِ عشق کیا۔ اپنی محبت کا یقین دلایا اور میں ان کی باتوں میں آ گئی۔ مگر مطلب نکل جانے کے بعد کسی نے میری بات تک نہ پُوچھی۔ ہر دفعہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتی ہُوں مگر پھر بھی فریب میں آ جاتی ہوں۔ مجھ میں یہ بڑی کمزوری ہے۔ میں بہت سیدھی سادھی واقع ہُوئی ہُوں۔ اب آپ ہی بتائیے۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ کیا آپ مجھُ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ کیا آپ مجھُ سے شادی کرنے پر آمادہ ہیں۔"

"مگر میں تو شادی شدہ ہُوں اور میرے بال بچے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔" وینا نے کہا۔

میں نے ہچکچا کر جواب دیا کہ میں بہت ہی بدنصیب واقع ہُوا ہوں۔ میں محبت کا طلبگار ہوں آپ کی نگاہِ لطف و کرم کا متمنی ہُوں۔ آپ صرف کبھی کبھی مجھے شرفِ ملاقات بخش دیا کریں۔ اگر آپ

نیک راستے پر گامزن رہنا چاہتی ہیں تو میں اس میں آپ کی ہر ممکن اعانت کروں گا۔ میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ محبت کرنا گناہ نہیں ہے۔ مگر میں آپ کو گناہ کی ترغیب نہیں دوں گا۔ اگر آپ بھی دُوسری لڑکیوں کی طرح مسرّت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں تو پھر اتنی درخواست ہے کہ خاکسار کو بھی یاد فرما لیا کیجئے۔ بندہ ہر طرح سے خدمت کے لئے تیار ہے۔"

"تو اُس نے اُس کا کیا جواب دیا" ہم سب بیک آواز گویا ہوئے۔

شام لال:۔ یہی کہ میں آپ کا ضرور خیال رکھوں گی۔ جب آپ کی ضرورت پیش آئیگی آپ کو اطلاع دے دوں گی۔"

مائیکل:۔ تو پھر ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر کوشش کرنا بفرضِ محال کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔ تو سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ نہ تمہارا، نہ اس کا آپ محبت میں مبتلا ہوئے۔ اس میں آپ کا کوئی گناہ نہیں۔ وُہ آپ کی محبت قبول نہیں کر سکتی۔ اس کیلئے وُہ موردِ الزام نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ آپ مجبور نہیں کر سکتے۔ آپ سمجھ لیں کہ وُہ آپ کے لئے پیدا نہیں ہوئی۔ اپنا وقت اور اپنی قوت اس کے لئے ضائع نہ کریں۔ ممکن ہے۔ وُہ ایسے شخص سے محبت بڑھانے کی خواہشمند ہو جس سے وُہ شادی کر سکے۔ انسان کی زندگی میں محبت صرف وصل تک ہی محدود نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ حیوانوں کے سلسلے میں ہے کہ جنسی اتصال کے بعد اپنی اپنی راہ لی۔ اس پر مزید بحث پھر کریں گے اور ہاں یہ لیجئے، اصغر عمر صاحب کی شادی کے دعوت نامے۔ کل شام سہرا بندی کی رسم ہے۔ کل کا اجلاس اصغر کی کوٹھی پر ہی۔"

عمر صاحب کی کوٹھی بھی آج دُلہن کی طرح آراستہ تھی۔ مائیکل نے اصغر اور انصر کا تعارف کروا دیا۔ ہم ایک طرف ہو کر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ اصغر مائیکل کے راز دار دوستوں میں سے تھا۔ بے تکلف گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا۔ انصر بولا "کیوں مائیکل، شادی کی رسم کے متعلق سائنس کا کیا نظریہ ہے؟"

مائیکل:۔ شادی انسان کی کئی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ مثلاً (۱) جنسی بھوک کی تسکین

کا جائز طریقہ (۲) محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے اپنانے کا رشتہ (۳) افزائش نسل۔ (۴) دو طرفہ پُرخلوص محبت ۔ چاہنا اور چاہا جانا (۵) زندگی میں دُکھ اور سُکھ کا ساتھی مہیا کرنا جو بہترین دوست ہمدرد اور خیر خواہ ثابت ہو سکے۔ جنسی بھوک اور حُسن کی تشنگی کے لئے دُنیا میں دو ہی صُورتیں ممکن ہیں: ایک رضامندی اور دوسرے زنا بالجبر یعنی بھوک ۔ جان کا خوف یا روزی کی خاطر جسم حوالے کرنا۔ مجبوری کی شادی بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ رضامندی خواہ جنسی بھوک یا عشق و محبت کا نتیجہ ہو۔ مگر باہمی اتصال کے لئے نہایت لازمی امر ہے۔ زبردستی انسان کے شایانِ شان نہیں۔ فطری طریق تو یہی ہے کہ وصل سے پہلے محبوب کو اپنا یا جائے۔ شادی کے بعد بھی زبردستی کا حق شوہر کو نہیں۔ وصل باہمی رضا و رغبت سے ہی جائز ہے۔ شادی بھی مرد و عورت کا باہمی پیمانِ وفا ہے۔ جب تک وُہ رضا و رغبت سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ شادی کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اگر وُہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں تو شادی کا صحیح معنوں میں پیمان ٹوٹ جاتا ہے۔ خواہ اُسے دُنیاوی طور پر نہ توڑا جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا مرد و عورت کے باہمی سماجی یا جنسی تعلقات کے لئے شادی کی رسم ضروری ہے۔ کیا بغیر شادی کے مرد و عورت آزادانہ زندگی بسر نہیں کر سکتے؟ ایک انتہا پسند گروہ تو مجرّد زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ امر انسانی فطرت کے سراسر منافی ہے۔ قدرتی جذبات کو روکنا علم طب کی رُو سے صحت کے لئے بیحد مضرت رساں ہے۔ اخلاق بھی اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس نظریئے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ دُوسرا انتہا پسند گروہ جو مجوسانی نظریئے کا گرویدہ ہے۔ وُہ مرد و عورت کے تعلقات پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنا چاہتا۔ وُہ فطری طریق پر فطری جذبات کی تسکین کا حامی ہے۔ نفس بلا شبہ یہ ترغیب دیتا ہے کہ جنسی بھوک کی تسکین کے لئے کوئی روک تھام نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ حیوان اور جانور کسی رسم کے پابند نہیں ہیں۔ مگر حیوان اور انسان کی ضروریات میں بڑا فرق ہے۔ اکثر حیوان یا جانور تو صرف جنسی جذبات کی تسکین چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قدرت کا منشا بھی پُورا ہو جاتا ہے۔ یعنی اس طرح افزائش نسل جاری رہتی ہے۔ مادہ کو کوئی تردّد نہیں کرنا پڑتا۔ بچہ پہلے ماں کے دودھ پر پلتا ہے۔ پھر اپنی قدرتی غذا کھانی شروع کر دیتا ہے۔ بچّہ کا تعلق کچھ عرصہ تک ماں سے رہتا ہے۔ اس کے بعد وُہ بھی اپنی انفرادی زندگی بسر کرنی

شروع کردیتا ہے۔ بعض حیوان اور جانور ایسے بھی ہیں جو خاندانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر سوال صرف جنسی بھوک کا ہوتا تو مرد عورت آزادانہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔ مگر انسان شہوت کی تسکین کے علاوہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وصل عشق و محبت کا نتیجہ ہو۔ جہاں تک شہوانی جذبات کا تعلق ہے۔ اس کی تسکین تو اور ذرائع سے بھی ممکن ہے مگر یہ طریقے محبوب سے وصل کی لذت کا ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ عشق و محبت کے جذبات کا یہ تقاضا ہے کہ عاشق و محبوب پیمانِ وفا کو مضبوط رکھیں۔ جب عشق و محبت مفقود ہوں تو وفا اور بیوفائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بفرضِ محال اتنی آزادی دے دی جائے کہ اپنی رضامندی سے ہر کوئی مرد عورت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اس سے تسکینِ جذبات تو ہو جائے گی مگر افزائشِ نسل کے فعل کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں کی پرورش کا بوجھ لازمی طور پر ماؤں پر پڑیگا۔ باپ بننے کے لئے کوئی مرد تیار نہیں ہوگا کیونکہ عورت کے جنسی تعلقات بیشمار مردوں کے ساتھ ہوں گے۔ اس لئے لازمی بات ہے کہ عورت ایک ہی مرد کے ساتھ جنسی تعلقات رکھے تاکہ مرد بچوں کا باپ گردانا جائے اور اُن کی پرورش کا ذمہ دار ٹھہرے۔ عورت کے لئے یہی صورت فائدہ مند ہے۔ ورنہ وُہ اپنی اور بچوں کی پرورش کیسے کر سکتی ہے۔ اس لئے شادی کا بندھن عورت ہی کی بھلائی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ جب ایک مرد عورت رضامندی سے اکٹھے رہتے ہیں اور ایک دُوسرے سے عہد و پیمان کر لیتے ہیں تو شادی کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ مگر رسمی طور پر سماج کی موجودگی میں باہمی زندگی بسر کرنے کا عہد و پیمان کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس طرح بندھن آسانی سے توڑا نہیں جا سکتا۔ ورنہ ذرا ذرا سی بات پر مرد عورت علیحدہ ہو جائیں گے۔ جیسا آج کل مغربی ممالک میں ہو رہا ہے۔ جہاں محبت ہے وہاں رنجش کا ہونا بھی لازمی ہے۔ بچوں کی پرورش اور خاندانی زندگی بسر کرنے کے لئے شادی ضروری ادارہ ہے۔ اس کے بغیر مرد عورت صحیح معنوں میں رفیق حیات اور دوست نہیں بن سکتے۔ آزادانہ جنسی ملاپ کے حامی وہی لوگ ہیں جو جذبات کی رو میں بہ جانا پسند کرتے ہیں۔ جن کا ذکر نظریہ محسوساتی کی وضاحت کے تحت آیا تھا۔ ایک فرانسیسی عورت اپنے معاشقوں کے لئے مشہور رہ چُکی ہے۔ اس کے اقوال سُننے کے قابل ہیں۔ جن سے ایسے جذباتی انسانوں کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ اس عورت کا دعوےٰ تھا کہ وُہ سو سے زیادہ دفعہ عشق کر چکی تھی۔ اس کا قول ہے کہ عاشقوں

کی فہرست میں ایک ڈاکٹر اور ایک دندان ساز ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ تاکہ ان بھاری اخراجات سے نجات مل سکے۔"

شام لال:۔ شاید دینا بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتی ہے۔ کل ایک دندان ساز کو لئے پھر رہی تھی۔ میں دیکھ کر جل ہی گیا۔ میں تو برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر مجھ میں کیا بُرائی ہے میں سب سے زیادہ اُس کو قیمت دے سکتا ہوں۔"

انصر:۔ بڑی دلچسپ عورت ہو گی۔ کچھ اور اقوال یاد ہوں تو سُنایئے۔"

مائیکل:۔ اس کا قول ہے کہ میرے ابتدائی چاہنے والوں میں سے ایک کفن ساز بھی تھا میں جانتی ہوں کہ مجھ ایسی عورت جو ایک پائی تک بچا کر نہیں رکھتی۔ خدا جانے موت کب آ جائے اور مجھے کفن تک نصیب نہ ہو۔ اس لئے میں نے اس سے ایک کفن بھی بنوا کر رکھ چھوڑا ہے۔"

انصر:۔ بڑی دانا عورت تھی جو مستقبل کا اتنا خیال رکھتی تھی۔"

مائیکل:۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ اگر اُسے کبھی شادی کرنا ہی پڑی تو اس لئے کرے گی تاکہ مردوں کی نگاہ میں اور جاذبِ نظر بن سکے۔ کیونکہ وُہ جانتی تھی کہ مرد دوسرے کی بیوی کو زیادہ چاہتے ہیں۔"

شام لال:۔ بات تو سچ ہے۔ کیونکہ نام تو خاوند کا رہتا ہے اور عورت اپنے گلے نہیں پڑ سکتی۔"

مائیکل:۔ وُہ بھی یہی کہتی تھی کہ مرد محبت یا دوستی کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کو شادی کے پھندے کا خوف نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی دعوت کے مشابہ ہے جس میں کھانا، شراب اور موسیقی سبھی مفت ہوں۔ اس کا قول ہے کہ اس زندگی میں جسمانی محبت ہی ایک حقیقت اور قابلِ توجہ چیز ہے۔ موت کے بعد روحانی محبت کرنے کے لئے وقت اور فرصت کی کوئی انتہا نہ ہو گی۔"

انصر:۔ خیال خوب ہے اور سُنایئے۔"

مائیکل:۔ اس کا قول ہے کہ خاوند بھی ایک زیبائش ہے۔ جس سے ایک موسم کے لئے گھر کو آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک بدنام عورت جو اپنی ساکھ کھو بیٹھے۔ اس کے لئے ایک امیر خاوند

کا نام بڑا کام دے سکتا ہے۔ اس کے نام پر خوب ادُھار لیا جا سکتا ہے جب تک خاوند کا نام فائدہ مند ثابت ہو۔ اس سے نباہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح کچھ عرصہ بڑے عیش و راحت میں بسر ہو سکتا ہے۔ ایک اور قول اس کا مجھے بہت ہی پسند ہے۔ ایک عورت جو صرف مال وزر کی خاطر شادی کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک بیسوا بھی فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ ایک بازاری عورت بھی اپنے فعل بد کے لیئے خدا کو گواہ نہیں بناتی۔ وُہ کم از کم کسی کو فریب نہیں دیتی۔"

انصر:۔ کیا حقیقت بیان کی ہے۔ ہندوستان کی اکثر عورتیں اسی لیئے شادی کرتی ہیں۔"

مائیکل:۔ اس کا قول ہے کہ لوگ مجھ سے اکثر دریافت کرتے ہیں کہ آیا میں جنت و جہنم پر ایمان رکھتی ہوں۔ بلا شبہ میرے تو تجربہ میں آیا ہے کہ مجھے مردوں کی آغوش نے جنت سے ہمکنار کر دیا ہے اور بیشمار مردوں کو میں خود جہنم واصل کر چکی ہوں۔ اس لیئے میرے لیئے تو دونوں موجود ہیں۔ شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔"

شام لال:۔ میں بھی تو اسی جہنم میں جل رہا ہوں۔ کاش ایک دن کے لیئے دنیا مجھے جنت کا سا مزہ دے سکے۔"

مائیکل:۔ اور سُنو۔ طلاق بڑے لطف کی چیز ہے۔ میں سینکڑوں دفعہ اس دَور سے گذر چکی ہوں۔ مگر یہ طلاقیں میں خود دیتی ہوں۔ ایک منصف کو اپنے ذاتی معاملات میں دخل انداز کرنا فضول رسم ہے۔ خود ہی شادی کرتی ہوں۔ خود ہی طلاق دیتی ہوں۔ سماج کو گواہ بنانے کی تکلیف دینا تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

انصر:۔ کیا بات ہے۔ آزادی ہو تو ایسی ہو۔"

مائیکل:۔ اپنی لڑکی کو اُس نے نصیحت کی تھی کہ اپنا نام جس کو چاہو دے دو۔ مگر اپنا دل کسی کو مت دو [illegible] جب تک دل نہ ٹوٹے۔ دل کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب تک چند قانون نہ توڑے جائیں۔ آزادی کا ثبوت بہم نہیں پہنچ سکتا۔"

انصر:۔ کچھ بھی ہو باتیں بڑی پُر لطف کہی ہیں۔"

مائیکل:۔ ایک اور بات یاد آئی۔ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ پارسا

عورتیں اتنی جاذبیت نہیں رکھتیں کہ ان سے عشق کیا جائے اور بدکار عورتوں سے سچی محبت کرنا بہت مشکل ہے۔ میرے نزدیک تو نیک اور بدکار عورت میں یہی فرق ہے۔ کیونکہ حسن اور قابلیت کی دونوں خوبیاں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ قابلیت کے حصول کے لئے حسن کی قربانی دینا لازمی ہے۔ عورت کی کامیابی کا راز حسن میں مضمر ہے۔ اس لئے عورت کے لئے دو ہی راستے کھلے ہیں۔ کامیاب بیوقوف بنے یا بدصورت عاقل۔"

شام لال :- واقعی حقیقت ہے۔ اگر کسی مغنیہ کے پاس آواز ہے تو حسن نہیں اور اگر حسن ہے تو گلا نہیں۔"

مائیکل :- "نفسیات کی رو سے بھی یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ جو عورت حسین ہوتی ہے۔ وہ کسی اور خوبی کو حاصل کرنے کی فکر نہیں کرتی۔ مرد کے لئے حسن بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جو عورت حسن کی دولت نہیں رکھتی۔ وہ کوئی ذہنی یا اخلاقی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ بھی امتیازی درجہ حاصل کر سکے۔ عزت و شہرت کی تشنگی انسانی فطرت کا زبردست اقتضا ہے۔ اچھا اب آخری قول سن لیجئے۔ اب رسم سہرابندی ہونے والی ہے۔ بہترین دل وہی ہے جو ایک برقی لمپ کی خوبیوں کا حامل ہو۔ جہاں بجلی موجود ہو۔ سوچ لگا دو۔ پھر اس روشنی میں خوب کھیلو کودو۔ کھاؤ۔ پیو۔ جو جی چاہے کرو۔ جب طبیعت اکتا جائے۔ بجلی سے قطع تعلق کر لو۔ اپنا لیمپ سنبھالو۔ بوریا بستر سمیٹو اور کسی دوسری جگہ چل دو۔ قیام میں زندگی کا لطف نہیں۔ محبت میں یہی نقص ہے کہ ایک جگہ گھر کر لیتی ہے۔ تمہارے جہاز کے گرد ہزاروں چھوٹی چھوٹی کشتیاں پہرہ دینے پر مامور ہو جاتی ہیں تاکہ تم بندرگاہ چھوڑ کر نہ جا سکو۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ چلتے جاؤ۔ جہاں بجلی موجود پاؤ۔ سوچ لگا دو۔ لیمپ سے روشنی حاصل کرتے جاؤ۔"

شام لال :- "یہ تو میرا ہی فلسفہ ہے۔"

مائیکل :- "مگر آپ نے وینا ہی کو اپنے دل کا آشیانہ کیوں بنا لیا۔ اگر تمہیں بجلی نہیں ملی تو اپنے لیمپ کا پلگ نکال لیجئے اور چلتے جائیے۔ دنیا میں ایک وینا ہی بجلی گھر تو نہیں ہے۔ تم جس کو چاہو سو وینا تصور کر سکتے ہو۔"

شام لال:۔ اچھا تو یونہی سہی۔ یہ وینا اپنے عاشقوں کو مبارک ہو"۔

رسم سہرا بندی کے بعد مقامی شعراء نے سہرے پڑھے اور پھر مہمان رخصت ہونا شروع ہوئے ان کے جانے کے بعد ہم سب اصغر کے ڈرائینگ روم میں اکٹھے ہو گئے اور سلسلہ گفتگو شروع ہوا۔

انصر:۔ اصغر صاحب! بے تکلفی معاف، کیا میں آپ سے ایک بات دریافت کر سکتا ہوں؟

اصغر:۔ بڑے شوق سے آپ میرے بے تکلف دوستوں کے دوست ہیں۔

انصر:۔ جس لڑکی سے آپ کی شادی قرار پائی ہے۔ کیا آپ خود بھی اُس سے واقف ہیں؟ یعنی وُہ آپکے عزیزوں یا رشتہ داروں میں سے ہے یا آپ بھی وُہی جاہلانہ رسم و رواج کے شکار بن دیکھے دُلہن پر ایمان لے آئے ہیں جو کچھ رشتہ داروں نے مُناسب سمجھا۔ آپکے لئے انتظام کر دیا۔ اگر ایسا ہی ہے تو آپ زندگی کا بہت بڑا جوا کھیل رہے ہیں۔

اصغر:۔ میں بہت بدنصیب واقع ہوا ہوں۔ تو آپ لوگ مجھے بڑا خوش قسمت تصور کرتے ہونگے جہاں میں چاہتا تھا۔ وہاں میری شادی کی سماج نے اجازت نہیں دی۔ اتنی بڑی کوٹھی میں تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ اس لئے شادی جلد کر رہا ہوں۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں نے ہونے والی بیوی کو کبھی نہیں دیکھا۔

انصر:۔ یہی تو رونا ہے کہ زندگی میں اس قدر اہم قدم بے سوچے سمجھے آگے بڑھا دیا جاتا ہے"۔

مائیکل:۔ مگر انصر صاحب۔ پردہ کے ہوتے ہوئے یہ ہونیوالی بیوی کو کیسے دیکھ سکتے تھے"؟

انصر:۔ اسلام تو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ شادی سے قبل مرد عورت۔ ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ ایک دوسرے سے منسوب ہونے سے پہلے ایک دُوسرے کو دیکھ چکے ہوں۔ آپس میں ملاقات کر چکے ہُوں اور شادی بغیر طرفین کی رضامندی کے ہرگز عمل میں نہ لائی جائے۔ مگر ہندوستانی رسم و رواج نے اسلام کی اصلی صورت پر پردہ ڈال دیا ہے"۔

مائیکل:۔ مغرب میں رواج ہندوستان کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں تو شادی پہلے ہوتی ہے محبت وصل کے بعد شروع ہوتی ہے مگر آزاد قومیں پہلے عشق کرتی ہیں۔ اس کے بعد کورٹ شپ ہوتی ہے اور پھر شادی۔ یہ بالکل فطری طریق ہے یعنی عشق و محبت کے جذبات کی بیداری۔ محبوب کو اپنانے کی سعی۔ کورٹ شپ اور وصل یعنی شادی۔ سب سے اہم کورٹ شپ ہے۔ پرانے وقتوں

میں کورٹ ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں بادشاہ اور بیگم عوام کی درخواستوں پر غور کیا کرتے تھے۔ درخواست کرنیوالوں کو سوٹر کہتے تھے۔ اس طرح یہ لفظ عاشق کیلئے مستعمل ہونے لگا۔ کیونکہ عاشق اپنے دل کی ملکہ کے پاس درخواست لے کر جاتا ہے کہ اس کی محبت قبول کرلے۔ وحشی انسان تو اپنے رقیبوں سے جنگ کرتا تھا۔ اپنی محبوبہ کو زبردستی اٹھا کر لے جاتا تھا۔ بعض وحشی قبیلوں میں اب بھی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں عام طور پر عاشق اپنی محبوبہ سے گفتگو کی اجازت اُس کے والدین یا سرپرستوں سے حاصل کرتا ہے۔ اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ سے پھر والدین کو آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ امریکہ میں تو اب اجازت حاصل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی جب مرد عورت تہیہ کر لیتے ہیں۔ تو والدین کو شادی کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور بعض اوقات تو دُلہن بنفسِ نفیس شادی کے بعد گھر پہنچکر والدین کو حقیقت سے آگاہ کرتی ہے۔ وہاں لوگ اب ان باتوں کی پروا نہیں کرتے۔ کورٹ شپ کا مقصد تو نیک ہے۔ یعنی شادی سے پہلے ایک دوسرے کے اخلاق طبیعت۔ اور عادات وغیرہ سے واقفیت حاصل کرنا۔ کیونکہ شادی کا اصلی مدعا تو زندگی کی رفاقت ہے۔ شادی کے بعد جنسی بھوک کی تسکین تو ایک فریضہ بن کر رہ جاتی ہے۔ جب طرفین کی تسلی ہو جاتی ہے۔ تو منگنی کی رسم مرد عورت کو انگشتری پہنا کر ادا کرتا ہے۔"

الغرض یہ طریقہ بیشک اچھا ہے مگر عملی طور پر اس کا ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ کنوارے مہینوں اور برسوں کنواریوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں جب وہ باہم ملتے ہیں تو ظاہری اخلاق کا ایک خول اپنے اصلی کردار پر چڑھا لیتے ہیں۔ عاشق اپنے محبوب کی نازبرداری کرتا ہے۔ شیریں مواعید سے اُس کا دل بہلاتا ہے اور اکثر بغیر شادی کے تمام ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار رہتا ہے۔ ان واقعات کے خطرناک نتائج سے دُنیا آگاہ ہے۔ مغرب کی بچہ کشی اور حرامی بچوں کی کثرت اس کا ثبوت ہیں۔"

مائیکل نے حرامی بچے کہنا نامناسب ہے۔ یہ کہو کہ حرامکاروں کے بچے بڑھ رہے ہیں۔ بچوں کا کوئی قصور نہیں اور نہ اُس طریقہ کا قصور ہے۔ یہ خود نوجوانوں کا قصور ہے کہ وہ بزرگوں کی رائے سے مستفید نہیں ہوتے۔ کورٹ شپ کا زمانہ زندگی میں پھر نصیب نہیں ہوتا۔ اُمنگیں جوان ہوتی ہیں عشق و محبت

کے جذبات میں شدت ہوتی ہے۔ عاشق محبت کے ساغر سے مسرت کے گھونٹ پیتا ہے۔ مگر اس میں وہ تلخی نہیں ہوتی جو ازدواجی زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے نہیں ہوتے۔ یہ لمحات زندگی کا بہترین سرمایہ ہیں۔ جب مرد و عورت بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اسی کورٹ شپ کے زمانے کی یاد اس اندھیارے میں سورج کی طرح ان کی ازدواجی زندگی کے اُفق پر چمکتی رہتی ہے۔ اب میرے خیال میں چلنا چاہئیے۔ کل کے لیئے پروگرام مرتب کر لو۔ برات کل دوپہر کی گاڑی سے لاہور روانہ ہوگی اور ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ کل ہمارے مقامی گرجا میں اسی شادی کے مضمون پر مس روبی ہارٹ کا ایک لیکچر ہوگا۔ جو ملٹری میں بھرتی شدہ لڑکیوں کی اصلاح کے سلسلے میں پادری صاحب نے خاص طور پر جس کا انتظام کیا ہے۔ ان لڑکیوں کی بدچلنی تو زبان زدِ عام ہو چکی ہے۔ میں نے ہی مشورہ دیا تھا۔ ورنہ آپ لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اور گرجا کیا معنی۔ کل آپ لوگ بھی تشریف لائیں تو لطف رہیگا۔ لیکچر کے بعد ہم سیدھے اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔ کیوں کیا صلاح ہے؟"

میں، انصر اور شام صبح کے وعدے کے مطابق گرجا میں موجود تھے۔ نماز کے بعد پادری نے مس موصوف سے درخواست کی کہ وہ اپنے خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔ تقریباً تمام بھرتی شدہ لڑکیاں موجود تھیں۔ ویسے بھی ان لڑکیوں میں اکثریت عیسائیوں کی ہوتی ہے۔ مس صاحبہ پادری کی جگہ آ گئیں اور معمولی تمہید کے بعد یوں گویا ہوئیں: "میرا روئے سخن لڑکیوں کی طرف زیادہ ہوگا۔ کیونکہ جنسی اور ازدواجی معاملات میں گمراہی کا خمیازہ اُن کو زیادہ بھگتنا پڑتا ہے۔ عشق و محبت اور رُومان کے دلفریب لمحات تو مرد کے لئے یکساں جاذبیت رکھتے ہیں مگر عورت مرد کی ان معاملات میں تقلید نہیں کر سکتی۔ پہلا بنیادی فرق یہی ہے کہ عصمت عورت کا بے بہا زیور ہے۔ مرد ہزار دفعہ گناہ کا ارتکاب کرنے پر بھی نقصان نہیں اٹھاتا۔ مگر عورت کی ایک لغزش، اس کا ایک گناہ۔ اس کی ساری زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس کا غلط اقدام گناہ کی صورت میں دُنیا پر روشن ہو سکتا ہے۔ یہ امر اس کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ اس کو مردوں کی نظروں میں ذلیل کر دیتا ہے۔ وہ عصمت مآب ہونیکا پھر کبھی دعوے نہیں کر سکتی مرد کو ایسے دور سے کبھی دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس کی عصمت پر کوئی داغ نہیں پڑتا۔ مگر عورت کی

عصمت پر لگا ہوا ایک دھبہ قیامت تک دُھل نہیں سکتا۔ اس لئے میری عزیز بہنو، اگر تمہارے دوست احباب یا رشتہ دار یا والدین اس بات کا ثبوت بہم پہنچا دیں کہ تمہارا محبوب مرد تمہاری محبت کے قابل نہیں ہے تو ضد نہ کرو۔ اگر کسی میں اخلاق نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کر لو۔ اس کا خیال چھوڑ دو۔ تمہیں چند روز یا چند مہینے ضرور کرب و اضطراب میں مبتلا رہنا ہوگا۔ مگر اس کا انجام بہت اچھا ہوگا۔ محبت کے زخم خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں۔ کسی مرد کو شادی کے ذریعے اصلاح [illegible] سمجھنے کے چند مہینے یا سال اس سے بدرجہا بہتر ہیں کہ ساری عمر رو رو کر بسر ہو۔ "جب تک موت تمہیں جدا نہ کرے" ۔ ایک بیحد مشکل عہد و پیمان ہے۔ اس کا نباہنا آسان کام نہیں۔ اس لئے خوب سوچ سمجھ کر اس عہد نامہ پر دستخط کرو۔ یہ یاردل دوستوں کے ساتھ وعدہ نہیں کہ اگر وعدہ خلافی ہو بھی گئی تو معاف کر دیئے جاؤ گے۔ اس بندھن سے چھٹکارا پھر مشکل ہوتا ہے۔ یاد رکھو۔ روپیہ ہی سب کچھ نہیں۔ مال و زر سے نہ صحت خریدی جا سکتی ہے، نہ کسی کا دل اور نہ مسرت کا حصول جد و جہد کے بغیر ممکن ہے۔ روپیہ صرف اعانت کر سکتا ہے مگر محنت لازمی ہے۔ اس کے علاوہ دولت کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ علم اور اخلاق ایسے بے بہا خزانے ہیں کہ ان کو نہ کوئی چرا سکتا ہے نہ لوٹ سکتا ہے۔ اس لئے ان خوبیوں کی قدر کرو۔ مرد کو علم، صحت اور اخلاق کے معیار پر پرکھو۔ اس سے اس لئے اجتناب نہ کرو کہ وہ غریب ہے۔ دُنیا کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ تمام بڑے بڑے بادشاہ۔ تاجر اور کروڑ پتی کسی وقت بیحد مفلس تھے۔ مگر محنت سے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اس لئے اگر تمہیں اس بات کا یقین ہے، کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے تو پھر یہ نہ سوچو کہ تمہارے ہمسائے۔ والدین۔ رشتہ دار یا سماج کیا کہیگا۔ زندگی تم نے بسر کرنی ہے۔ اُنہوں نے نہیں۔ سچا عاشق دُنیا کی بیش بہا دولت ہے۔ گراں بہا نعمت ہے۔ اس کو ہاتھ سے جانے نہ دو۔ میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس ہیرے کو پہلے پرکھ لو۔ کہیں مصنوعی نہ ہو اور اسکی پہچان کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ چند باتیں اگر ذہن نشین کر لو تو کبھی دھوکا نہیں کھاؤ گی ——

(۱) جب تمہاری درخواست پر مرد اپنے اخلاق کو سدھارلے مثلاً شراب نوشی جوا۔ زنا یا جھوٹ بولنا وغیرہ ترک کر دے۔ شراب نوشی یا تمباکو نوشی کے معاملے زیادہ سختی سے کام لینے کی ضرورت نہیں

اگر وُہ ان کا عادی نہیں ہے۔ صرف تفریحاً استعمال کرتا ہے جس سے اس کی اپنی اور دُوسرے کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو زیادہ ضد کرنے کی ضرورت نہیں (۲) بے تکلف ہونے پر بھی جب ایک مرد اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں کہتا۔ گالی نہیں دیتا اور سماج میں تمہارا رسمی احترام ملحوظ رکھتا ہے (۳) جو محبت کا زبانی اقرار یا خطوط سے یا اظہارِ محبت کم کرتا ہے مگر عملی طور پر محبت کے ثبوت زیادہ بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ مرد کے اقوال کا اعتبار کا کم کر دو مگر اس کے افعال کا یقین ضرور کرو (۴) جب وُہ تمہارے لباس یا آرائش کی ہر تبدیلی کو جانچتا ہے اور نقائص کو دُور کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ (۵) جب تم غلطی پر ہو اور وُہ حق بجانب ہو۔ مگر پھر بھی تمہاری دلشکنی نہ کرے اور مسکرا کر منہ ایک طرف پھیر لے (۶) جب مرد تمہیں اپنی رفاقت میں رکھنا چاہے۔ جہاں بھی وُہ جائے مثلاً سینما۔ سیر یا دعوت کے موقعوں پر (۷) جب وُہ احسان نہ جتائے۔ جو کچھ وُہ تمہاری محبت میں کر گزرا ہے۔ اسے بار بار نہ دہرائے (۸) جب وُہ تمہاری باتوں اور رنداق و مزاح سے لطف اندوز ہو (۹) جب وُہ کام میں مشغولیت کے باوجود سلسلہ ملاقات جاری رکھے۔ (۱۰) جب وُہ تمہارے انفرادی مذاق یا عقائد پر اعتراض نہ کرے رواداری کا عملی ثبوت دے۔ باہمی زندگی میں مرد عورت کو کچھ نہ کچھ ایثار کرنا لازمی ہے۔ جو مرد یہ چاہتا ہے کہ صرف اس کی مرضی حکمران ہو۔ وُہ ازدواجی زندگی کا اہل نہیں ہے (۱۱) جب وُہ سب سے پہلے تمہارے پاس کوئی خوشخبری لے کر آئے (۱۲) جب وُہ کسی شغل یا تفریح سے تمہاری عدم موجودگی میں حظ نہ اُٹھا سکے (۱۳) جب وُہ کوئی حسین ملبوس کسی عورت کے جسم پر دیکھے تو تمہیں بھی اسی ملبوس میں آراستہ دیکھنے کی خواہش کرے (۱۴) جب وُہ تمہاری لغزش کو معاف کر دے اور تمہارے اخلاق کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش کرے (۱۵) جب دونوں کی خواہشات یا پسند میں ہم آہنگی ہو تو رفاقت کا صحیح معنوں میں حق ادا ہو سکتا ہے۔ (۱۶) جب مرد تمہاری خاطر کسی سے لڑ پڑے یا حسد کرے ان باتوں کو کسوٹی تصور کیجئے اور پھر اپنے دوستوں کو اس پر پرکھئے۔ میرے خیال میں سو میں سے ایک بھی مشکل سے ایسا نکلے گا جو اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ میرے سامعین مرد بھائی مجھے اُمید ہے کہ بُرا نہیں منائیں گے۔ اگر میں یہ حقیقت بے نقاب کر دوں کہ اکثر مرد مہذب شکاریوں کے بھیس میں سڑکوں کا طواف کرتے رہتے ہیں تاکہ حسین تتلیوں کا شکار کریں۔ لفظ محبت ان کے

نزدیک صرف ایک اصطلاح ہے۔ ایک مچھلی کے شکار کرنے والی بنسی ہے جس سے وُہ اپنے شکار کو باآسانی قابو میں کر سکتے ہیں۔ ان کے شیریں الفاظ محض کو گرفتار کرنے کے لئے ہوتے ہیں حُسن کی تعریف کرنے کے معنی ہیں کہ وُہ حُسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ لطف اندوزی کا یہی مطلب ہے کہ مطلب براری کے بعد کنارہ کشی کر لی جائے؟ ان کا معیار حُسن نہیں بلکہ شکار کی تعداد ہے۔ ایسے سنگدل انسان تمہیں ہر جگہ ملیں گے۔ مگر شہروں میں ان کی کثرت ہے۔ نفیس لباس زیب تن کئے۔ اخلاق کا مجسمہ بنے ہوئے دکھائی دیں گے۔ شیریں الفاظ سے آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ کی خدمت کے لئے دست بستہ حاضر رہیں گے۔ مگر جب وُہ تمہیں حاصل کرلیں گے تو عشق کے ساتھ وُہ بھی غائب ہو جائیں گے۔ میں مردوں کو اس لئے زیادہ موردِ الزام ٹھہراتی ہوں کیونکہ عورت کو زیادہ گمراہ کرنے والا مرد ہوتا ہے۔ اپنی جنسی بھوک کی تسکین کے لئے وُہ عورت کو شکار کرتا ہے۔ مرد بھی اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ حُسن میں بے پناہ کشش ہے۔ مرد میں جنسی بھوک یا عشق کا مادہ غالب ہے۔ عورت میں محبت کا عنصر غالب ہے۔ مرد ہر حسین عورت کو دیکھ کر اس کا قرب چاہتا ہے۔ اس کے جنسی جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ مگر عورت ایک وقت میں ایک ہی مرد پر فریفتہ ہوتی ہے۔ مرد کی جنسی خواہش سطحی ہے۔ وُہ عورت کو صرف دیکھنے ہی سے برانگیختہ ہو سکتی ہے مگر عورت کے جنسی جذبات کو بیدار کرنے کے لئے مرد کا انتہائی قرب لازمی ہے۔ ایک سمجھدار عورت آسانی سے مرد کی محبت پرکھ سکتی ہے۔ جنسی ہیجان اور جنسی جذبہ شکار محبت سے مختلف ہیں۔ ازدواجی زندگی میں محبت اور رفاقت کو زیادہ دخل ہے۔ اس لئے ایک سچا عاشق اپنی محبوبہ کو کبھی ایک سستی شراب کا جام پیش نہیں کرے گا۔ جو مرد آپ کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے وُہ تمہیں شراب نوشی یا زنا کی ترغیب نہیں دے گا۔ وُہ تمہیں تحائف دے کر تمہارے جسم کا کبھی طالب نہیں ہو گا۔ عشق و محبت جنسی کشش کی پیداوار ہیں۔ مگر یہ جذبات بیدار ہو جانے کے بعد ایک مقدس صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے ایسے اشخاص سے ہرگز راہ و رسم نہ بڑھاؤ جو مرد تمہیں اپنی بیوی بنانے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے عشق و محبت کا تعلق رکھنا بے سود ہے۔ چند باتیں میں ان لڑکیوں کے گوش گزار کر دینا چاہتی ہوں جو عشق و محبت کو ایک رُومان تصور کرتی ہیں۔

ان کے نزدیک عشق کرنا ایک شغل ہے۔ ایک کھیل جیسے زندگی میں اور کھیل ہیں۔ بیڈ منٹن کھیلنا یا رومان کرنا ایک برابر ہے۔ ایسی لڑکیاں زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی ہیں۔ اس لئے آئے دن ہاں ان کے مرد دوست بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آپ ایسی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں یعنی کسی ایک مرد کی ہو کر رہنا گوارا نہیں ہے۔ بچے پیدا کرنے سے نفرت ہے۔ ساری عمر برائے نام مس کہلوانا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کی اپنی پسند ہے۔ اپنی زندگی کا راستہ اختیار کرنے کا تمہیں حق ہے۔ میرا کہنے کا مدعا صرف اتنا ہے کہ دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جاؤ۔ ایک راستہ اختیار کر لو اور اس میں کامیابی اور مسرت حاصل کرو۔ لیکن اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ آپ ایک خاندان کی بنیاد رکھیں تو پھر مجھے آپ سے اتنا کہنا ہے کہ مرد جنسی جذبات کی تسکین کی آزادی تو فطرتاً چاہتا ہے مگر جب بیوی پسند کرنے کا سوال درپیش ہوتا ہے تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ اس کی بیوی سوائے اس کے کسی کی محبوبہ نہ رہے وہ عورت کو چینی کی پیالی تصور کرتا ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی بال آجائے تو حسن فنا ہو جاتا ہے۔ چینی کے برتن کی قدر و منزلت اسی وقت تک ہے۔ جب تک وہ بے داغ ہے۔ جب تک اس میں کوئی خراش نہ آئے۔ مرد اپنے گریبان میں منہ کبھی نہیں ڈالتا۔ اس کے معاشقات اس کی کتاب زندگی کے مختلف ابواب ہیں مگر محبت عورت کا مکمل افسانۂ زندگی ہوتا ہے۔ اس لئے تمہارے بے معنی رومان یا معاشقے بھی اس کی نظروں میں کھٹکتے ہیں۔ وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ شادی کے بعد تم کسی سابقہ معاشقہ کا ذکر کرو۔ یا کسی اور کی یاد کو دل میں تازہ رکھو۔ بعض مرد اتنی شدت سے پیار کرتے ہیں کہ وہ یک طرفہ محبت پر ہی قناعت کر لیتے ہیں۔ وہ اتنا ہی غنیمت جانتے ہیں کہ محبوب کے جسم پر ان کا تسلط ہے مگر یہ تمام نتائج مجبوری کے ہیں۔ مرد طوعاً کرہاً اسے برداشت کرتا ہے۔ یہ الزام بے بنیاد ہے کہ عورت مرد سے زیادہ حاسد ہے۔ مرد بھی اتنا ہی حاسد ہے جتنی کہ عورت۔ عورت ہو یا مرد، مجبوری اور چیز ہے۔ چاہے محبت کی مجبوری ہو۔ مگر اپنی مرضی سے مرد عورت اپنی محبت میں شرکت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ مرد سوسائٹی میں کھلاڑی لڑکیوں کی تعریف تو کرتا ہے۔ ان کی مردانہ خوبیوں کو سراہتا ہے۔ مگر شادی کے لئے تیار نہیں ہوتا مرد تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی پُر لطف اور حسین عورتوں سے مزین ہو۔ کہیں موسیقی اور رقص

کی دلدادہ عورتیں اُس کا دل بہلائیں۔ اس کے ساتھ ٹینس یا کوئی اور کھیل کھیلیں۔ دریا میں غوطہ زنی کریں کھیل تماشوں میں اس کے ہمراہ رہیں۔ مگر اس کی بیوی جو بنے۔ وُہ حیا کے زیور سے آراستہ ہو۔ وُہ باعصمت اور وفا شعار ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے جو آپ کسی مرد دوست سے دریافت کر سکتی ہیں۔"

اس کے بعد پادری صاحب نے حاضرین کی طرف سے مس صاحبہ کا شکریہ ادا کیا۔ مائیکل بولا "آپ لوگ ریستوران میں چل کر میرا انتظار کریں۔ میں پادری صاحب سے مل کر ابھی آتا ہوں۔"

النصر:۔ کہیں مس صاحبہ سے تعارف کی خواہش تو بیدار نہیں ہوئی۔ بڑی حسین عورت ہے۔"

مائیکل:۔ موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہ دینا ہی کامیابی کا راز ہے۔ میرا آدرش میرے سامنے حقیقی صورت میں موجود ہے۔ مجسم ہو کر میری نگاہوں سے متصادم ہے۔"

مائیکل کے آنے کے بعد ہم لوگ اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ ہماری پارٹی براتیوں سے علیحدہ ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں آ دھمکی۔ شادی کے موضوع پر کچھ دیر کے بعد گفتگو شروع ہو گئی۔

مائیکل:۔ شام صاحب آپ لوگوں میں شادی کا کیا طریقہ رائج ہے؟

شام لال:۔ قدیم زمانے کے ہندوؤں میں سوئمبر کی رسم رائج تھی۔ لڑکی کے والدین اپنی ہی نسل، ذات اور رُتبہ کے نوجوانوں کو دعوت دے کر ان کو ایک حلقہ میں بٹھا دیتے تھے۔ باری باری تمام حاضر نوجوانوں کے کمالات، قابلیتوں اور کرتبوں وغیرہ کا بلند آواز سے ذکر کیا جاتا تھا تاکہ لڑکی تمام حاضرین سے متعارف ہو جائے۔ اس کے بعد لڑکی ہاتھ میں ایک ہار لئے تمام نوجوانوں کا سر سے پیر تک جائزہ لیتی ہوئی ایک چکر کاٹتی تھی۔ دوسرے یا تیسرے چکر میں وُہ جس کو انتخاب کرتی۔ اس کے گلے میں ہار ڈال دیتی تھی۔ بعض اوقات لڑکیاں کوئی شرط قائم کر دیتی تھیں۔ حاضرین اُمیدواروں میں سے جو اس شرط کو پورا کر دیتا۔ وُہ لڑکی کا شوہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس

رسم میں کچھ خوبیاں ضرور تھیں۔ مگر اب اس کا ہندوؤں میں کہیں ذکر تک نہیں آتا۔ برہمنوں نے ذاتی مفاد کے پیش نظر اس مفید رسم کی جگہ اپنے طریقے رائج کر دیئے اور کچھ صدیاں بیت جانے پر پنڈتوں نے مکمل طور پر اپنا تسلط جما لیا۔ اب شادی کے ایجنٹ یہی لوگ ہیں جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں۔ حجام ان کے معاون کہلاتے ہیں۔ یہ حجام رشتوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اور اپنا پیشہ بھی جاری رکھتے ہیں انہیں ایجنٹوں کی بدولت ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کی شادی ایک سولہ سالہ دوشیزہ کے ساتھ ممکن ہے ایک تعلیم یافتہ مرد کی شادی کسی جاہل عورت سے قرار پاتی ہے۔"

مائیکل :" کیا اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے؟ یہ تو جہالت کے زمانہ کی باتیں ہوں گی؟"

شام لال :" یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اس طریق میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہوا بعض اوقات اتنا ہی فرق پڑتا ہے کہ حجاموں کا فرض والدین یا رشتہ دار یا شادی کے ادارے سر انجام دیتے ہیں۔ مثلاً اصغر صاحب کی شادی . . . . ."

مائیکل :" اس قسم کی شادی کی ذرا تفصیل بیان کیجئے۔ بڑی دلچسپ بات ہے اور مجھے حیرت بھی ہے۔"

شام لال :" جب ایجنٹوں کی وساطت سے نسبت قرار پا چکتی ہے تو شادی کی رسم ادا کرنے کے لئے ایک دن مقرر ہو جاتا ہے۔ اس کو بیاہ کہتے ہیں۔ یہ اسی طریق پر ہوتا ہے جس طرح یہ اصغر کی شادی ہو رہی ہے۔ یعنی دولہا ایک برات کے ہمراہ دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ دلہن کے گھر پہنچ کر برہمن چند رسوم کی ادائیگی کے بعد دولہا دلہن کو شوہر اور بیوی قرار دے دیتا ہے۔ بیاہ کی گرہ دینے کے بعد شوہر اور بیوی ایک بانس کے گرد سات چکر لگاتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر اس کے بعد بیاہ کی گرہ کو کھول نہیں سکتا۔ خواہ اس کی بیوی اس کی زندگی تباہ کر دے۔ اس پر جینا حرام کر دے۔ مگر یہ بیاہ کا بندھن موت کے بغیر نہیں ٹوٹ سکتا۔"

" میرے خیال میں تو یہ طریق نوجوان مرد عورت کو شان و شوکت کے ساتھ سنہری بیڑیاں پہنانے کے مترادف ہے۔" میں نے کہا۔

شام لال :" دوسری قسم کی شادی کو گندھرو بواہ کہتے ہیں۔ جو لوگ دائمی شادی کے رشتہ

کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں عارضی شادی کرنے کی اجازت تھی۔"

الفصر: یعنی یہ جائز زناکاری تھی۔ عارضی تعلقات کبھی پُرخلوص نہیں ہو سکتے۔ اس طریقے سے ہر مرد یہی خواہش کرتا ہے کہ ہر ہفتے یا ہر مہینے بیوی تبدیل کر لی جائے۔ اس طرح عورت کو نہ پُرخلوص رفیقِ حیات دستیاب ہو سکتا ہے اور نہ بچوں کا کوئی سرپرست۔"

شام لال: لطف کی بات تو یہی ہے کہ قدیم زمانے کے ہندو اس عارضی شادی سے بھی تسکین نہ پا سکے۔ اس لئے ایک اور قسم کی شادی اختراع کی گئی۔ یعنی زبردست کمزور انسان کی بیوی کو قبضہ میں لا سکتا تھا اور بیوی کو واپس حاصل کرنے کے لئے خاوند کو اپنی ہی قوت بازو اور چالاکی سے کام لینا پڑتا تھا۔ قانون اس کی کوئی اعانت نہیں کر سکتا تھا۔ راون، سری رام چندر اور سیتا کا دراصل یہی قصہ ہے۔ راون نے اچیارن قسم کی شادی کی کوشش کی تھی مگر ہنومان کی مدد سے سری رام چندر کو ان کی سیتا واپس مل گئی۔ اس کے علاوہ اور کئی قسم کی شرمناک شادیاں رائج تھیں مثلاً برہما۔ راجپتیہ۔ ارشاد۔ اسورا وغیرہ جن کی وضاحت پنڈت لوگ ہی بہتر کر سکتے ہیں۔"

مائیکل: اچھا تو اب افصر صاحب شادی کے متعلق اسلام کا نظریہ بیان کیجئے۔"

الفصر: ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں کئی قسم کی شادیاں نہیں۔ ایک مسلم کے لئے یہی ہدایت ہے کہ وہ ایک نیک کردار اور باعصمت عورت سے شادی کرے۔ اسلام شادی کی پُرزور حمایت کرتا ہے۔ رسولِ عربی کا قول ہے کہ دنیا میں بے شمار اشیاء ہیں مگر ایک پاکباز عورت دنیا کی بہترین شئے ہے اور جب تک ایک مسلم شادی نہیں کرتا۔ اس کا ایمان نیم پختہ رہتا ہے۔"

مائیکل: مگر اسلام تو بے شمار شادیوں کی اجازت دیتا ہے مگر اس میں کہاں تک صداقت ہے؟ کیا یہ عورتوں کے ساتھ بے انصافی نہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگائی جائے؟"

الفصر: اس سے پہلے کہ میں اسلامی نظریے کی وضاحت کروں۔ انسانی فطرت کی تاریخ کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرد میں جذبہ محبت کے علاوہ جنسی بھوک بھی ایک غالب عنصر ہے جس سے لطف اندوز ہونا اس کا فطری اقتضا ہے۔ وہ ایک ہی عورت کے حسین جسم پر تسلط پا کر تسکینِ کامل نہیں پاتا۔ ایسے مردوں کا یہاں ذکر نہیں جو سرے

سے ہی عورت کے وجود سے نفرت کرتے ہیں۔ استثنا سے یہ بات جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ اس جذبہ پر قابو رکھنا اور بات ہے۔ اس لیئے جو مرد استطاعت رکھتے ہیں۔ وہ زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک اسی جذبہ کی تسکین کرتے آ رہے ہیں۔ مصر اور شام کی قدیم تاریخ کی ورق گردانی کرو۔ بادشاہوں اور امراء کی زندگی بے شمار عورتوں سے ملوث پاؤ گے۔ ہندوستان کے نواب اور راجے زندہ مثال ہیں۔ جن کے محلات بیگمات اور حسین عورتوں سے معمور ہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایک یہودی لاتعداد بیویاں رکھتا تھا۔ توریت کا بیان ہے کہ حضرت داؤد کی سات سو بیویاں اور تین سو کنیزیں تھیں۔ آتش پرست بھی جتنی چاہے بیویاں رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی مقدس کتاب میں اس کے متعلق صریح احکام مفقود ہیں۔ رسولِ عربی کے زمانے میں بھی لوگ بیشمار بیویاں رکھتے تھے۔ اس کثرت کو یکلخت ایک بیوی تک محدود کر دینا دانشمندی سے بعید تھا اور لوگ اس کے لیئے تیار نہیں تھے۔ اس لیئے تعداد گھٹا کر چار کر دی گئی۔ پولی گیمی (Polygamy) یعنی کثرت ازدواج کا الزام مخالفینِ اسلام کی اختراع ہے۔ کیونکہ پولی کے لفظی معنی ہیں لاتعداد یعنی کثرت۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام صرف چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے مگر اس کے ساتھ شرائط بڑی کڑی رکھی گئی ہیں۔ جن کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سری کرشن بھگوان بھی سینکڑوں گوالنوں کا رسیا مانا جاتا ہے۔ بیشتر مغل شہنشاہوں کے محلات میں بیشمار بیویاں اور کنیزیں تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ان کا انفرادی فعل اسلامی فعل ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ عیسائیوں میں دوسری بیوی کی قطعاً اجازت نہیں ہے مگر بادشاہ ہنری ہشتم نے آٹھ عورتوں سے شادی کر کے پوپ اور انجیل کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس کا یہ انفرادی فعل انگریزی فعل کی مثال نہیں بن سکتا۔ وہ اس کی ذاتی قانون شکنی تھی۔ عیسائیت کا قانون اس کا ذمہ دار نہیں تھا۔"

مائیکل: بالکل بجا فرمایا۔ ہمیں تو قانون پیشِ نظر رکھ کر اس کے محاسن اور عیوب پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ اچھا تو اب آپ چار بیویوں کی اجازت کی وضاحت فرمائیے۔"

انصر: قرآن میں اللہ یوں فرماتا ہے۔ "جو عورتیں تمہیں پسند آئیں۔ ان کو نکاح میں لے آؤ۔ ایک، دو، تین یا چار۔ بس یہ حد ہے۔ لیکن اگر تمہیں یہ خطرہ ہے کہ تم ان سے مساوی سلوک

روا نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کرو" اب آپ اس شرط پر غور فرمائیں مساوی سلوک کا یہ مطلب ہوا کہ تمام بیویوں کی ضروریات کا یکساں دھیان رکھا جائے۔ اپنی آمدنی کو برابر حصوں میں تقسیم کرو عشق و محبت کے معاملے میں کسی سے کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ یعنی کسی ایک کے ساتھ رعایت نہ کرے"

شام لال: "یہ کوئی بڑی بات نہیں میرے لئے تو یہ اجازت ہونی چاہیئے کہ وینا کے ساتھ بھی شادی کر سکوں"

النصر: "سرسری نگاہ میں تو یہ شرط آسان نظر آتی ہے مگر عملی جامہ پہناتے وقت بڑی دقت کا سامنا پیش آتا ہے۔ جن مردوں کے پاس دو بیویاں ہیں۔ ذرا ان سے وڈ جوروؤں کا مزہ دریافت کیجیئے۔ غور کیجیئے۔ دوسری عورت سے شادی پر آپ اسی حالت میں آمادہ ہوں گے۔ جب پہلی بیوی میں کوئی نقص ہوگا۔ اس نقص کی موجودگی میں یہ لازمی بات ہوگی کہ وہ دوسری بیوی کی طرف زیادہ مائل ہوگا جو اس نقص سے پاک ہوگی۔ خوبی اپنی طرف کشش ضرور کریگی۔ اس لئے مساوی سلوک کیسے ممکن ہوگا اس لئے ایک عام انسان کے لئے یہ بیحد مشکل کام ہے کہ نقص اور خوبی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھے انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ حسن یا محاسن سے اثر پذیر ہو اور تعصب سے بالکل پاک ہونا امر محال ہے اور اسی تعصب کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اسلام کے قانون کی جو خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ خود اس کا ذمہ دار ہے"

مائیکل: "جب چار شادیاں اس مساوی سلوک کی روشنی میں امر محال ہیں تو پھر ایسا قانون پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عیسائیت کی طرح قطعاً ممانعت کر دی جاتی"

النصر: "قابل غور اعتراض ہے جب کوئی قانون ساز انسانوں کے لئے ایسا قانون وضع کرتا ہے جو اُن کی تمام ضروریات کو پورا نہ کر سکے تو وہ قانون ساز اور اُس کا قانون ناقص سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایسا قانون جو ہر امکانی صورتوں کے جواز کا حامل ہو۔ قانون ساز کی عقلیت کی دلیل ہوتا ہے۔ اس لئے چار بیویوں کی گنجائش ایسے ہی امکانی حالات اور ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر شامل قانون کر لی گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چار شادیاں ضرور کرو۔ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ شادی ناگزیر ہو۔ تو

تو اس قانون سے استفادہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عورت ایک شادی شُدہ مرد پر عاشق ہو جاتی ہے۔ وُہ اس کے بغیر جینا نہیں چاہتی۔ اُسے یقین ہے کہ وُہ کسی دُوسرے مرد سے سچّی محبت نہ کر سکے گی۔ وُہ ہر ایثار کیلئے تیار ہے۔ وُہ سوت کی موجودگی کی پرواہ نہیں کرتی۔ اُسے وہ بھی عزیز ہے تو ایسی صورت میں پہلی بیوی کو چھوڑنا ایک بے گناہ کے ساتھ زیادتی ہوگی تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ دوسری عورت سے بھی شادی کر لی جائے۔ انسان میں رواداری کی خوبی نہ ہو تو انسان کہلانا بیکار ہے۔"

شام لال: "بالکل ٹھیک ہے۔ حالانکہ میں وینا سے عشق کرتا ہُوں مگر اپنی پہلی بیوی کو جو میرے بچوں کی ماں ہے۔ میری برسوں کی ساتھی ہے۔ اس کو میں کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں گا۔ اس لئے میرے خیال میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہونی چاہیئے۔ یہ تو مرد کی اپنی ہمّت ہے کہ دونوں کو خوش رکھ سکے۔"

مائیکل: "مگر پہلی عورت کیسے اپنی محبّت میں شرکت گوارا کرے گی؟ حسد بھی تو فطری امر ہے کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ آپ کی بیوی آپ کو بھی خوش رکھ سکے اور کسی دوسرے مرد کا بھی خیال رکھے"

شام لال: "میں تو ایسی بیوی اور اُس کے عاشق دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دوں گا"

مائیکل: "اسی طرح عورت کا بس چلے تو وُہ بھی یہی کر گذرتی ہے۔ مجبُوری اور چیز ہے"۔

شام لال: "اس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ مجبُورِ محبت ہو کر انسان محبوب کو کوئی ایذا پہنچانا نہیں چاہتا۔ وینا کی بھی یہی مثال ہے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہیں۔ وُہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر مجھے بھی میرا حصّہ مل جائے تو مجھے اسی پر قناعت ہو سکتی ہے"۔

اصغر: "دُنیا میں دو ہی صُورتیں ممکن ہیں جنسی جذبات کی تسکین کے لئے یا تو مرد ایک سے زیادہ عورتیں رکھے یا عورت ایک سے زیادہ مرد۔ اور یہ دونوں قسم کے مرد عورت دُنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ اس وقت دُنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گُنا زیادہ ہے پچھلی جنگِ عظیم میں یورپ کی عورتوں کی تعداد مردوں سے چار گنا تھی۔ آپ لوگ اس حقیقت پر غور کریں کہ مرد اگر جائز تعلقات ان زائد عورتوں سے رکھنا نہیں چاہتا یعنی شادی نہیں کرنا چاہتا تو پھر دُوسرا طریقہ یہی ممکن ہے کہ وُہ

ناجائز طور پر ان عورتوں سے جنسی تعلقات رکھے۔ یہ تو مشکل ہے کہ باقی عورتیں کنواری رہیں۔ اگر اب بھی ایک آدمی ایک ہی عورت پر اکتفا کرنے کی ضد قائم رکھے تو اُس کا مطلب صاف عیاں ہے کہ مرد عورتوں کی کوئی اعانت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے علاوہ مشرق میں تو بیشتر عورتوں کے لئے کسبِ معاش کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی شادی اگر کوئی مرد ان سے شادی نہیں کرتا تو لازمی طور پر وُہ اپنا جسم مردوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ خواہ وُہ ایک مرد کی داشتہ بنے یا زیادہ کی۔ بات تو ایک ہی ہے جنسی کشش ہی عورت کا قدرتی کاروبار ہے۔ اگر آپ جائز طور پر خرچ نہیں کرتے تو ناجائز طور پر اُن کی پرورش کرتے ہو۔ بیسواؤں۔ طوائفوں اور رنڈیوں کی کثرت اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔ مانا کہ حکومت ان کے لئے روزی کا انتظام کر سکتی ہے یا عورتیں مردوں کی طرح کوئی پیشہ اختیار کر سکتی ہیں جیسا کہ یورپ یا مغرب میں کیا جا رہا ہے مگر جنسی جذبات کی تسکین کا کیا سامان ہوگا۔ مرد کی ضرورت تو پھر بھی پیش آئے گی۔ مغرب میں ایک حسین مرد کے گرد جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ مردوں کی اتنی قلت ہے کہ ایک مرد کے پیچھے کئی کئی عورتیں رقابت کی جنگ لڑتی ہیں۔ اگر ایسی ہی دو چار جنگیں اور ہو گئیں تو پھر میری بات یاد رکھنا کہ مردوں کو قانوناً کئی کئی عورتوں سے شادی کرنا ہوگی۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے۔ فرض کرو۔ دُنیا میں عورتیں بالکل کمیاب ہو جاتی ہیں تو جس طرح آج مال و زر کے حصُول کے لئے دوسرے ممالک پر تسلط جمانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح عورتوں کے حصُول کے لئے جنگیں ہوں گی۔ انسان وحشی مردوں کی طرح عورت کے لئے قتل و خون کرنے پر مجبُور ہو جائے گا۔ اگر تہذیب سے کام لے گی تو یہی ممکن ہے کہ ایک عورت کے لئے کئی کئی جائز خاوند ہوں۔"

شام لال: "میرے خیال میں تو یہ سِسٹم عورت کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ وُہ کبھی بیوہ نہ ہوگی۔ دُوسرے ہر طرح کا عیش و آرام اُسے مہیا ہو سکے گا۔ مہنگائی کے ایسے دنوں میں ایک بیوی کی آرائش و زیبائش کا خرچ برداشت کر سکتا ہے تو دُوسرا اس کا اور بچوں کی خوراک کا کفیل ہو سکتا ہے اور تیسرا بچوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے اور باری باری عورت خاوندوں کے پاس رہ سکتی ہے عورت کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ مرد کے لئے البتہ محال ہے۔ اس کیلئے قوت چاہیئے اور اخراجات کے لئے کافی دولت۔"

انصرؔ: مگر شام صاحب تمہارے لئے یہ پروگرام مفید ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ عورت کو تو کئی مردوں کا لطف حاصل ہو جائیگا۔ مگر مرد کے لئے تو وہی ایک ہی عورت رہیگی۔ اگر شادی کی رسم توڑ دو تو آزادی میں انسان کی باقی ضروریات تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں جس کی وضاحت مائیکل نے کی تھی۔ بات چکر کاٹ کر پھر اپنے مرکز کی طرف آجاتی ہے۔ دونوں طریقے یعنی جنسی آزادی اور شادی بیک وقت ایک ہی سماج میں رواج نہیں پا سکتے۔ دونوں راستوں میں بہتر راستہ شادی کا ہے۔ ایک طرف جنسی تسکین کا بے شمار مواد ہے مگر محبت، رفاقت اور خاندانی زندگی مفقود ہے۔ دوسری طرف جنسی بھوک سیراب نہیں ہوتی مگر باقی تمام مسرتیں اور راحتیں میسر آسکتی ہیں۔ اس لئے جنسی تشنگی بجھانے کا جائز طریقہ یہی ممکن ہے کہ سماج ایسے مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں کی اجازت دے مگر ناجائز تعلقات رکھنے کی سخت سزا دے۔ اس کے علاوہ ایسے حالات بھی پیش آتے ہیں جس وقت دوسری شادی ایک لازمی امر بن جاتی ہے۔ فرض کرو کسی کی بیوی پاگل ہو جاتی ہے۔ تپ دق کی مریضہ ہو جاتی ہے یا بانجھ۔ ان حالات میں مرد کو جنسی بھوک کی تسکین، رفاقت کی تشنگی یا اولاد کی خواہش مجبور کر دیتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرے مگر پہلی بیوی کو بھی پاس رکھے پہلی بیوی کو لازمی طور پر رواداری کا ثبوت دینا چاہیئے۔ انسان کی خود غرضی مسرتوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ دل تنگ نہ ہو تو ہر چیز کی گنجائش ہے حسد کا پیدا ہونا فطری امر ہے مگر حسد کے جذبات پر قابو رکھنا انسانیت کی فتح ہے۔ یہ تو مائیکل صاحب آپ کا ہی اصول ہے۔

مائیکل: آپ نے تو قائل کر دیا۔ بیشک قانون شادی میں اس بات کی گنجائش ہونا لازمی ہے کہ مخصوص حالات میں ایک سے زیادہ شادیاں جائز ہیں۔

لاہور سٹیشن سے برات دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ دلہن کے گھر والوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہار پہنائے گئے۔ سگریٹ اور پان سے تواضع کی گئی یہی ہندوستانی تعیش کے لوازمات ہیں۔ ایسے موقعوں پر وقت کی پابندی تو گناہ ہے۔ جوں توں کر کے نکاح کی رسم ادا ہوئی جس میں صرف چند منٹ صرف ہوئے۔ ہماری پارٹی تو اسی انتظار میں تھی کہ کب اس سے نجات ملے

تاکہ تفریح کے لئے کہیں جایا جاسکے۔ شادی کا حسبِ معمول کھانا۔ پلاؤ۔ زردہ اور قورمہ کھانے کے بعد ہم نے اصغر سے اجازت لی اور مال روڈ کی طرف چل دیئے۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ انصر سینما دیکھنے کے حق میں تھا۔ شام لال اور مائیکل کسی ہوٹل میں وقت گذارنا چاہتے تھے۔ جہاں موسیقی ہو۔ رقص ہو۔ فضا میں نقرئی قہقہے بلند ہوں۔ آنکھیں حسین اجسام سے دو چار ہوں۔ آخر قرعہ سٹینڈرڈ ہوٹل پر پڑا۔ ہم چاروں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے اور چائے کا دور شروع ہوا۔ ہال میں کافی رونق تھی۔ آج شام ناچ کا پروگرام بھی تھا۔ اس لئے عورتیں کافی تعداد میں آرہی تھیں۔

"مائیکل، عورت کا وجود دُنیا میں کیا معنی رکھتا ہے۔ قدرت نے عورت کو کس لئے پیدا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل: "مرد اور عورت انسانیت کے ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ مرد قوت ہمت شجاعت اور بہادری کا ترجمان ہے۔ عورت حُسن محبت اور لطافت کا مجسمہ ہے۔ مرد اگر انسانیت کی نثر ہے تو عورت نظم۔ مرد عورت زندگی میں برابر کے شریک ہیں مگر فرائض جُدا گانہ ہیں۔ مرد استدلال سے کام لیتا ہے۔ عورت یقین کرتی ہے۔ مرد کی خصوصیات دانائی۔ ثابت قدمی۔ ارادہ۔ سختی اور سنجیدگی پر مشتمل ہیں۔ عورت مسرت، لطافت، رنگینی اور شیریں صفات کی حامل ہے۔ مرد کی قوتیں خواہشات سے بیداری حاصل کرتی ہیں۔ عورت محبت کے زیرِ اثر کام کرتی ہے۔ مرد اصولاً مدد کرتا ہے۔ عورت جذبہ ہمدردی سے متاثر ہوتی ہے۔ مرد انصاف کرتا ہے۔ عورت رحم کرتی ہے۔ مرد قوت کا بادشاہ ہے۔ عورت رعنائی کی ملکہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر تشنۂ تکمیل رہتے ہیں۔ قدرت کا منشا یہی ہے کہ دونوں مل کر سوچیں۔ زندگی کا لطف اُٹھائیں اور کام کریں۔"

انصر: "بیشک مرد عورت ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر وہ زندگی کی گاڑی کو رواں نہیں رکھ سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی نازک اندامی محنت ومشقت کی حامل نہیں۔ عورت کے لئے قدرت کی طرف سے ایک فریضہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ عورت مرد کی شریکِ حیات بنے۔ اپنی محبت سے مرد کی قوتِ عمل کو زندگی بخشے۔ اس کے بچوں کی پرورش کرے۔ اس کے گھر کی منتظمہ بنے۔ اس کی مسرتوں کا سرچشمہ بنے۔ عورت کو مردانہ

پیشہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے اپنے قدرتی فریضہ کی تعلیم حاصل کرنا ہی کافی ہے۔ امورِ خانہ داری مثلاً کھانا پکانا۔ سینا پرونا۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم اور تیمارداری وغیرہ اعلیٰ تعلیم اور مردانہ پیشے اُس کی حقیقی زندگی یعنی ازدواجی زندگی میں کسی کام نہیں آتے۔ ایک عورت جو مردانہ پیشہ اختیار کرتی ہے۔ اُس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے کہ وُہ کسی نہ کسی دن مرد کی محبت قبول کرتی ہے اور شادی کرنے کے بعد اپنے قدرتی فریضہ کی طرف خود بخود رجوع ہونا پڑتا ہے۔ امورِ خانہ داری میں یہ فرصت کہاں کہ وُہ مردانہ پیشہ بھی اختیار کئے رکھے۔ فطرت سے جنگ بیکار ہے۔ آزادی کے غلط مفہوم نے مغربی عورتوں کو مردوں کے پنجے سے آزاد ہونے کی ترغیب دی مگر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ عورتیں مردوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ یہ خیال کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی بالکل بے بُنیاد ہے۔ اس کی تائید میں کوئی عملی ثبوت نہیں ملتا۔ کیا حضرت عیسےٰ یا حضرت موسےٰ کی مائیں کسی یونیورسٹی کی گریجوائٹ تھیں؟ کیا کرشن مہاراج یا سری رام چندر کی ماؤں نے بنارس یونیورسٹی کی کوئی تعلیمی ڈگری حاصل کی تھی۔ کسی بھی مشہور اور کامیاب انسان کی زندگی کی مثال لے لیجئے۔ اس سوال کا جواب آپکو نفی میں ملے گا۔ اس کا سبب اعلیٰ تعلیم نہیں تھی۔ بلکہ اُن کا اعلےٰ کردار تھا۔ کسی قوم کے تنزل یا ترقی کا باعث اس کی تہذیب ہے۔ تعلیم بھی تمدن یا کلچر کو بلند کرنے کے لئے ایک زینہ ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں تاریخ میں موجود ہیں کہ ان پڑھ انسان بادشاہ۔ فاتح یا مصلح قوم بنے۔ ان کی ہمت اور خلوص دلی نے وُہ کام کر دکھایا جو کوئی ادب یا کوئی ڈگری نہ کرسکی۔ اس لئے اعلےٰ تعلیم جو مردوں کیلئے ضروری ہے۔ وُہ عورت کے لئے غیر ضروری ہے۔ عورتوں کے لئے وُہی تعلیم مفید ہے جو ان کو بہتر مائیں اور بیویاں بنانے میں مدد دے۔ اس لئے میری رائے میں ہر عورت کو اس سلسلے میں تعلیم و تربیت دینا لازمی ہے۔"

مائیکل: مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ مگر ایسی عورتیں جو طب یا جراحت کا پیشہ اختیار کرنا چاہیں یا کسی کو کسی علم سے لگاؤ ہو مثلاً علم و ادب۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

انصر: مجھے کوئی اعتراض نہیں اور مذہب کو بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ پیشہ بڑا معزز ہے اور عورتوں کے لئے عورت ڈاکٹر کا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ عورتیں ادیبہ اور شاعرہ بھی ہونی چاہئیں کیونکہ

عورت کے صحیح جذبات تو ایک عورت ہی بیان کر سکتی ہے۔ اس کے تخیلات اور محسوسات کی صحیح ترجمانی کر سکتی ہے۔ مرد تو سُنی سُنائی ہی بیان کرتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کیسے اُتر سکتا ہے؟"

شام لال "موسیقی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ موسیقی اور عورت کا کیا گٹھ جوڑ ہے؟"

انصر "بے شک مذہبی لوگ تو موسیقی کے خلاف ہیں مگر میں اسے انسانی ضرورت سمجھتا ہوں مرد عورت دونوں کیلئے موسیقی کی تعلیم یکساں مفید ہیں۔"

"اچھا تو عورت کا سماج میں کیا درجہ ہونا چاہیئے"۔ میں نے پوچھا۔

انصر: اس سوال کے جواب کے لئے کوئی منطق یا استدلال کی ضرورت نہیں۔ اس کا قدرتی جواب یہ ہے کہ جب مرد عورت زندگی کے ترازو کے دو پلڑے ہیں تو دونوں کا مساوی ہونا ضروری ہے عورت کے بھی وہی حقوق ہونے چاہئیں جو مرد کے ہیں۔ اب آپ مغرب کی آزادی پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہاں عورت کو کس قدر آزادی حاصل ہے۔ عیسائیت نے تو خانگی زندگی کے متعلق کوئی اظہار رائے نہیں کیا۔ جہاں تک خداوندانِ کلیسا کا بس چلا۔ وہ عورت کے خلاف زہر اُگلتے رہے۔ عورت مرد کو جنت سے خارج کروانے کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی اور اس لئے وہ سرچشمہ گناہ تھی۔ مرد کی بےعزتی کا باعث تھی۔ انجیل کو چھونا اس کے لئے ممنوع تھا۔ ان کو تعلیم و تبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ سجدہ گاہ کے پاس جانے کی ممانعت تھی۔ اپنی جائداد پر اسے حق نہیں تھا۔ عیسائیت نے عورت کے لئے کوئی حصہ یا حق وراثت تسلیم نہیں کیا۔ اب جو کچھ حقوق انہوں نے حاصل کئے ہیں وہ ان کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ وہ کسی مقدمہ میں بطورِ گواہ پیش نہیں ہو سکتی تھی۔ عورتیں انگلستان میں فروخت کی جاتی تھیں۔ جوزف تھامس نامی ایک شخص نے اپنی بیوی ایک کتے اور بیس شلنگ کے عوض فروخت کر دی تھی۔ ایسی اور کئی تاریخی مثالیں ہیں جو عورت کی جنگِ آزادی کا پیش خیمہ ہیں۔ اب آپ انہی مغربی اقوام کے لوگوں پر نگاہ ڈالیں جو اس حال میں موجود ہیں۔ مرد عورت کا کس طرح پُرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ عورت کی کس قدر تعظیم کرتے ہیں۔ اس کے آنے پر اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کرسی خالی نہ ہو تو اُس کے لئے جگہ بنائی جاتی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کی تعظیم گھر اور سماج میں ملحوظ

رکھی جاتی ہے مگر حقیقی آزادی مفقود ہے۔ کیا عورت کو پارلیمنٹ میں کوئی نمایاں درجہ دیا گیا ہے ؟ کیا کسی سیاسی ادارے کی ذمہ داری اُن کو سونپی گئی ہے ؟ کسی شعبہ حکومت میں عورت حاکم کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس پر دعوےٰ ہے کہ عورت کو مکمل مساوات حاصل ہے۔ مشرقی اقوام کی آنکھیں ان کی ظاہری آزادی کو دیکھ کر چندھیا گئی ہیں۔ کیونکہ مرد عورت آپس میں آزادی سے مل جُل سکتے ہیں۔ ناچ سکتے ہیں، شراب پی سکتے ہیں۔ اس لئے عورتیں آزاد ہیں۔ اس پر پھر کبھی تفصیل سے بحث کریں گے۔ اب اپنے ہندو بھائیوں کی طرف نظر کرو۔ ہندوؤں کے قوانین کے مطابق عورت اپنے باپ، بھائی یا شوہر کی جائداد کی وارث نہیں بن سکتی۔ اس کی دولت میں حصہ نہیں لے سکتی۔ اس کے برعکس ایک مسلم عورت کو مکمل مساوات حاصل ہے"۔

مائیکل:۔ اس کی ذرا وضاحت فرمائیے۔ ہم آزاد خیال لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری مسلم عورت قیدی بنا کر رکھی گئی ہے"۔

النصر:۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ تعصب دُوسری قوموں کو صحیح حالات سے آگاہ ہونے نہیں دیتا۔ اسلام نے عورت کو وراثت کا حق عطا کیا ہے۔ وُہ بحیثیت ایک بیٹی، بہن، بیوی، ماں دادی یا پوتی جائداد اور دولت میں مرد سے آدھے حصہ کی حقدار ہے"۔

مائیکل:۔ یہ نصف کیوں ؟ برابر کیوں نہیں ؟"

النصر:۔ نصف اس لئے کیونکہ عورت کو اپنے خاوند کی جائداد میں سے بھی نصف حصہ ملتا ہے۔ ایک نصف والدین کی وراثت میں اور دوسرا نصف خاوند کی ملکیت میں سے اور اس کے علاوہ خاوند کو مہر کے طور پر ایک رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ آپ نے اصغر صاحب کے نکاح کے وقت یہ الفاظ سُنے ہوں گے کہ بعوض پانچ ہزار روپیہ مہر نصف معجل اور نصف غیر معجل کے قبول کرتا ہوں"۔

مائیکل:۔ ہاں یاد ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟"

النصر:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈھائی ہزار روپیہ تو دُلہن کو گھر پہنچتے ہی ادا کر دینا لازمی ہے اور باقی ڈھائی ہزار روپیہ وُہ اپنی زندگی میں جب چاہے، وصول کر سکتی ہے۔ اگر خاوند فوت ہو جائے تو اُس کی جائداد میں سے بقایا رقم وصول کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ اس حق کو نہ شوہر واپس لے سکتا ہے

اور نہ اس کی ادائیگی سے قانونی انکار ہو سکتا ہے۔"

"مگر اکثر مسلمان تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ یہ وہ لفظ ہے کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا۔" میں نے کہا

النصر:- تو اس میں اسلام کی تعلیم کا کیا قصور۔ جو کام کی بات ہوتی ہے۔ اس کے لئے تو علما تردد نہیں کرتے۔ وہ تو اس چیز پر اعتراض کریں گے کہ میں یہاں بیٹھا تاریخ کیوں دیکھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مہر کی رقم اتنی بھاری مقرر کی جاتی ہے جس کا دولہا اہل ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ فریضہ تو رسم میں متبدل ہو چکا ہے جتنا چاہے لکھوا دیا۔ دینا دلانا کون ہے۔"

"آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔ اچھا تو اس کے علاوہ عورت کو اور کیا حقوق حاصل ہیں۔" میں نے پوچھا۔

النصر:- مسلمان عورتوں نے ادبی کارناموں میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ دورانِ جنگ میں وہ مرہم پٹی یعنی نرسنگ کا فرض ادا کیا کرتی تھیں۔ ان حالات میں پردہ بھی معاف تھا۔ رسول عربی کے اقوال ہیں کہ عورت اور مرد پر تعلیم حاصل کرنا فرض ہے۔ جنت ماں کے قدموں میں ہے۔ مرد کا عورت کو کمتر سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ عورت بہبودِ نسل کے فعل میں برابر کی ذمہ دار ہے۔ عرب کی تاریخ سے آپ واقف ہی ہیں کہ کس طرح لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی جان سے مار دیا جاتا تھا۔ جانوروں سے بھی بدتر سلوک ان سے روا رکھا جاتا تھا۔ جائداد میں سے کوئی حصّہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اسلام نے جو کچھ عورت کے لئے کیا اس کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ میں صرف چند باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ زنا کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں۔ زانی اور زانیہ کی سزا سو دُرّے مقرر ہے۔ بیوہ کی شادی پر زور دیا ہے تاکہ عورت شادی کی مسرتوں سے ہمکنار رہے۔ عورتوں کو مہر اور جہیز دینے کا رواج قائم کیا ہے۔ عورت کو مذہبی رسوم کی ادائیگی میں آزادی بخشی ہے۔ عورت اپنے اعمال کی ذمہ دار ہے اور مرد اپنے افعال کا دونوں اپنی اپنی جگہ جزا و سزا پائیں گے۔ مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں۔ دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ مرد کو عورت پر ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اس سے خوش نہیں رہ سکتا تو طلاق دے سکتا ہے مگر بہتر یہی ہے کہ وہ صبر کرلے۔ شاید اس میں بھی کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ عورت عدالت میں گواہی دے سکتی ہے۔ مہر کی رقم کا نصف حصّہ بیوی کو شادی کے بعد نہ چھونے کی صورت

میں بھی واجب الادا ہے۔ اگر عورت چاہے تو خاوند سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ عورت کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔"

مائیکل:- اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو مساوی حقوق دے رکھے ہیں"

النصر:- تنگ نظر مسلمانوں نے اسلام کو بدنام کر رکھا ہے۔ عورتوں سے وہ سلوک روا نہیں رکھتے جن کی وہ حقدار ہیں۔ اگر وہ صحیح طور پر اسلام کی مثال بن کر دنیا کے سامنے بیٹھیں ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ زندگی میں کامیاب نہ ہوں اور ترقی یافتہ اقوام کے مدّمقابل نہ بن سکیں"۔

مائیکل:- یہ بات تو طے ہو گئی کہ عورت اور مرد زندگی میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ دونوں کو سیاسی مذہبی اور سماجی معاملات میں یکساں دخل ہے۔ دوسرے یہ کہ عورت کا قدرتی فریضہ یہی ہے کہ وہ بہترین ماں اور بیوی بنے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مرد عورت مساوی حقوق کے مالک ہیں۔ مرد کو اگر آزادی حاصل ہے تو عورت کو بھی وہی مجلسی آزادی ملنی چاہیئے۔ سماج میں مرد عورت کے ملاپ پر کوئی بھی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ جس طرح مرد مرد سے اور عورت عورت سے ملاقات کرتی ہے۔ اسی طرح مرد عورت سے ملنے یا گفتگو کرنے کا حق رکھتا ہے۔"

النصر:- مرد عورت کے آزادانہ جنسی ملاپ کے متعلق تو آپ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ سماج بغیر شادی کے وصل کو ناجائز قرار دیتا ہے اور یہی مذہب کہتا ہے۔ شادی کا ادارہ اور آزادانہ جنسی مواصلت کا رواج ایک ہی وقت میں کسی بھی سماج میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ راستہ تو ایک ہی جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ ایسا سماج جو شادی کے ادارہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے مرد عورت شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی پاکباز رہیں یعنی عورتیں اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور صحیح معنوں میں دوشیزہ رہیں۔ شادی کے بعد سوائے اپنے شوہر کے کسی سے ناجائز تعلقات نہ رکھیں۔ اسی طرح خاوند بھی پاکباز رہیں۔"

مائیکل:- آدرش تو یہی ہے عصمت عورت کا بے بہا زیور ہے اور ہر مرد اپنی بیوی کو با عصمت دیکھنا چاہتا ہے۔"

النصر:- عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ عورت کا حسن ایک خاص کشش کا باعث

ہے۔ جو مرد کو وصال کی ترغیب دیتا ہے۔ ایک عام مرد کے لئے جو نامرد نہیں ہے جنسی ہیجان پر قابو رکھنا بڑا مشکل ہے۔ ایسے مرد بہت کم ہیں جو عورت کے حُسن سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کا حسن اور شیریں کلام بڑے سے بڑے زاہد کے ایمان کو بھی خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔ حسن سے عشق کا پیدا ہونا لازمی فعل ہے۔ عشق سے خواہشِ وصال پیدا ہوتی ہے۔ مرد عورت آزادانہ ملاقات کریں۔ تو بھی محبت کا پیدا ہونا قدرتی ہے۔ مرد عورت کی مثال پٹرول اور آگ کی سی ہے۔ دونوں کو نزدیک لانے سے تباہی یقینی ہے۔ اس لئے مرد عورت کو ملنے کا موقع بہم پہنچانا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اور خواہشِ وصال عصمت کو محفوظ نہیں رہنے دیتی۔ اسلام کا پردہ اسی اصول پر وضع کیا گیا ہے تاکہ مرد عورت سے علیحدہ رہے۔ نہ مرد دیکھے اور نہ ملاقات کرے۔ نہ عشق ہی پیدا ہوگا نہ خواہشِ وصال۔ یہ عصمت محفوظ رکھنے کا عملی طریق ہے۔"

مائیکل:- "اُصول تو ٹھیک ہے مگر عملی طور پر یہ اسی صُورت میں کارگر ہو سکتا ہے جب سارا سماج اس کا سختی سے پابند ہو۔ اگر سماج میں ایسے لوگ بھی ہُوں جو پردہ کے پابند نہ ہوں جس طرح کہ یہاں کی صورتِ حال ہے تو نوجوان مرد کے لئے بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ عورت کے بغیر کوئی محفل دلکش نہیں ہوتی۔ مرد عورت کی موجودگی کا خواہشمند ہے۔ آپ کی مجلسی زندگی میں کنوارے مرد کے لئے عشق و محبت کی کوئی گنجائش نہیں اور شادی شُدہ مرد کے لئے سوائے ایک ہی عورت کا مُنہ دیکھنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ نیرنگی کی خواہش انسانی فطرت کا اقتضا ہے۔ زندگی کا لُطف نیرنگی میں ہے۔ میں تو اس اصول کی تائید کرتا ہُوں کہ مرد عورت کو صحیح تعلیم سے آراستہ کرنا چاہیئے۔ عصمت کی خوبی اور جنسی معاملات کو ذہن نشین کروانے کے بعد مرد عورت کو ملاقات کی اجازت ہونی چاہیئے۔ سماج مناسب اقدام تجویز کر سکتا ہے۔ آزادی پر چند پابندیاں عائد کر سکتا ہے تاکہ عصمت محفوظ رہے اور انسانی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ اس پر مفصّل بحث کل کریں گے۔ رقص بُہت اچھا ہو رہا ہے۔ کاش کوئی ہم رقص یہاں ہوتی۔"

ایک گھنٹہ بیٹھے ہم نظارہ کرتے رہے۔ شام بہت بیتاب تھا۔ اسے رہ رہ کر وینا یاد آ رہی تھی۔ آخر وُہ نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور ہم قیامگاہ کو واپس ہُوئے۔ برات واپس جا چکی تھی۔ مگر ہم چار دل

ایک دن کے لئے اور ٹھہر گئے۔ دوپہر کو مائیکل ہم سے اجازت لے کر کہیں چلا گیا۔ پانچ بجے شام کو اسی ہوٹل میں ہم مائیکل کے پروگرام کے مطابق اس کا انتظار کر رہے تھے کہ مائیکل مس روبی ہارٹ کے ہمراہ ہماری میز کی جانب بڑھا ہم ششدر رہ گئے۔ مائیکل نے ہم سب کا تعارف کروایا۔ مس صاحبہ نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور ہم اطمینان سے بیٹھ گئے۔ چائے کا دور شروع ہوا۔ اور کچھ دیر بعد مائیکل نے پردہ پر گفتگو کے لئے انصر سے درخواست کی۔ مس صاحبہ نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔

انصر:- مرد عورت کو سماج میں علیحدہ علیحدہ رکھنے کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یعنی مرد عورت کی آزادی سے جو بُرے نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ وہ سراسر جاتا رہتا ہے۔ خواہ مخواہ خطرہ کو مول لینا دانائی نہیں ہے۔ مرد جب اچھی طرح جانتا ہے کہ عورت اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے تو پھر ان نازک جذبات سے کھیلنا آگ سے کھیلنے کے برابر ہے۔ تمام مشرق میں اسی نظریئے پر عمل درآمد ہوتا چلا آیا ہے۔ اگرچہ غیر مسلم قومیں چہرہ پر نقاب نہیں ڈالتیں مگر پھر بھی مغرب کی طرح غیر مرد عورت آزادانہ نہیں ملتے۔ دیہات کی رہنے والی مسلم عورتیں بھی گو برقعہ نہیں پہنتیں مگر غیر مرد سے ملنے کی آزادی انہیں بھی نہیں ہے۔ اس کو نیم پردہ کہہ سکتے ہو مگر شہروں میں رہنے والی مسلم عورتیں عام طور پر پردہ کی پابند ہیں۔ پردہ کے معنی ہیں کہ عورت سر سے پاؤں تک اپنے چہرہ جسم اور آرائش کو گھر سے باہر قدم رکھتے وقت پوشیدہ رکھے یعنی اپنے تمام جسم کو چادر سے ڈھانپ لے اور سوائے محرم کے یعنی بالکل قریبی رشتہ داروں کے اور کسی کے سامنے نہ ہو۔ مخصوص حالات میں عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ پاؤں ننگے کر سکتی ہے۔ مثلاً جنگ کے دوران میں پردہ کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ عورت سرے سے ہی گھر سے باہر قدم نہ رکھے اور سارا دن پلنگ پر دراز رہے۔ ہوا خوری کے لئے باہر نہ نکلے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سکول نہ جائے۔ سڑک پر پیدل نہ چلے۔ اپنی قوم اور ملک کی بھلائی کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے۔ قرآن اور رسول نے ایسے پردہ کا حکم نہیں دیا تھا جیسا کہ ہندوستان میں رائج ہے۔ پردہ کا مقصد اخلاق کی اصلاح ہے۔ عورت کی تعظیم اور اس کی عصمت کی حفاظت ہے۔ پردہ عورت کو گھر کی ملکہ بناتا ہے تاکہ وہ بچوں کی پرورش اور تعلیم میں مصروف رہے۔ پردہ ہی ایک ایسا ذریعہ ہے

جس سے مسلم عورت کو بدکردار مردوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ مغرب کی طرح ایک مسلم عورت کسی شرابخانے میں مردوں کو چیلنج نہیں کرتی اور ایسے شرمناک افعال کی مرتکب نہیں ہوتی جنہیں مشرق کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ مشرقی گھرانوں میں بدمست شرابیوں کے ساتھ ان کی عورتوں کا میل جول کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ کوئی پابندی نہ ہونے کے باعث بدکردار مرد آسانی سے عورت کو دام فریب میں لاسکتے ہیں۔ شراب اور خوشامد عورت کی عصمت لوٹنے میں بڑا کام دیتے ہیں۔ مس صاحبہ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گی۔ ان حقائق سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمام مرد عورت ایسے ہیں۔ مگر میں اکثریت کی بابت کہہ رہا ہوں کہ پردہ کی عدم موجودگی میں گناہ اس قدر پھیل رہا ہے کہ شیطان بھی یہ کارہائے نمایاں نہیں کرسکتا تھا۔ والدین کی موجودگی میں عاشق اپنی محبوبہ کو شراب پیش کرتا ہے۔ شراب گناہ کی ترغیب دیتی ہے۔ شراب سے بے شمار خاندان تباہ ہورہے ہیں۔ شراب ہزاروں عورتوں کو تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہے۔ حرامکاری سے پیدا شدہ بچوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ مگر آزادی کے علمبردار آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے بھی بس کی اب بات نہیں رہی۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔"

مس بی ۔ مگر موجودہ زمانہ میں پردہ ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ پردہ کو خیرباد کہے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے مجھے انکار نہیں مگر ان خراب نتائج کی ذمہ دار حد سے بڑھی ہوئی آزادی ہے اور کثرت ہر چیز کی مضر ہوتی ہے۔ خواہ شراب ہو یا آزادی۔ اس لئے آزادی پر بھی پابندی لازمی ہے۔"

انصر ۔ اگر ہم مختلف اقوام کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں۔ تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ پردہ کا ترقی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کے راستے میں صدیوں سے پردہ حائل نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ مغربی اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ عورتیں تو ایک طرف رہیں۔ مشرق کے مرد ابھی تک مغرب کے مردوں سے ہر لحاظ میں بہت پیچھے ہیں۔ مردوں کے راستے میں تو پردہ حائل نہیں ہے۔ اس کی وجہ ذہنی اور جسمانی کمزوری ہے۔ اعلیٰ تعلیم عورتوں کے لئے بیکار شے ہے۔ پردہ عورتوں کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہوتا۔ کیا پردہ کا یہ مفہوم ہے کہ علم۔ سائنس یا آرٹ میں ترقی نہ کی جائے۔ تعلیم حاصل

نہ کی جائے۔ تہذیب و تمدّن کو بلند تر نہ کیا جائے۔ قرآن یہ حکم نہیں دیتا کہ عورتوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھو۔ ان کو انگریزی ادب یا کوئی اور زبان نہ سکھاؤ۔ اپنے بچوں۔ قوم یا ملک کی بھلائی کے لئے کوئی قدم نہ اٹھاؤ۔ چہرہ پر نقاب ڈالنے سے عقل پر پردہ نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ مصلح قوم یا لیڈر مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کا سبب پردہ کی رسم کو ٹھہراتے ہیں۔ اس کی طرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لیڈر اپنی مجلسی زندگی کو صنفِ نازک سے معمور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ سارا ڈھونگ رچایا جاتا ہے حقیقت کو بیان نہیں کرتے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کو دلائل سے قائل کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں پردہ کے صاف احکام ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مخصوص حالات میں اتنی رعایت مل سکتی ہے کہ چہرہ۔ ہاتھ اور پاؤں ننگے رکھے جا سکیں۔"

" اگر اتنی اجازت بھی دے دی جائے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے تو جذبات کے اور بھڑکنے کا اندیشہ ہے تسکینِ قلب کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوگا۔ موجودہ تہذیب میں یہی بڑا نقص ہے مائیکل کا میں ہم خیال ہوں کہ یا تو پردہ مکمل طور پر رائج ہو یا بالکل نہ ہو۔ مجھے بھی اس دورنگی سے نفرت ہے۔ یہ مردوں پر ظلم ہے کہ دور سے بن ٹھن کر ان کے لطیف جذبات کو ٹھیس لگائی جائے مگر پاس پھٹکنے کی اجازت نہ ہو۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب میں یہ نقص ہے کہ آزادی پر پابندی نہیں ہے۔ ورنہ مغربی آدرش بہت دلکش ہے"۔ میں نے دخل اندازی سے کام لیا۔

انصر: اسی لئے قرآن تو صاف پردہ کا حکم دیتا ہے۔ اس پر بھی کوئی شخص اپنے آپ کو اگر خالق سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہے تو وہ خوشی سے تباہی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ جو اس کی قوم، ملک اور اس کی عزیز ماں۔ بہن۔ بیٹی کے لئے مضرت رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ صنفِ نازک کی تعظیم کرتا ہے۔ ان کی بھلائی کا خواہاں ہے تو وہ قرآن کے حکم کے مطابق عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ آج چہرہ۔ اور ہاتھ پاؤں کو ننگا رکھنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں تو کل کو اس سے اگلا قدم اٹھانے کا بہانہ تراشیں گے۔ کچھ عرصہ بعد یہی شرمیلی مشرقی عورت سڑک پر حسن کی نمائش کرتی پھرے گی اور غیر مردوں کے ساتھ بغل میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوٹلوں کی سیر کرے گی اور کلب کے ممبروں کے ساتھ رقص کرے گی۔ مغرب میں یہ سب اسی طرح ظہور پذیر ہوا۔ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مغرب کی آزادی کی تاریخ پر ڈال لیئے۔ ایک وقت تھا کہ عورت انسان

کی تباہی کا موجب گردانی جاتی تھی۔ کیونکہ حضرت آدم کو اُس نے گناہ کی ترغیب دی تھی اور جنت سے نکلوانے کا موجب بنی تھی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ عورت کی تعظیم کی جانے لگی۔ اُس وقت کی عورت حیا اور شرم کی پُتلی تھی۔ وُہ ملبوسات کے ڈھیروں میں چھپی رہتی تھی۔ وُہ غسل کا لباس پہن کر سمندر کے کنارے اٹھلا کر نہیں چل سکتی تھی۔ شادی کے معاملہ میں بھی وُہ اپنے والدین کی خوشنودی کا خیال رکھتی تھی۔ وُہ ایک بہترین ماں اور بیوی بننے کی سعی کرتی تھی۔ اس کا دن گھر میں گذرتا تھا۔ سینا پرونا، بچّوں کی تعلیم و تربیت اور خاوند کی خدمت اس کے مشاغل تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اُس نے گھر سے قدم باہر رکھنا شروع کیا۔ نہیں۔ یہ مرد تھا جس نے اسے گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دی۔ کیوں؟ اس لئے کہ مرد فطرتاً حُسن کا دلدادہ ہے۔ وُہ حسین نظاروں سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ وُہ عورتوں کی صحبت سے حظ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اس کی شیریں زبانی اور رعنائی اسے بھاتی ہے۔ یہی مرد کی کمزوری سب فساد کی جڑ ہے۔ آزادی کے درپردہ مرد نے عورت کو گھر سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ اسے سماج کی جان قرار دیا۔ اسے گرمیٔ محفل ٹھہرایا۔ عورت اس عزت افزائی سے پھولی نہ سمائی اور آج وہی حیا و شرم کی پتلی سوسائٹی گرل یا دوشیزۂ محفل کہلاتی ہے جو کلب اور ہوٹلوں میں نیم برہنہ رقص کرتی ہے۔ تمباکو نوشی اور شراب نوشی کی مرتکب ہے۔ جُوا کھیلتی ہے۔ ریس میں حصّہ لیتی ہے۔ بچّوں کو حُسن کی تباہ کاری خیال کرتی ہے۔ شادی کو مرد کی غُلامی تصوّر کرتی ہے جنسی آزادی کی پرستار ہے"۔

مس روبی:۔ مگر میں ان تمام افعال میں سے ایک کی بھی مرتکب نہیں ہُوئی۔ البتہ موسیقی اور رقص کی دلدادہ ہوں۔ کسی مرد کا اعتبار نہیں کرتی ہُوں۔ ہر مرد کو بدکردار سمجھتی ہُوں۔ جب تک وُہ اپنے افعال سے ثابت نہ کرے۔ مجھے رائے تبدیل کرنے پر مجبور نہ کردے۔ میں مرد کی کمزوری کو سمجھتی ہُوں اور اس سے اتنی توقع رکھتی ہُوں کہ وُہ شادی کے بعد کم از کم پاکباز رہے۔ عورت کی عصمت کی میری نظر میں بہت وقعت ہے۔ میں شادی کی حامی ہُوں مگر اب تک ...."

انصر:۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مائیکل ایسا ہی مرد ہے۔ وُہ آزاد خیال ہے مگر انسانیت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کاش سب عورتیں آپ سی ہُوں"۔

مس روبی:۔ شکریہ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ پردہ کے تشدّد مدسے قائل ہیں"۔

النصرۃ: بات یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ فضا جنسی آزادی کی بالکل اجازت نہیں دیتی تعلیم یافتہ لوگوں کی بیحد کمی ہے۔ بیشتر تعداد ان پڑھ کسانوں اور مزدوروں کی ہے۔ اُنہیں سماج کے لوازمات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ عوام کی زندگی کا معیار بہت پست ہے۔ اُن کو جینے کا شعور نہیں تمدن بالکل بے ڈھنگا ہے۔ ایسے لوگوں کو جنسی آزادی دینا پاگل کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے سب سے پہلے تعلیم و ترتیب لازمی ہے۔ آپ کے خیال میں اگر آزادی پر پابندی ہو تو مرد عورت کے ملاپ میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہو سکتی۔ مناسب تربیت سے بُرے نتائج دُور ہو سکتے ہیں عصمت بھی محفوظ رہے اور زندگی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ کاش ایسا ہو سکتا! انسان جب صحیح معنوں میں انسان بن جائے گا۔ اس وقت پردہ کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی پردہ ایک ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔ اس لئے میں کوئی ہٹ دھرمی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے مذہب کا مقصد آپ لوگوں پر واضح کر دیا تھا مگر انسان آج تک انسان نہیں بن سکا۔ جنسی آزادی کا تجربہ جس قوم یا ملک نے کیا۔ وُہ نقصان اُٹھائے بغیر نہ رہ سکا۔ آگ سے کھیلو اور ہاتھ نہ جلے ایک امرِ محال ہے۔ امریکہ نے شراب نوشی کی ممانعت کرنی چاہی مگر ناکامیابی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ یورپ اور امریکہ نے مرد عورت کے تمام درمیانی حجابات دُور کر دیئے ہیں۔ ایک مہمان کو خاوند پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وُہ بغیر شادی کئے ازدواجی زندگی کی تمام مسرتوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ خاوند چُوں تک نہیں کر سکتا سماج کی رسومات ہی ایسی ہیں۔"

مائیکل: اس کا مطلب یہی ہوا کہ پردہ ہی بہترین طریقہ ہے۔ اس لئے انسانی فطرت کے دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ یعنی ایسے سماج میں عشق و محبت یا رومان کو کوئی دخل نہ ہو۔ شادی اسی طرح بن دیکھے اور بن چاہے جاری رہے۔ ایک مہذب قوم کے لئے یہ بات مستحسن نہیں آزاد قومیں اس نظریئے کو قبول نہیں کر سکتیں۔"

النصرۃ: آپ کا اعتراض بیشک وزنی ہے۔ مگر اسلام عصمت کو کسی قیمت پر لٹانے کے لئے تیار نہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ عشق و محبت کی شادی کا مسلم سماج میں کوئی امکان نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ ایک مسلم عورت کو اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں سے پردہ

کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے نوجوان مرد اور عورتیں اپنے لئے شریک زندگی کا انتخاب عمل میں لا سکتی ہیں۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو پسند کرنا لازمی امر ہے۔ اسلام کا قانون بھی یہی ہے۔ یہ فطری اقتضا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خاندانی شادیاں بڑی کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ محبت کے رشتہ کے علاوہ خون کا رشتہ بھی مرد عورت کی ازدواجی زندگی کو اور مستحکم کر دیتا ہے۔ اگر آپس میں اَن بن ہو جاتے تو خون کا رشتہ مصالحت پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ان شادیوں کو رواج دینا چاہتے۔ اس کیلئے تنگدل مسلمانوں کو فراخدلی سے کام لینا چاہیئے۔ بزرگوں کی موجودگی میں جوانمرد عورت کا ملاپ بُرے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ رُومان کا راستہ بھی اس طرح کھل سکتا ہے اور یہی عشقیہ شادی کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے۔ ایسی شادیاں اب بھی ہوتی ہیں مگر کم یعنی عشق و محبت یا انتخاب کا دائرہ بیشک محدود ہے مگر ناپید نہیں۔ یہ دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے مگر اسلام جنسی آزادی کے خطرات مول لینے کے لئے تیار نہیں۔"

مائیکل: "مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ پردہ عصمت کو محفوظ رکھنے کا عملی طریقہ ہے مگر صرف عصمت کو بچانے کے لئے کیا ان تمام مسرتوں سے ہاتھ دھو لیا جائے جو پردہ مفقود ہونے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ دُنیا میں ہر چیز کی قیمت ہے۔ مسرت کی قیمت بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا عصمت اس قدر عزیز ہے کہ اس کے تحفظ کیلئے ہر ممکن قربانی عمل میں لائی جائے۔ ترقی کا راز خطرہ مول لینے ہی میں مضمر ہے۔ ہمت ہار بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا انسان ابھی تک حیوانی افعال سے باز نہیں آیا۔ جنگ کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ کیا اس پر قناعت کر لی جائے کہ دُنیا میں جنگ لازمی ہے۔ اس لئے عالمگیر امن کی تدابیر کرنا سعیِ بیکار ہے۔ بدی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لئے بُرائی کا انسداد تضیع اوقات ہے مگر انسان قناعت نہیں کر سکتا وہ حالات سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ عالمگیر امن بھی ایک آدرش ہے۔ اس کے حصُول کے لئے انسان تگ و دو کرتا آ رہا ہے۔ اسی طرح عورت مرد کا معصومانہ میل ملاپ بھی ایک آدرش ہے۔ جس کے حصُول کیلئے انسان تجربات کرتا آیا ہے۔ پردہ بھی ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے۔ یہ آپ کا ہی قول ہے تعلیم و تربیت سے سماج عصمت کی قدر و قیمت جان سکتا ہے۔ سماج کے اختیار

میں سب کچھ ہے۔ سماج سے فرد بغاوت کرکے کہاں جا سکتا ہے۔ حکومت افراد کی آزادی پر پابندی عاید کر سکتی ہے۔ جب پابندی سے افراد بے نیاز ہو جائیں گے۔ پابندی کی ضرورت نہیں رہیگی آپ نے بیان کیا تھا کہ انسانی فطرت کی اصلاح نہیں ہو سکی۔ بدی نیکی سے زیادہ دلکش ہے۔ اسلئے یہ تجربہ ناکامیاب رہا ہے۔ مگر مذہب کا مقصد بھی تو یہی اصلاح ہے۔ مذہب بھی تو صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بہت کم لوگوں کو راہِ راست پر لگانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے یہ مذہب کی جدوجہد بھی بیکار ہے۔ انسان کی فطرت سے بدی خارج نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انسان جس راہ پر چلتے ہیں انہیں چلنے دو۔ وقت نوبت ہی جاتا ہے۔ انجام سب کا ایک ہی ہے مگر میں ایک بات کہوں گا کہ یہ تجربہ اس سماج میں ناکامیاب رہا ہے۔ جن افراد کی آزادی پر پابندی عاید نہیں کی گئی میں مشروط آزادی کا حامی ہوں۔ اس لئے کہ تمام انسان مکمل انسان نہیں ہو سکتے۔ نیکی اور بدی کی جنگ دُنیا کے اختتام تک جاری رہے گی۔ دراصل دُنیا میں دو ہی گروہ ہیں۔ ایک نیکوں کا اور دُوسرا بدوں کا۔ خواہ برائے نام وُہ کسی گروہ۔ قوم یا مذہب میں شامل ہوں۔ اس لئے جو لوگ عصمت فروش ہوتے ہیں یا عصمت کی خوبی کو بیکار سمجھتے ہیں۔ وُہ لوگ گروہ بد کے افراد ہیں"۔

شام لال:۔ قطع کلام معاف۔ نیکی کے ساتھ بدی کا ہونا ضروری ہے۔ دُنیا میں ہر چیز کا جوڑا ہے۔ خوبی کی قدر و منزلت جبھی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کا دُوسرا رُخ بھی موجود ہو۔ فرض کرو ایک سماج کے مرد عورت عصمت کو بیکار شئے تصوّر کرتے ہیں۔ وُہ آزادانہ جنسی ملاپ کے حامی ہیں بچے حکومت کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ عورتیں سماج کی ملکیت سمجھی جاتی ہیں اور تمام افراد اس نظریئے کے قائل ہیں تو اس صورت میں وُہ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ کیونکہ افراد کی رضامندی سے یہ فعل سرزد ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے"۔

مائیکل:۔ جہاں تک اس مخصوص سماج کا تعلق ہے۔ اسے گناہ نہیں کہہ سکتے۔ مگر نسبتاً یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو بُرا کہتے ہیں۔ آزادانہ جنسی ملاپ سے صرف ایک ہی ضرورت پُوری ہوتی ہے یعنی جنسی جذبات کی تسکین۔ شادی میں باقی تمام ضروریات بھی پُوری ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم کو بہتر راستہ منتخب کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر عصمت فروشی کو لیجئے۔

جب ایک عورت اپنی مرضی سے یہ کام کرتی ہے تو مرد گناہ نہیں کرتا مگر اگر یہی مرد کسی عصمت مآب عورت کو بہکا کر آبرو ریزی کی کوشش کرتا ہے تو وُہ مجرم اور سخت گناہگار ثابت ہوتا ہے سماج کو اسے سزا دینے کا حق ہے۔ کیونکہ وُہ عورت ایسے سماج سے تعلق رکھتی ہے جو عصمت کے تحفظ کا حامی ہے۔ جو شادی کے بغیر جنسی تعلقات کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس لئے آزادی پر پابندی لازمی ہے۔ مرد عورت کو اکٹھے کھانے۔ پینے۔ کھیلنے۔ ناچنے، گانے اور گفتگو کرنے کی اجازت ہو مگر تنہائی میں اکٹھے ہونے کی ممانعت ہو۔ کیونکہ تنہائی کے بغیر جذبات کا بے قابو ہونا ممکن نہیں۔ پٹرول اگر ٹین میں بند ہو تو آگ لگنے کے امکان بہت کم ہو جاتے ہیں تعلیم سے مرد عورت کو ان تمام حقائق سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ اگر اس پر بھی وُہ احتیاط سے کام نہ لیں تو یہ خود ان کا قصور ہے۔ آپ ذہنی اعتراض کریں گے کہ آگ کا کام تو جلانا ہے۔ مگر آپ کو آگ میں کُودنے کو کون کہتا ہے۔ آگ کے گرد بیٹھ کر تم اس سے حرارت اور ضیا حاصل کر سکتے ہو اگر آگ کو چھوؤ گے تو جل جاؤ گے۔ بجلی سے ہزاروں کام لئے جاتے ہیں مگر اُسے کار آمد بنانے کے لئے اسے قابو میں رکھنا لازمی ہے۔ بجلی کی تار، ربڑ اور کپڑے کے اندر ملفوف اسی لئے کی جاتی ہیں عورت پردے کے اندر ملفوف بھی اسی مقصد کے لئے کی جاتی ہے۔ تاکہ وُہ مرد کو اپنی تباہی کیلئے آمادہ نہ کر سکے۔ مگر تار اگر بالکل ننگی ہو تو ہم ہاتھ پر ربڑ کا دستانہ چڑھا کر بھی بجلی کی تار کو بے خطر چھو سکتے ہیں۔ اس سے کام لے سکتے ہیں۔ اصول ایک ہی ہے یعنی پرہیز مگر صورت جُدا جُدا ہے۔ اسی طرح جنسی کشش بھی ایک بجلی کی خاصیت رکھتی ہے۔ اس سے سینکڑوں مفید کام لئے جا سکتے ہیں مگر بد احتیاطی سے نقصان کا احتمال ضرور ہے۔ سماج کو مرد عورت پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیئے تاکہ وُہ تنہائی میں آگ سے نہ کھیلیں۔ جو کھیلنا چاہتا ہے۔ وُہ خوشی سے کھیل سکتا ہے۔ مگر اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی اور وُہ قیمت ہے شادی۔ اب آپ ہی سوچیئے۔ ایک طرف پردہ کی ویران زندگی ہے دوسری طرف زندگی مسرتوں، قہقہوں، عشق و محبت اور رومان و موسیقی سے لبریز ہے۔ مجھے تصویر کے دونوں رُخ پیش کرنے دیجیئے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ پہلے بچپن کے زمانے کو لیجیئے۔ ننھے لڑکے لڑکیاں اکٹھے سکول جاتے ہیں۔ کھیلتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں بیجا شرم پروان نہیں چڑھتی۔ اپنے سے بزرگ لڑکے لڑکیوں سے جنسی معاملات پر گفتگو کرتے ہیں۔ شرم و حیا سے

مجبور ہو کر لاعلم نہیں رہتے جنس کوئی شرمناک چیز نہیں ہے۔ ایک سیدھی سادی بات ہے۔ انسانی ضرورتوں کی طرح ایک یہ بھی ضرورت ہے۔ نوجوان اس حقیقت سے بیخبر نہیں رہتے۔ ایک دوسرے کی موجودگی کا مقصد ان پر واضح ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ آپس میں معصومانہ محبت بھی کرتے ہیں۔ دوستی بھی کرتے ہیں اور جب جوان ہوتے ہیں تو یہی معصوم محبت یا بچپن کی دوستی کا پودا سیراب ہو کر عشق و محبت کے شجر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بچپن کی دوستی عمر بھر کی دوستی میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک بچہ جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ وہ شرمیلا رہتا ہے۔ وہ مخالف جنس کی موجودگی سے کتراتا ہے جنسی حقائق سے لاعلم رہتا ہے۔ بزرگوں سے وہ کوئی ہدایت نہیں پاتا۔ بزرگ بھی خود شرم کے شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بچے اپنے اپنے مفروضے گھڑ لیتے ہیں۔ سماج ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ زندگی کا سب سے اہم مسئلہ جس کی تعلیم لازمی ہے۔ اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ کس لئے؟ کیونکہ ان امور پر گفتگو کرنا شرمناک ہے اور اس شرم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے بری عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بچہ جب ذرا جوان ہوتا ہے جنسی جذبات اس کے جسم میں کروٹیں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ اگر پوچھنے کی جرأت کرتا ہے تو بزرگوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ البتہ ڈانٹ پلائی جاتی ہے۔ وہ وہیں دبک جاتا ہے اور پھر کبھی ان سے پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ لیکن جذبات بیدار نہ ہوں۔ یہ قدرت کو منظور نہیں۔ فطرت اپنی راہ پر چلتی رہتی ہے۔ رکتی نہیں۔ فطرت سماج کی پابند نہیں ہے جذبات اپنی تسکین چاہتے ہیں جو راستہ سامنے آتا ہے اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں لڑکیوں پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ پوشیدہ طور پر جنسی جذبات کی تسکین کی جاتی ہے۔ ہم جنسوں کی یہ حرکات کسی سے مخفی نہیں ہیں مگر سماج اسے آسمانی دبا سمجھ کر قناعت کر چکا ہے۔ اگر کوئی کوشش کی ہے تو اشتہاری حکیموں نے جو اپنی دواؤں کی فروخت کے سلسلے میں رسائل تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ رسائل نوجوانوں کو اور بھی گمراہ کر دیتے ہیں ان پر خوف و ہراس طاری کر دیا جاتا ہے۔ مایوسی ان پر سوار کر دی جاتی ہے۔ وہ ذہنی طور پر

کمزور اور نامرد بنا دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ان عادات سے کوئی بھاری نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ فطری جذبات ہیں۔ ان کی تسکین فطرت کا اقتضا ہے۔ کیا آپ نے مغربی اقوام کے جرائد میں اس قسم کی کبھی اشتہار بازی دیکھی ہے۔ جن سے ہندوستان کے اخبار اور رسائل مزین ہوتے ہیں۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔ مگر یہاں نوّے فیصدی جاہل بستے ہیں۔ اس لئے ان حکیموں کا خوب داؤ چل رہا ہے۔ کاش صحیح حالات سے نوجوانوں کو آگاہ کیا جائے۔ پاکباز رہنے کے صحیح طریقے بتائے جائیں اور ایسے اشتہاروں کا شائع کرنا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ جب تک ایک انسان صحت مند ہے۔ وہ کبھی نامرد نہیں ہو سکتا۔ یہ دوائیں بے معنی ہیں جو انسان قدرتی غذا سے فیض یاب نہیں ہو سکتا۔ اسے دوائیں کیا زندگی بخش سکتی ہیں۔ لڑکپن اور بچپن یونہی گذرتا ہے۔ جوانی آتی ہے تو اپنے ساتھ اُمنگوں اور جذبات کا طوفان لاتی ہے۔ ایک آزاد سماج کے نوجوان مرد اور عورتیں باہم مل سکتے ہیں۔ گفتگو کر سکتے ہیں۔ موسیقی۔ کھیل۔ تماشہ۔ ناچ رنگ۔ دعوت اور تفریح میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ وہ عشق و محبت اور شادی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ ان کی نظریں شریکِ زندگی کو تلاش کرتی ہیں۔ شادی اُن کے نزدیک جنسی بھوک کی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں شریک حیات چاہتے ہیں۔ مشرقی شادی تو صرف جنسی بھوک کی تسکین اور بچے پیدا کرنے کا جائز طریقہ ہے۔ حقیقی ازدواجی مسرت اور رفاقت اکثر مفقود ہوتی ہے۔ شادی عورتوں کے لئے دولت کمانے کا ایک ڈھنگ ہے۔ ایک جُوا ہے۔ جس کا پانسہ حجام اور شادی کے ایجنٹ پھینکتے ہیں۔ دو اجنبی مرد اور عورت کو جو بلحاظِ طبیعت چاہے وہ مشرق و مغرب ہوں۔ ایک دُوسرے کے پلّے باندھ دینا انہی کا کام ہے۔ بزرگوں کی نگاہ دولت۔ جائداد اور ظاہری حُسن کا جائزہ لیتی ہے۔ لڑکی بڑے اچھے گھر کی ہے۔ لڑکا تعلیم کے لئے ولایت جانا چاہتا ہے۔ لڑکی حسین ہے۔ کشیدہ کاری بھی جانتی ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ ان کا کردار کیا ہے ان کی پسند کیا ہے۔ ان کا مذاق طبیعت کیا ہے۔ ان کی ضروریات اور خواہشات کیا ہیں۔ خاوند اگر بیوی کی محبت اور رفاقت چاہتا ہے۔ تو بیوی ایک درجن بچے چاہتی

ہے۔ شوہر کو ادب سے عشق ہے تو بیوی کو پڑھنا ہی نہیں آتا۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا مثلیں بالکل ایسی شادیوں پر صادق آتی ہے۔"

انصر "مگر ان باتوں کے باوجود مشرق میں شادی کامیاب رہتی ہے۔ مغرب میں شادی اپنی پسند کی جاتی ہے مگر وہاں طلاق کی کثرت ہے۔ اس لئے یہ طریقے کامیاب تصور کئے جاتے ہیں۔"

مائیکل "اگر اس نکتہ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو یقیناً مشرقی شادی کامیاب نظر آئیگی کیونکہ طلاق کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مگر اس کی وجہ شادی کی کامیابی ہرگز نہیں ہے۔ راز یہ ہے کہ سماج نے طلاق امرمحال بنا دی ہے۔ مسلم گھرانوں میں بھی طلاق کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ حالانکہ طلاق مذہباً جائز ہے۔ سماج کے رسم و رواج ایسے سخت ہیں جن کو توڑنے کی ہمت کم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے نفرت کے باوجود دنیا کا منہ رکھنے کیلئے اکٹھے زندگی بسر کرتے چلے جاتے ہیں اور موت ہی ان کو ایک دوسرے سے نجات دلاتی ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ بات بات پر طلاق حاصل کی جاتی ہے۔ اگر طلاق کو وہاں بیحد مشکل بنا دیا جائے تو پھر ان کے ہوش ٹھکانے آ سکتے ہیں۔ انتہا ہر چیز کی مضر ہوتی ہے۔ اعتدال کا راستہ ہی انسان کیلئے راستی کا راستہ ہے۔ آزادی کا کوئی قصور نہیں۔ آزادی کا ناجائز استعمال اس کا ذمہ دار ہے۔"

شام لال "بیچارے مشرقی نوجوان مردوں اور عورتوں کی حالت کوئی میرے دل سے پوچھے سوا اپنے قریبی رشتہ داروں کے وہ کسی سے بات چیت نہیں کر سکتے اور وہ بھی صرف رسمی طور پر۔ بے تکلف گفتگو تو شرمناک فعل ہے۔ جیسا کہ سعید نے کہا تھا کہ پردہ بیشک کام کی چیز ہے مگر اسی صورت میں جب سارا سماج اس کا پابند ہو۔ جب دوسری مغربی قومیں، اینگلو انڈین یا عیسائی بھی موجود ہوں تو ان قوموں کا آزادانہ میل ملاپ ان کے جذبات کو مشتعل کر دیتا ہے۔ لیکن آزاد سماج کے دروازے ان کے لئے بند ہوتے ہیں۔ اپنے سماج میں ان کے لئے کوئی مراعات نہیں ہوتیں۔ وہ بیچارے کریں تو کیا کریں۔"

اتنے میں تفریحی رقص شروع ہوا۔ مائیکل نے مس روبی کو اپنی ہم رقص ہونے کی درخواست کی اور ہم سے معذرت کر کے وہ دونوں رقص میں مشغول ہو گئے۔ دونوں بہت اچھا ناچ رہے تھے۔ اچھی جوڑی تھی۔

شام نے کہا "سوائے اس کے کہ ہم بیوقوفوں کی طرح انہیں بیٹھے دیکھتے رہیں۔ ہمارے لئے کوئی اور

چارہ کار نہیں۔ غیر مذہب کا فرد ہونے کے باعث ہم کو کوئی مُنہ نہیں لگاتا۔ ورنہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں"
"بیشک میں نے تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پردہ اسی صورت میں مفید ہے جب سماج کے تمام افراد اس کے پابند ہوں۔ تاکہ سوائے اپنے قریبی رشتہ داروں کے مرد عورت نہ کسی سے مل سکیں نہ کسی کو دیکھ سکیں کیونکہ جنسی جذبات تو دو ہی ذرائع سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ دیکھنے سے یا میل ملاپ سے اور یہی دونوں باتیں رسمِ پردہ میں ممنوع ہیں۔ اس لئے یا تو مسلم سماج اپنا دائرہ وسیع کرے تاکہ کم از کم اس کے افراد آپس میں مل جُل کر مجلسی زندگی بسر کر سکیں اور اس طرح اپنے لئے بہترین شریکِ زندگی خود انتخاب کر سکیں"۔ میں نے کہا۔

اتنے میں ناچ ختم ہوا اور دونوں واپس میز کے گرد آ گئے۔

شام بولا "جوانی کی بہاریں آپ لوگوں ہی کے لئے ہیں ہم تو بھاڑ جھونکنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں"

مائیکل "جوانی تو ایک طرف رہی۔ بڑھاپا بھی آزاد سماج میں ایک نعمت ہے عمر رسیدہ اشخاص کو بڑی مراعات حاصل ہوتی ہیں نوجوانوں میں رہ کر وہ اپنے غم پیرانہ سالی کو اتنا محسوس نہیں کرتے جتنا کہ تنہائی میں۔ نوجوان مرد عورتیں ان کا دل بہلاتے ہیں۔ آپ نے رقص کے دوران میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ عمر رسیدہ مرد عورت کی کتنی تعظیم کی جاتی ہے۔ وہ جس سے دل چاہے، رقص کر سکتے ہیں یہاں تک کہ ہر حسین و نوجوان عورت کا بوسہ لے سکتے ہیں۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیے۔ ایک طرف ایک خوبی کی حفاظت میں سب مسرتوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ دوسری طرف تشویش تو ذرا ہے۔ مگر مسرتیں بیشمار ہیں۔ کیا پھول چُننے کے لئے آپ کانٹوں میں اُلجھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ ہر چیز کی قیمت ہے۔ قیمت ادا کرنا ہی ہوگی۔ خواہ دونوں میں سے کوئی راہ اختیار کر و"۔

تیسرا باب

سماجی مسرتیں

مائیکل کو ہم موسیقی اور حسن کی دنیا میں چھوڑ کر واپس اپنے گھر لوٹے۔ کیونکہ وہ چند دن کے مزید قیام کا خواہاں تھا۔ شام بھی اپنے کام پر واپس چلا گیا۔ اب میں اور انصر رہ گئے۔ اصغر کو شادی کے بعد احباب کی تشنگی کیوں ہوتی۔ اصغر اور مائیکل کی دنیا آباد تھی۔ وہ تنہا نہیں تھے۔ میں عیالدار رہتے ہوئے بھی تنہا تھا۔ میرے رفیق حیات میرے دوست تھے۔ بیوی نہیں تھی۔ انصر سے ملاقات جاری تھی۔ مگر عورت کے بغیر زندگی ہو یا محفل تشنۂ تکمیل رہتی ہے۔ مائیکل کے خطوط باقاعدہ موصول ہوتے رہے اس کا رومان ترقی پر تھا۔ ایک ماہ کے بعد مائیکل مس ربی کے ہمراہ واپس آیا۔ وہ منسوب ہو چکے تھے۔ اور آج شام اسی خوشی میں پارٹی تھی۔ شام کی عدم موجودگی کو بڑا محسوس کیا جا رہا تھا۔ اصغر بھی حاضر تھا مگر کچھ ملول نظر آتا تھا۔

"کیوں اصغر کیا بات ہے۔ آج تمہارے دوست کی شادی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور تم اداس ہو" میں نے کہا۔

اصغر "چھوڑو شادی کی بات۔ کوئی اور بات کرو۔ میں تو شادی کر کے آفت میں گرفتار ہوں"

"اچھا بھئی تمہاری خوشی۔ مائیکل تمہارے بغیر ہم بہت اداس رہے۔ کچھ محفل کا مزا ہی جاتا رہا یہ کیوں؟" میں نے موضوع چھیڑتے ہوئے کہا۔

مائیکل "بات صرف اتنی ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں

کے ساتھ مل جل کر کھائے پیئے، کھیلے یا باتیں کرے۔ کچھ اپنی کہے کچھ دوسروں کی سُنے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کلب یا سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ دعوتیں اور پارٹیاں دی جاتی ہیں۔ مقصد کھانا پینا نہیں ہوتا۔ یہ سب مل بیٹھنے کے بہانے ہیں۔ ایسے موقعوں پر گپیں ہانکنا یا باتیں کرنا ہی سب سے زیادہ آسان، کم خرچ اور مقبول عام شغل ہے۔ مرد عورت سبھی اس دلچسپ تفریح میں حصّہ لیتے ہیں۔"

انصر: "مگر آپ گپیں ہانکنے کی بجائے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے کے زیادہ شائق ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟"

مائیکل: "گپ ہانکنے کے لئے کوئی مواد چاہیئے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے حالات و معاملات پر خواہ مخواہ تنقید کرنا پسند کرتا ہے۔ جو کچھ اسے کسی کی بابت معلوم ہو یا سُن چکا ہو۔ دوسروں کو سُنانا چاہتا ہے۔ سچ ہو کہ جھوٹ۔ عام خیال ہے کہ عورتیں بہت باتیں کرتی ہیں۔ جب کہیں شادی بیاہ ہو یا کسی اور موقع پر اکٹھی ہو جائیں تو بس زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ ایک دوسرے کی راز داری کر جو کچھ اپنے خاوند، سہیلیوں، رشتہ داروں کے متعلق معلوم ہوتا ہے، اُگل دیتی ہیں۔ مگر مرد بھی تو کم نہیں۔ ہم لوگ بھی تو باتیں کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرق اتنا ہے کہ کم سمجھ عورتیں یا مرد غیبت کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ذی عقل مرد اور عورتیں ذاتیات پر گفتگو نہیں کرتیں جیسے ہم کوئی موضوع چھیڑ لیتے ہیں تاکہ تبادلۂ خیالات ہو۔ باتیں کرنے کی بھی خواہش کی تسکین ہو جائے اور علم میں بھی اضافہ ہو۔ تفریح کی تفریح ہو جائے اور زندگی کے قیمتی لمحات بھی رائیگاں نہ جائیں۔"

اصغر: "گپ کے متعلق اخلاقی رائے کیا ہے۔ کیا گپ شپ لگانا بُرا فعل ہے؟"

مائیکل: "گپیں ہانکنا یا باتیں کرنا فطری اقتضا ہے۔ اکثر لوگ گفتگو کرتے وقت اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ دوسرے بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں۔ وہ اپنی سی ہانکے چلے جاتے ہیں۔ اپنی آواز کو سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسروں کی باتوں میں دخل در انداز ہو کر سلسلۂ کلام منقطع کر دیتے ہیں اور اپنی سی ہانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بات کی انہیں پروا نہیں ہوتی کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں دلچسپ ہے کہ نہیں۔ انہیں سُننے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی نہ کوئی موضوع گفتگو کے لئے تیار رکھتے ہیں اور اس میں نمک مرچ لگا کر پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی موضوع دنیا ب

رہو تو پھر کوئی قصہ اختراع کر لیا جاتا ہے کسی مشہور و معروف ہستی سے ذاتی تعلقات اور تجربات وابستہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مخلص گفتگو کرنے والے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مشاہدات اور تجربات سے حاضرین کو محظوظ کرتے ہیں۔ کہانی اتنی دلچسپ نہیں ہوتی جتنا کہ اسلوب بیان اور ایسے لوگ محفل کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بغیر محفل سونی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے برعکس اول الذکر اشخاص کی نیت تو بد نہیں ہوتی۔ وہ کسی کی دانستہ برائی چغلی یا غیبت نہیں کرنا چاہتے۔ مگر وہ بداحتیاطی سے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو مناسب نہیں ہوتیں اور کسی کے وقار کو ضعف پہنچانے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ گپ شپ لگانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر انسان دوسروں کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنی چاہتا ہے۔ یہ بھی فطری تقاضا ہے۔ شہرت و عزت کی تشنگی کی تسکین ہر انسان مختلف طریقوں سے کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ باتوں سے تسکین کا ذریعہ سب سے سہل ہے۔ اس لئے سماجی زندگی میں بھی انسان اسی خواہش کے زیر اثر اکثر گفتگو کرتا ہے۔ الفاظ شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک انسان کی گفتگو اس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تخیلات اور محسوسات کے اظہار کے تین ہی طریقے ہیں۔ گفتگو، اشارہ اور تحریر۔ اپنی استطاعت علم کے مطابق ہر کوئی اظہار رائے کرتا ہے۔ کوئی زیادہ کوئی کم۔ سماج میں کوئی خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ اگر وہ خاموش انسان ہے اور کسی سے گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے خیالات اور احساسات کو قلمبند کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ یا وہ چند اشخاص سے گفتگو کرنا پسند کرتا ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر وہ اپنے دل ہی دل میں گفتگو کرتا ہو گا۔ کیونکہ ہر انسان ایک ذہن کا مالک ہے اور ذہن سوچنے کے بغیر نہیں رہ سکتا سوچنا بھی درحقیقت اپنے آپ سے گفتگو کرنا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ الفاظ بلند آواز سے ادا نہیں کئے جاتے۔ خاموشی کا یہ مطلب نہیں کہ زبان سے کوئی لفظ ادا نہ کیا جائے۔ ایک مقرر اپنی زبان سے یہ کام لیتا ہے۔ ایک مصنف اپنے قلم سے اور ایک مصور اپنے مو قلم سے۔ جذبہ ایک ہی کام کرتا ہے۔ اظہار کے طریقے مختلف ہیں۔ کوئی باتیں زیادہ کرتا ہے۔ کوئی سنتا زیادہ ہے اور جو سب سے زیادہ سنتا ہے۔ وہی اصل میں زیادہ باتیں کرتا ہے جیسے کہ سعید تم۔"

"وہ کیونکر؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل:۔ عام طور پر انسان باتیں کرنا زیادہ پسند کرتا ہے اور اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی اہمیت دُوسروں پر جتانا چاہتے ہیں۔ ان کو اپنی قابلیت اور شخصیت پر فخر ہوتا ہے۔ وُہ اپنا پروپیگنڈا آپ کرتے ہیں۔ مغرور انسان اپنے کارنامے خود بیان کرتا ہے۔ ایک واقعی قابل شخص اپنے منہ سے اپنی تعریف نہیں کرتا۔ مگر تعریف کی خواہش سے وہ بھی بے نیاز نہیں ہوتا۔ اس لیئے جو شخص دُوسروں کی بڑ کو بڑے اطمینان سے سُن سکتا ہے۔ ایک کان سُنکر دُوسرے سے نکال دیتا ہے۔ ایسے باتیں سنانے والے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے۔ ان کے دل کی بھڑاس نکال جاتی ہے۔ اس لئے ایک سیدھا سادا نسخہ یہی ہے کہ دُوسروں کی سُنو۔ اگر کسی سے اظہارِ ہمدردی کرنا چاہتے ہو۔ اس کے غم میں یا خوشی میں شریک ہونا چاہتے ہو تو دُوسروں کو اظہارِ جذبات و خیالات کا موقع دو۔ وُہ اپنا غُبار نکال لیں گے۔ آپ چُپکے سُنا کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کا کس طرح شکریہ ادا کیا جائے گا۔"

انڈھر:۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ یعنی گپ شپ کے متعلق اخلاقی رائے کیا ہے؟"

مائیکل:۔ یہ تمہید تھی۔ باتیں کرنے کے فعل کے پردے میں جو جذبات اور جو خواہشات کام کرتی ہیں۔ ان کا سمجھنا ضروری ہے۔ گفتگو کا موضوع ذاتی رائے۔ اظہارِ خیال و جذبات، ذاتی مشاہدات اور تجربات ہوتے ہیں۔ یا کوئی شخص دُوسروں کے خیالات، مشاہدات اور تجربات بیان کرتا ہے۔ اپنے متعلق گفتگو کرتے وقت دروغ بیانی سے اکثر کام لیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ میں بیان کر چکا ہُوں۔ ہر انسان اپنی اہمیت جتانا چاہتا ہے۔ وُہ کسی سے کم نہیں رہنا چاہتا۔ اس مقصد براری کے لئے اگر اسکے پاس حقائق کا ذخیرہ نہیں ہے تو وُہ مفروضات سے کام لینے کی سعی کرتا ہے۔ مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی اس کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس کو ہم گپ ہانکنے سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن ایسی باتوں کی قلعی جلد ہی کھل جاتی ہے اور یہ امر باعث شرمندگی بن جاتا ہے۔ اس لئے اپنے متعلق گپ ہانکنا بھی اخلاقی معیار سے گرا ہوا فعل ہے۔ اب لیجئے دُوسری صورت یعنی دُوسروں کے متعلق گفتگو کرنا۔ اس صورت میں بھی دروغ بیانی اور راست گوئی دونوں طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کو غیبت کہتے ہیں۔ یہ نہایت

مذموم فعل ہے۔ بسا اوقات ہمارے کانوں تک ہمارے اپنے متعلق ایسی باتیں پہنچتی ہیں جو بیحد رنجدہ ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں اختراع کر لی جاتی ہیں جو بے حد رنجدہ ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں اختراع کر لی جاتی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا جنہیں سُنکر حیرانی بھی ہوتی ہے اور رنج بھی۔ اکثر اوقات یہ اقوال ایسے اشخاص سے منسوب ہوتے ہیں جنہیں ہم اپنا دوست اور عزیز گردانتے ہیں۔ اگر کسی وقت ان باتوں کا سُراغ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے تو پتہ نہیں چلتا کہ کس کا یقین کیا جائے۔ راوی بیان دیتا ہے کہ اس نے یہ باتیں کہی تھیں۔ دوست کا بیان ہوتا ہے کہ وُہ ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کس کا یقین کیا جائے اس لئے میں تو ہرگز ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو شخص پیٹھ پیچھے بُرائی کرتا ہے اُس جیسا بُزدل انسان کوئی نہیں جو بات کہہ کر مکر جاتا ہے۔ اُس جیسا کمینہ انسان کوئی نہیں۔ اس لئے میں تو بڑا محتاط رہتا ہوں۔ کسی کی سُنی سُنائی پر یقین نہیں لاتا کسی کے متعلق جو کچھ سُنا اُسے دُوسرے کان سے نکال دیتا ہوں تاکہ زُبان سے باہر نہ آئے۔ کیونکہ اگر میں اس شخص کو یہ سُنی سُنائی بات دُہراؤں تو اُسے رنج ہوگا اور جب بات کا کھوج لگایا جائیگا تو اتنی اخلاقی جرأت کسی میں کم ہی ہوتی ہے کہ اس کا اقبال کرلے۔ اس لئے اگر کسی میں جرأت ہے تو مُنہ پر بات کہے۔ اگر کوئی شکوہ ہے تو بیان کرے۔ شیکسپیئر کا قول ہے کہ غیبت کی دھار تلوار سے زیادہ تیز ہے اور ایسے زہر میں بُجھی ہُوئی ہے۔ جس کے سامنے دریائے نیل کے تمام سانپوں کا زہر ہیچ ہے۔"

انصر:۔ اسلام بھی غیبت کی سخت مذمت کرتا ہے۔ رسُولِ عربی کا قول ہے کہ غیبت کے معنی ہیں کہ تم کسی کی عدم موجودگی میں ایسی باتیں کہتے ہو جو اُسے ناگوار گذریں گی۔ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ اگر وُہ باتیں بھی سچی ہوں تو ان کے بیان کرنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ آپ نے اس کی بھی ممانعت کی۔ یہاں تک فرمایا کہ غیبت زناکاری سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ یہ فعل دوسرے کی نارضامندی سے سرزد ہوتا ہے۔"

مائیکل:۔ بیشک ایک انسان کے یہی شایانِ شان ہے کہ وُہ کسی کے مُنہ پر بھی ایسی بات نہ کہے جو اسے رنجیدہ کردے۔ اگر آپ کو کسی سے ہمدردی ہے اور آپ اس کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں تو اس کی دوستانہ طریقے سے اصلاح کرو۔ بات دراصل یہ ہے کہ تنقید کرنے والا اپنی برتری جتانے

کے لئے ایسی بات کہتا ہے جس سے اس کے نفس کو تسکین حاصل ہوتی ہے کہ وُہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے میرا تو یہ اصول ہے کہ کسی کے متعلق بات کہنے سے پہلے اپنی ذات سے ذہنی طور پر یہ سوالات کرو۔ کیا جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں۔ وُہ ضروری ہے۔ اس سے کسی کو رنج پہنچنے کا احتمال تو نہیں۔ کیا اس سے اپنی نفسانی تسکین مقصود ہے یا دُوسرے کی اصلاح۔ اگر اصلاح مقصود ہے تو اس شخص سے خود بات کیجئے۔ دشمن بنانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ دُوسروں پر تنقید کرو جس پر تنقید کرو گے۔ وہی تمہارا دُشمن ہو جائے گا۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھو کہ ہر انسان ایک شخصیت کا مالک ہے مفلس سے مفلس شخص بھی ایک خُودی کا مالک ہے آپ اسے حقیر سمجھتے ہیں تو اُس کی خودی کو ٹھیس لگتی ہے۔ وُہ آپ کو کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔ وُہ دل میں ہزار گالیاں دیتا ہے۔ ایک انگریز ایک برہمن کو غلام سمجھتا ہے۔ وُہ گوری چمڑی پر ناز کرتا ہے مگر برہمن انگریز کے سائے سے پرہیز کرتا ہے۔ اگر اس کا سایہ اس پر پڑ جائے تو گھر جا کر اشنان کرتا ہے تاکہ پوتر ہو جائے۔ اس کو بھی اپنی تہذیب پر فخر ہے۔ ایک جاپانی کسی جاپانی عورت کو کسی امریکی سے رقص کرتے دیکھتا ہے تو جل اُٹھتا ہے۔ ذلیل عورت ایک امریکی سے ناچ رہی ہے۔ وُہ جاپانی ہونے پر ناز کرتا ہے اور دُنیا کا بہترین انسان ہونے پر یقین رکھتا ہے۔ امریکی اپنے آپ کو تمام انسانوں سے بالاتر سمجھتا ہے۔ ہر قوم اپنے آپ کو دُوسری قوموں پر ترجیح دیتی ہے۔ ہر انسان اپنے آپ کو دُوسرے انسانوں سے علیحدہ اور مختلف تصوّر کرتا ہے۔ اس لئے تنقید کوئی گوارا نہیں کرتا۔ یہ فطری اقتضا ہے۔ ایک ذی عقل انسان ہی تنقید سے صحیح فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ ایک دوست کا بھی یہی فرض ہے کہ وُہ دوست کے افعال پر صحیح تنقید کرے اور اُس کی اصلاح کی سعی کرے۔ فرق صرف تنقید کرنے کے طریقے میں ہے۔ ایک حجام بھی آپ کی حجامت یا شیو کرنے سے پہلے داڑھی کو خوب صابن لگا کر نرم کر لیتا ہے تاکہ استرے کی کاٹ محسوس نہ ہو۔ اسی طرح فرض کرو کہ آپ کا کلرک لکھتے وقت خوشخطی کو ملحوظ نہیں رکھتا تو بجائے اُس کو ڈانٹنے کے آپ اُس سے یُوں مخاطب ہو سکتے ہیں۔ تُم لباس تو خوب پہنتے ہو۔ بڑا جمالیاتی ذوق رکھتے ہو اگر لکھنے میں بھی جمالیاتی ذوق کا ثبوت دیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ اس طرح آپ اُس کے جذبات کو مجروح کرنے کی بجائے اس کو اپنی خُودی بلند کرنے کی ترغیب دو گے۔ وُہ آپ کے معیارِ خیال پر اُترنے کی سعی کریگا۔ اگر آپ اُس کو جھڑک دیں گے تو اسے رنج پہنچے گا۔ وُہ اپنی غلطی کی اصلاح کرنے کی سعی نہیں کرے گا۔ اسلئے اصلاح سے پہلے غلطی کا احساس دلانا ضروری ہے

صحیح تنقید کا مزا جبھی ہے جب دوسرا خود یہ محسوس کرے کہ وہ غلطی پر ہے۔ آپ کی تنقید اس کی اپنی ذاتی تنقید میں مبدل ہو جائے اسلئے اگر آپکو کسی سے ہمدردی ہے یا خیر خواہی کا دعویٰ ہے تو یہ طریقہ اختیار کرو۔ اگر نہیں ہے تو اس پر تنقید بے معنی ہے۔ آپ کو کسی کے متعلق گفتگو یا اظہار رائے کا کوئی حق نہیں۔ اپنے دل میں چاہے جو خیال کرو۔ ہاں اپنے متعلق جو چاہے کہو۔ اپنے خیالات و محسوسات کے اظہار کا تمہیں حق ہے بشرطیکہ دوسرے سننے کیلئے آمادہ ہوں۔ اپنی بھی کہو دوسروں کی بھی سنو کسی پر ذاتی حملہ نہ کرو۔ اگر تمہیں کسی کی عادات پسند نہیں تو نہ سہی۔ آپ اس کی صحبت سے گریز اختیار کریں۔ ہر کوئی اپنے ہم جنسوں کی صحبت کو ترجیح دیتا ہے۔"

انصر: بیشک باتیں کرنا ایک کم خرچ اور سہل تفریح ہے مگر غیبت سے مجھے بھی نفرت ہے۔ مجھے آپ لوگوں کی صحبت اسی لئے پسند آئی کہ آپ لوگ سوائے علمی یا ادبی موضوعات کے بہت کم کسی کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ کسی کے متعلق قصہ گھڑنا یا افواہ پھیلانا بہت ہی مذموم فعل ہے۔ اس سے غیبت کرنیوالے کی بدبختی کا صاف ثبوت بہم پہنچتا ہے اور ایسے اشخاص کا علاج یہی ہے کہ انہیں منہ نہ لگایا جائے۔ کسی محفل میں انہیں خوش آمدید نہ کہی جائے۔ منہ پر دروغ بیانی کی تو کچھ مدافعت ممکن ہے مگر پیٹھ پیچھے وار کو روکنا امر محال ہے۔ مصیبت تو یہی پیش آتی ہے کہ وار کرنیوالے کا پتہ نہیں چلتا۔ مثل مشہور ہے کہ جھوٹ کو چوبیس گھنٹے کا دقفہ دے دو اور پھر بھی تم اس کو پکڑ نہ سکو گے۔ ایک جھیل میں اگر پتھر پھینکا جائے تو ایک لمحے تو پتھر جس جگہ غرق ہوتا ہے۔ دکھائی دیتا ہے مگر چند لمحوں کے بعد لہروں سے کبھی یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ پتھر کس جگہ گرایا گیا تھا۔ یہی حال غیبت افواہ یا گپ کا ہے منہ سے بات نکالنا سہل ہے مگر ادا کئے ہوئے الفاظ پھر کبھی واپس نہیں آتے۔"

مس ربی: "مجھے ایک کہانی یاد ہے سینٹ فلپس کے پاس ایک عورت آئی جو ایسی ہی بد عادات کی شکار تھی اور اپنی اصلاح کی خواہاں تھی اس کو حکم ہوا کہ وہ ایک مرغی مارکیٹ سے خرید کر ایک مخصوص مقام تک پیدل چلے۔ راستے میں مرغی کے پر نوچ کر پھینکتی جائے جب یہ کام ختم ہو جائے تو آکر اطلاع دے۔ عورت حیران تھی کہ اسکے گناہ کا کفارہ کی صورت اتنی آسان کیوں بتائی گئی۔ وہ جلدی جلدی یہ کام سرانجام دے کر واپس پہنچی سینٹ فلپس نے تعمیل حکم پر شاباش دی اور کہا کہ اب باقی کام بھی مکمل کر دو یعنی واپس جا کر جس جس راستے سے گذری ہو وہاں سے تمام بکھرے ہوئے پر اکٹھے کر کے لے آؤ۔ عورت بولی۔ یہ تو ناممکن ہے کیونکہ اس نے لا پرواہی سے پر بکھیرے تھے اور ہوا ان کو اڑا کر کہیں کا کہیں لے گئی ہو گی۔ وہ کہاں کہاں تلاش کر سکیگی فلپس نے کہا۔ تمہاری چغلی اور غیبت کی باتیں بھی انہی بکھرے ہوئے پروں کے مشابہ ہیں جن کو تم نے ادھر ادھر بکھیر دیا ہے جاؤ اور ان باتوں کو واپس بلاؤ۔ اس کے بغیر کفارہ ناممکن ہے۔"

انصر: سیاسی پروپیگنڈے کے متعلق کیا رائے ہے۔ اخلاقاً ایسے موقع پر مبالغہ اور دروغ گوئی کہاں تک

جائز سمجھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے"۔

مائیکل: "ایسے موقع پر مبالغہ آرائی اور دروغ بیانی کو قدرے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ گروہ اپنے لیڈر کی خیر خواہی کے جذبات میں بہہ جاتے ہیں۔ یہ فطری امر ہے مگر یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہونا چاہیئے۔ اپنے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لے کر کوئی شخص خود اپنی توقیر کو ضعف پہنچائیگا۔ مگر اس کو یا اس کی پارٹی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ مخالف گروہ یا اس کے لیڈر کی مذمت کرے۔ اس کے متعلق کوئی افواہ پھیلائے اس کے خاندان کے متعلق دروغ بیانی سے کام لے تاکہ لوگوں کو نفرت ہو۔ حقائق کو بیشک آشکار کر سکتا ہے مگر بے بنیاد الزامات اختراع کرنا نہایت مذموم فعل ہے اور ایسے پروپیگنڈے کیخلاف [illegible] اس کا عملی ثبوت وہ اس کے خلاف ووٹ دیکر دے سکتا ہے۔ ایک کمینہ اور دروغ گو انسان نمائندگی کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس کی قانوناً ممانعت ہونی چاہیئے"۔

انصر: "بیشک یہی اصول مذہبی تبلیغ کیلئے بھی قانون کی صورت میں عائد ہونا چاہیئے۔ مذہبی اختلاف نے کس قدر نفرت اور کشت و خون کی بنیاد بن چکا ہے۔ ہر شخص اپنے مذہب کو ترجیح دیتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے مذہب کی مذمت کی جائے۔ میں اسلام کو پسند کرتا ہوں۔ آپ عیسائی کہلاتے ہیں۔ شام ہندو کہلاتا ہے مگر ہم کسی پر اعتراض نہیں کرتے۔ آپ اپنا سائینٹیفک نظریہ پیش کرتے ہیں۔ میں اسلامی فلسفہ پیش کرتا ہوں ہم ان نظریوں پر علمی تنقید تو کرتے ہیں مگر تعصب کی بنا پر نہیں۔ میں آزادی رائے کا حامی ہوں۔ میں سچائی کا پرستار ہوں جو بات حق ہوگی میں وہی تسلیم کر لوں گا۔ اس لئے میں آپ سے تبادلۂ خیالات کرنے کا اشتیاق رکھتا ہوں۔ میں اسلامی عقائد کو آپ کی سائنس کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں۔ میں کھوٹے سونے کو اپنے پاس کبھی رکھنا پسند نہیں کر سکتا۔ میں پیتل کو کھوٹے سونے پر ترجیح دیتا ہوں جو خود پر ملمع بڑھا کر دھوکا تو نہیں دیتا"۔

"یہی میں چاہتا ہوں کہ سچائی کا راستہ معلوم کر دوں اور پھر اس پر گامزن ہو جاؤں۔ اسی لئے میں آپ لوگوں کی باتیں سنتا زیادہ ہوں اور کہتا کم ہوں"۔ میں نے کہا۔

مائیکل: "آج تو بات جیت کے موضوع پر خوب گفتگو ہوئی ہے۔ غیبت اور دروغ بیانی سے کیا سروکار۔ ہمارے پاس اتنے موضوعات ابھی باقی ہیں کہ ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ تو جاہلوں کے مشاغل ہیں ہم اس ضرورت کو اس طرح پورا کرتے ہیں۔ دوسرے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ طریقہ کونسا بہتر ہے۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اب چلو کوئی کھیل کھیلیں۔ تاش لاؤں۔ کیرم بورڈ یا شطرنج۔ جو بھی چاہو۔ ابھی ابھی حاضر کیا جا سکتا ہے"۔

"شطرنج تو دقیانوسی کھیل ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں فیل۔ گھوڑ سوار اور پیادے کی جگہ اب بمبار ہوائی جہاز اور مشین گن

ٹیکٹ اور ایجاد ہونے چاہئیں۔ زمانے کیساتھ ان کھیلوں میں ترقی بھی ہونی چاہیئے" میں نے شطرنج کی مذمت کرتے ہوئے کہا۔
اصغر تاش کی بازی لگانے کے حق میں تھا میں اور انصر کیرم کے حق میں [illegible] مگر ہم [illegible] پانچ [illegible]
انتخاب کیا گیا تاکہ سب مشغول ہو سکیں۔ اب ایک اور دقت آن پڑی۔ اصغر فلیش کو ترجیح دیتا تھا۔ انصر اسے گناہ تصور کرتا تھا
مائیکل بھی معصوم تفریح کا قائل تھا۔ کھیلنا تو ایک طرف رہا جوئے کے موضوع پر بحث چھڑ گئی۔

مائیکل: "میرے نزدیک ایسے تمام جسمانی یا ورزشی کھیلوں میں حصہ لینا بہترین تفریح ہے جو ان کو گناہ سے آلودہ نہیں کرتے اسی طرح دوسرے کھیل ہیں مثلاً تاش۔ لڈو۔ کیرم بورڈ۔ شطرنج۔ ڈارٹ بورڈ۔ بلیرڈ۔ پنگ پونگ وغیرہ ایسے مشاغل سے جسم یا دماغ کو کوئی تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ انسانی ذہن دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے تفکرات بھول جاتا ہے۔ انسان کی فطری خواہشِ برتری عود کر آتی ہے۔ ہر کوئی جیتنا چاہتا ہے۔ مقابلہ میں لطف آتا ہے۔"

اصغر: "مگر بازی لگانا بھی اسی لطف میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ مقابلہ زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ ہارنے جیتنے کا سوال اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور ہر حرکت کی بازی لگ جاتی ہے۔ جب کسی ٹورنامنٹ میں کپ یا انعام شامل ہو تو پھر کھیل کس قدر دلچسپ ہوتا ہے اور مقابلہ کتنا سخت ہوتا ہے۔"

مائیکل: "مگر کھیل کپ کے حصول کیلئے کھیلا نہیں جاتا۔ اسکی قیمت ملحوظ نہیں ہوتی بلکہ کپ کے ساتھ جو فتح و کامرانی کی مسرت اور عزت و شہرت منسوب ہوتی ہے کھلاڑی اس کیلئے مرتا ہے۔ چاندی کا تحفہ یا کپ تو معمولی قیمت کا ہوتا ہے یہ رقم تو وہ بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔"

اصغر: "جوئے سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟"

مائیکل: "جوا کھیلنے کے معنی ہیں کہ دوسرے کے نقصان سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

اصغر: "مگر اس نقصان کو برداشت کرنے کیلئے دوسرے رضامند ہوتے ہیں۔ کسی سے زبردستی وصول نہیں کیا جاتا۔"

مائیکل: "بیشک اس کی رضا اس میں شامل ہوتی ہے مگر اس سے مجموعی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ایک کی دولت سمٹ کر دوسرے کے پاس چلی جاتی ہے۔ جوا کھیلو۔ شرط لگاؤ یا گھوڑدوڑ کے ٹکٹ خرید و یا سٹہ کھیلو مسرت بہرحال دوسروں کو رنج پہنچا کر ہی حاصل ہوتی ہے [illegible] ایسی مسرت جسکی قیمت [illegible] اپنے جیسے انسانوں کے آنسو ہوں کبھی انسانیت کے لائق نہیں ہو سکتی۔ یہ بدعت کوئی اب [illegible] میں اور ہر ملک میں قمار بازی کی تباہ کاری رنگ لاتی رہی ہے تاریخ اس کی شاہد ہے۔ کورو پانڈوں کا قصہ

رومن سلطنت کی تباہی اس کی مشہور مثالیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جوا وبا کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ اس مرض کا شکار ہیں۔ شہروں میں رہنے والے کلرک ہوں یا چپراسی، مزدور ہوں یا سرمایہ دار، عورت ہو یا مرد سبھی شام کے اخبارات کی اشاعت کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ کیوں؟ کیا وہ سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں؟ کیا وہ اپنی ملکی ترقی اور بہبودی کے خواہاں ہیں؟ نہیں وہ سٹہ کا بھاؤ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ گھوڑدوڑ کے نتائج سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ تاکہ دیکھیں کہ وہ امیر کبیر ہو گئے ہیں یا پہلے سے بھی زیادہ مفلس۔ لالچ بُری بلا ہے۔ امیر ہونے کے امکانات بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ جوا کھلانے والوں کو فائدہ ؟ آخر ایک شخص کو بہت سا روپیہ بیشمار آدمیوں کی جیب سے ہی حاصل ہوگا۔ ہارنے کا امکان ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ ہارنے کی صورت میں ایک مفلس شخص چوری کا اقدام کرتا ہے۔ ایک غریب کلرک یا چپراسی اتنی استطاعت کہاں رکھتا ہے۔ یہ اُمید ہمیشہ رہتی ہے کہ اگلی دفعہ شاید پچھلا خسارہ پورا ہو جائے۔ وہ پھر داؤ لگاتا ہے اور یہی قمار بازی کا سب سے بڑا عیب ہے کہ ہارنے کی صورت میں انسان کبھی کھیلنا بند نہیں کر سکتا۔ وہ جیتنا چاہتا ہے اور یہی خواہش اس کی تباہی کا پیش خیمہ بنتی ہے جیل کے ریکارڈ اس بات کا ثبوت ہیں اکثر مفلس لوگ اس قمار بازی کی بدولت جیل کی ہوا کھاتے ہیں۔ اکثر غریب کلرک چوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے خاندان کی عزت کو بھی ڈبو بیٹھتے ہیں۔ جوا کسی طرح کھیلا جاتا ہے مقصد ایک ہی ہے۔ تاش، پانسہ، گھوڑے، سٹہ، سٹاک اور شیئرز یہ سب قمار بازی میں شمار ہوتے ہیں۔ سونٹی کارلو جیسے مقامات موجودہ دور تہذیب میں بیشمار ہیں۔ میزوں کے گرد کھیلنے والوں کے چہروں پر نظر ڈالنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کس طرح قمار بازی ان کے ذہن پر مسلط ہو چکی ہے۔ کیا ایسا کوئی کھیل تفریح کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ ذلت اور تباہی ہو"۔

صغریٰ: مگر یہ تو جوا کھیلنے والوں کا اپنا قصور ہے اُنہیں اتنا ہی کھیلنے چاہئے جتنا کہ وہ آسانی سے ہار سکتے ہیں۔

مائیکل: یہی تو بھید ہے کہ انسان ہار کر بھی ہمت نہیں ہارتا جب تک سانس تب تک آس۔ اس لئے ہارنے والا کھیلتا چلا جاتا ہے۔ اُمید کی سُنہری کرن اُسے مسحور کئے رکھتی ہے۔ جُوں جُوں وہ ہارتا ہے جیتنے کا جذبہ اور شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس کی خودی کو ٹھیس لگتی ہے اور اس کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ وہ جیتے۔ شکست کس قدر نفرت انگیز ہے۔ یہی جذبہ لمحہ بہ لمحہ کھیلنے والے کو تباہی کے غار تک لے جاتا ہے۔

اور بڑی بیرحمی سے غار کی تاریکیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ دھماکے کی آواز سے انسان چونکتا ہے مگر بے سود"۔

النصرؔ: اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی شرابی کو دکان میں بند کر دیا جائے اور پھر اس کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے کہ اس نے حد سے زیادہ کیوں پی۔ قمار بازی بھی ایک نشہ ہے۔ شراب کی لت کے برابر"۔

مس روبی: "جب سے برج اور فلیش کا عام رواج ہوا ہے۔ قمار بازی بھی ترقی پذیر ہے۔ بعض سوسائیٹیوں میں تو یہاں تک ان کھیلوں کا جنون ہے کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور شام سے پھر صبح، مگر کھیل جاری رہتا ہے۔ صرف تھوڑا وقفہ کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ برج پارٹیاں مغرب میں بے شمار شادی شدہ اور دوشیزہ لڑکیوں کی عصمت کی بربادی کا باعث بن چکی ہیں۔ وہ اس قدر رقم ہار جاتی ہیں جو اُن کی استطاعت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اپنے شوہر اور والدین کو اس حقیقت سے بے خبر رکھنے کے لئے اپنے مرد دوستوں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتی ہیں اور اس طرح بیشمار عورتیں اکثر بدکردار مردوں کے پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہیں جو اپنا قرضہ وصول کرنے کا سہل طریقہ جانتے ہیں۔ بیشمار عورتوں کی عصمت اس قمار بازی کے بھینٹ چڑھ جاتی ہے"۔

النصرؔ: اسی لئے تو قرآن حکم دیتا ہے کہ اے ایمان والو! بلاشبہ شراب، جُوا، پانسہ اور بُت مذموم شیطانی افعال ہیں۔ اس لئے ان سے پرہیز کرو تاکہ تم پھلو اور پھولو"۔

تاش کی بازی شروع ہوئی۔ آخر ایک تجویز پاس ہوئی یعنی کھیلنے والے ایک یا دو روپیہ سے زیادہ رقم نہ ہاریں جیت کی رقم کھیل کے اختتام پر ایک جگہ جمع کر دی جائے۔ جب کافی رقم ہو جائے تو اسے کسی دن پکنک میں صرف کر دیا جائے جس میں سارے کھیلنے والے شریک ہوں۔ صرف چھٹی کے دن دو تین گھنٹوں کے لئے اس تفریح سے حظ اُٹھایا جائے۔ دونوں فطری ضروریات کی تسکین کا یہ طریقہ اختراع کیا گیا۔ اگلے دن کے لئے پکنک کا پروگرام مرتب کرنے کے بعد ہم رخصت ہوئے۔

چوتھا باب

پکنک۔ پارٹیاں۔ دعوتیں وغیرہ

ریستوران میں احباب وقت مقررہ پر حاضر تھے۔ پکنک کا سامان مہیا کر کے جانب دریا روانہ ہو گئے لاری میں اسی موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔

مائیکل"۔ کھانا اور پینا فطری جسمانی ضرورت بھی ہے اور ذائقہ کی لذت اس فعل کا اہم جزو ہے۔ انسان سماجی حیوان ہے۔ اس لئے وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کھانے پینے میں ایک مسرت محسوس کرتا ہے یہ مسرت وہ پکنک، ڈنر، چائے یا گارڈن پارٹی یا شادی کی دعوت کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ مقصد تو افراد کو جمع کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب سماجی خواہش کی بدولت عمل میں آتا ہے۔ کھانے پینے سے لطف اُٹھانا ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ ایسے مواقع مہیا کرنا یا ان میں شامل ہونا اخلاقی نکتۂ نگاہ سے جائز ہیں۔ صرف اتنی احتیاط لازمی ہے۔ کہ زبان قابو میں رہے۔ کیونکہ باتیں کرنا ایسے مواقع پر ہی مرغوب ترین مشغلہ ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے کم قیمت تفریح ہے جس کو ہم زیر بحث لا چکے ہیں۔ گفتگو کے علاوہ کھیل۔ تماشے۔ موسیقی اور رقص بھی ایسے مواقع کے لوازمات ہو سکتے ہیں۔ غیبت، چغلی، افواہ اور دروغ بیانی سے اجتناب کے علاوہ اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ایسے مواقع پر مفلس ونادار ہمسائے اور رشتہ دار بھی فیض یاب ہو سکیں۔ کیونکہ عام طور پر صاحب ثروت لوگ ہی ایسی دعوتوں کا انتظام کر سکتے ہیں اور مدعو بھی امراء

اور رؤسا کو ہی اکثر کیا جاتا ہے۔ لذیذ کھانے صاحب ثروت لوگوں کے لئے اتنی جاذبیت نہیں رکھتے۔ جتنی کہ عزت وشہرت کی بھوک کی تسکین۔ اس لئے بچے کھچے کھانے کی بجائے مفلس ونادار لوگوں کو اچھے اور لذیذ کھانے کھلانے چاہئیں تاکہ حقیقی مسرت حاصل ہو۔"

النصر: اس امر کو میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ فارغ البال مسلمان عید اور بقرعید کے تہواروں پر تحفے تحائف ایسے اشخاص کو بھیجتے ہیں جو اُن کی طرح صاحب ثروت ہوتے ہیں۔ قربانی کے جانور کا گوشت اسلامی حکم کے مطابق تین حصّوں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ ایک حصّہ اپنے لئے۔ ایک مفلسوں کے لئے اور ایک حصّہ اعزا و اقربا کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اچھا گوشت تو اُن لوگوں کی نذر ہو جاتا ہے جو سارے سال گوشت کی لذّت سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے گوشت کوئی جاذبیت نہیں رکھتا۔ قربانی کا گوشت ایسے لوگوں کو عموماً بھیجا جاتا ہے جو خود بھی قربانی کا گوشت بطور تحفہ بھیجنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپس میں ایک قسم کا تبادلہ گوشت قرار پاتا ہے۔ یعنی اس طرح دُوسرا حصّہ بھی اپنے پاس ہی رہتا ہے اور تیسرا جو غربا ومساکین کا حق ہے اس میں سے برائے نام تھوڑا سا فقیروں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اس لئے خواہ میرے صاحب ثروت اعزا و اقربا مجھ سے کشیدہ خاطر رہیں میں تو اُن کو گوشت نہیں بھیجتا۔ جو احباب، رشتہ دار اور ہمسائے قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میں اُن کو گوشت بھیجتا ہوں تاکہ تبادلہ نہ ہو سکے۔ احباب کی دعوت کے لئے گوشت بچا کر باقی سب گوشت مفلس ونادار لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہوں مجھے جو مسرت ان لوگوں کو کھلا کر ہوتی ہے۔ وہ صاحب ثروت لوگوں کو کھلانے سے نہیں ہوتی۔"

مائیکل: بے شک یہ اخلاقی کمزوری ہے کہ دولتمندوں سے زیادہ راہ ورسم رکھی جاتے۔ کیونکہ ان سے فائدہ پہنچنے کا امکان ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت ہے۔ جس کے طفیل ایک بدکردار شخص دولت کے چمکیلے لباس سے اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔"

النصر: اور وہ مسلمان جو سوائے خدا کے کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ ایک انسان کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے۔ اُس کی خوشامد کرتا ہے۔ خدا سچا ہے اور اس لئے مسلمان کو باطل کے

آگے کبھی سرنگوں نہیں ہونا چاہیئے۔ باطل کیا ہے۔ یہی انسان کی فطری کمزوریاں۔ جن پر فتح حاصل کرنا انسانیت کی فتح ہے اور انسانیت کی فتح اللہ کی شیطان پر فتح ہے۔"

"ان خاص مواقع کے علاوہ تعطیل کا دن کیونکر گذارنا چاہیئے۔" میں نے سوال پیش کیا۔

انصر: پہلی بات تو یہ ہے کہ اتوار۔ جمعہ یا منگل کا دن ہر ہفتہ میں مختلف مذاہب نے بطورِ تعطیل اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ انسان آرام اور تفریح کر سکے اور ساتھ ہی مذہبی امور کی ادائیگی اور تعلیم کے لئے ہفتہ میں ایک دن خاص طور پر مفید بنا سکے۔ عیسائیوں کا اتوار۔ مسلمانوں کا جمعہ ہندوؤں کا منگل وغیرہ سب اسی مقصد کو لئے ہوئے ہیں۔ تاکہ ہر شخص اس دن آرام کر سکے اور مذہبی تعلیم حاصل کر سکے۔ کیونکہ کاروباری اوقات میں سب کا ایک ہی جگہ جمع ہونا ایک مشکل امر ہے۔ ایک دن کے لئے دُنیاوی دھندوں سے نجات اس تعطیل کا مقصد ہے۔"

مائیکل: "مگر ہوتا کیا ہے۔ اس کی تصویر میں پیش کرتا ہوں۔ مغرب میں اتوار کے جشن بڑے مقبول ہیں۔ ہفتہ کی شام تک مہمان آجاتے ہیں۔ ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا جاتا ہے۔ موسیقی و رقص اور برج کا کھیل آدھی رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ اتوار کی صُبح کو نو بجے سے گیارہ بجے تک ناشتہ کھلانے میں نوکر مصروف رہتے ہیں۔ کچھ مہمان رسماً گرجا جانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے گھوڑے اور گاڑیوں کا بندوبست نوکروں کے ذمہ ہوتا ہے۔ جب تک مہمان واپس نہیں آتے۔ گھر والے اور نوکر چاکر دوپہر کے کھانے کے انتظام میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ مہمان گولف کے کھیل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیہات کے گردونواح کی سیر کے لئے چلے جاتے ہیں پھر شام کی چائے کا وقت ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کچھ اور مہمان بھی پہنچ جاتے ہیں۔ بیچارے خدام ان کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ شام سے رات تک پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آدھی رات گئے تک نوکر چاکر ذرا کمر سیدھی کرتے ہیں کہ صبح ہو جاتی ہے اور انہیں علی الصبح ہی ناشتہ اور سواری کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ میزبان کے جانے کے بعد وُہی روز کا معمول اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اب عیسائیت کے نقطہ خیال سے غور کیجیئے۔ یہ کس قدر اتوار کے مقصد کے منافی ہے حضرت عیسےٰ نے تو اس لئے اتوار کو دُنیاوی کاروبار کی ممانعت کی تھی تاکہ تمہاری خادمہ اور خادم کو تمہاری طرح

آرام کا دن نصیب ہو۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ بیچارے ملازم جو چھ دن محنت اور مزدوری کرتے ہیں۔ تعطیل کے دن ان سے دوگنا، سہ گنا کام لیا جائے۔ اُن کی صحت ہماری امانت میں ہے۔ کیا اس ذمہ داری سے اسی طرح عہدہ براری کی جاتی ہے کہ بجائے چھٹی دینے کے ان سے اور زیادہ کام لیا جائے۔ ان کی صحت کو تباہ کیا جائے۔ یہ اتوار کا جشن ان کے اپنے لئے تو تعیش کا روزہ ہے مگر خادموں کے حق میں صریحاً ظلم ہے۔ کیا یہ جشن کسی اور دن ممکن نہیں ہے۔ یہ امر تو عیاں ہے کہ جو دعوتیں دینے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ وہ جس دن چاہیں جشن منا سکتے ہیں۔ ان کے لئے تو تعطیل کا انتظار کوئی ضروری نہیں ہوتا۔ وہ کسی دن بھی اپنے احباب کو مدعو کر سکتے ہیں۔ مگر اپنے ملازمین کو ان کے حق سے محروم کرنا سراسر ظلم، گناہ اور بے انصافی ہے۔ ان کا دل بھی گھر جانے کو چاہتا ہے۔ آرام اور تفریح کے لئے جی ترستا ہے۔ انہیں اس سے باز رکھنے کا ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام ہے"۔

افسر:- اتوار، جمعہ یا کوئی اور چھٹی کا دن کس طرح بسر کرنا چاہیئے؟

مائیکل:- اس سلسلے میں دو باتوں کو اصول تصور کر سکتے ہو۔ ایک یہ کہ چھٹی کا دن کسی نہ کسی مذہبی تقریب سے وابستہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تعطیل کا مقصد جسمانی اور ذہنی محنت و مشقت سے کنارہ کشی ہے یعنی آرام اور تفریح کے ذریعے تازہ دم ہو کر پھر زندگی کی جنگ کے لئے تیاری۔ اب رہا سوال کہ تفریح کس قسم کی ہونی چاہیئے تو اس کے لئے کوئی قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہر فرد اپنی پسند کا مالک ہے اور حالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دولتمند شخص ہفتہ کا مزدن ٹینس کھیلنے یا اچھے موٹر پر سیر کرنے میں گذار سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک کلرک یا مزدور کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ چھ دن میں سوائے کام کے کوئی تفریح کے لئے وقت نکال سکے۔ اس لئے اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ چھٹی کے دن خوب کھیلے۔ سیر کرے۔ سائیکل پر شہر سے باہر نکل جائے۔ دریا میں نہائے۔ ذہن کو آرام کا موقع دے۔ مجھے تو کوفت ہوتی ہے۔ جب لوگ گھر آکر شام بھی دفتر کی باتیں دہرانا شروع کر دیتے ہیں۔ چھٹی کے دن دوسروں کو اپنی کاروباری اور دفتری زندگی کی غیر دلچسپ باتیں سناتے ہیں۔ چھٹی کے دن سب تفکرات سے نجات حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ دفتر کی باتیں دفتر میں ہی مقفل کر دینی چاہئیں۔ زندگی جینے

کا نام ہے۔ اس لئے ایک دن تو جینا سیکھو۔ ایک دن آزاد رہنا سیکھو گے تو باقی چھ دن کی غلامی سے بھی نجات حاصل کرنے کی راہ سوچ لو گے۔ کھیلنا، کھانا، ناچنا، گانا اگر سوموار کو جائز ہے تو اتوار یا جمعہ کو ناجائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اتوار کو مذہبی رہنماؤں کی نگاہ میں ٹینس کھیلنا وغیرہ گناہ ہے مگر جس کو سوائے اتوار کے اور کوئی دن ہی تفریح کے لئے نصیب نہ ہو، وہ بیچارہ کیا کرے۔ میں نے اصول یہ وضع کیا ہے کہ جو لوگ چھ دنوں کیلئے اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ وہ ہر تفریح اور کھیل سے شام کو یا کسی اور وقت لطف اندوز ہو سکیں۔ ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ چھٹی کے دن انہی تفریحات میں وقت گذارنے کی بجائے کوئی اور مفید کام سرانجام دیں۔ اپنے ہمجنسوں کی بھلائی کے لئے قدم اٹھائیں۔ بدنصیب انسانوں کی کوئی خدمت کریں۔ ان کے لئے ہر روز عید ہے۔ ہر روز اتوار ہے۔ اس لئے اتوار کو بھی وہی مشاغل اختیار کرنا کوئی احسن فعل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چھٹی ان کا حق ہے جو محنت و مشقت کرتے ہیں۔ جو چھ دن قید میں گذارتے ہیں۔ دفتر اور دکانیں جیل سے کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ ایک دن کھلی ہوا میں آزادی کا سانس لیں۔ جیسے ہمارے سعید صاحب اور جو چھ دن آزادی کی ہوا کھاتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی سنجیدہ شغل ہی مناسب ہے۔"

اتنے میں دریا کا پل آ گیا۔ ہم لوگ اتر کر کسی سایہ دار جگہ کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔ پھر لکڑیاں چُنی گئیں۔ چولھا بنایا گیا۔ دری بچھا دی گئی اور گراموفون سے موسیقی کا چشمہ ابل پڑا۔ ایک ایک فرض سب کو سونپ دیا گیا۔ کوئی آلو چھیلنے لگا تو کوئی پیاز کاٹنے لگا۔ ہاتھ کام میں مصروف تھے۔ زبان گفتگو میں مشغول تھی۔ کان موسیقی سے معمور تھے۔ نظریں قدرتی مناظر سے لبریز تھیں۔ مس روبی نے انگریزی ناچ کا ریکارڈ لگا دیا اور اپنے حسین جسم کو حرکت دی۔

"موسیقی بھی کیا سحر ہے اور جب حسن اسے سرانجام دے تو پھر سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔" اصغر گویا ہوا "مائی کل"۔ رقص اور موسیقی توام بہنیں ہیں۔ موسیقی حسنِ صوت ہے تو رقص حسنِ حرکت ہے۔ فضا موسیقی سے جب معمور ہوتی ہے تو انسانی ذہن پر ایک سکوت سا طاری ہو جاتا ہے۔ ایک کیف سا محسوس ہوتا ہے۔ اگر موسیقی ناچ کی قسم سے ہو تو خود بخود انسانی اعضا متحرک ہو جاتے ہیں۔ حسن صورت و صوت انسان کے لئے بے پناہ کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، ولی اللہ ہو یا گنہگار، موسیقی

سب کے لیے یکساں طور پر سحر طراز ہے۔ موسیقی کان کے پردوں کے ذریعے ذہن کو مسحور کرتی ہے تو رقص آنکھوں کی پتلیوں کے ذریعے ذہن کو مسخر کرتا ہے۔"

"رقص اور موسیقی کی تاریخ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل: "تمام زمانوں میں موسیقی اور رقص انسانی جذبات کی ترجمانی کرتے آئے ہیں۔ قدیم دور تہذیب میں تو ان دونوں کو عبادت میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ موسیقی تو اب بھی کئی مذاہب کی عبادت کا ایک جزو ہے۔ اگرچہ رقص کو عیسائیت اور اسلام میں کوئی مذہبی درجہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن مغرب میں رقص بیحد مقبول ہے۔ رقص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو رقص دیکھنا دوسرے تفریحاً رقص میں حصہ لینا۔"

"رقص کے کمالات کے مظاہرے سے لطف اندوز ہونا اخلاقاً کہاں تک جائز ہے؟" میں نے پوچھا

مائیکل: "مہذب رقص کے کمالات کا مظاہرہ جائز ہے۔ ایسا رقص جو آرٹ کا حامل ہو۔ اکثر رقص اس قسم کے ہوتے ہیں جن کی دلکشی کا باعث صرف عورت کا وجود ہوتا ہے۔ عورت کا حسین جسم برہنہ یا نیم برہنہ حالت میں ایک خاص انسانی طبقہ کے لیے جاذب نظر ہوتا ہے۔ یہ جنسی بھوک کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ تسکین تو کیا ہو سکتی ہے البتہ جذبات ضرور مشتعل ہو سکتے ہیں۔ تسکین تو صرف انہی اشخاص کو حاصل ہو سکتی ہے جو صرف جمالیاتی ذوق کی ذہنی تسکین چاہتے ہیں۔ اصول یہی قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص اس معاملے میں اپنی سمجھ سے کام لے۔ اگر وہ ایسے رقص کا متحمل ہو سکتا ہے اگر وہ شادی شدہ ہے اور کسی قسم کی ترغیب گناہ محسوس نہیں کرتا تو اس کے لئے ایسے رقص سے لطف اندوز ہونا جائز ہے۔ اگر وہ کنوارا ہے اور ایسے رقص اس کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں تو یقیناً اس کے لئے ناجائز ہیں۔ میری رائے میں کنواروں کو ایسے رقص دیکھنے سے پرہیز ہی رکھنا مناسب ہے۔ اسی طرح نابالغ بچوں کیلئے عشقیہ یا جنسی فلمیں اور رقص وغیرہ ممنوع ہونے چاہئیں۔ اس میں ان کی اپنی بھلائی مضمر ہے۔"

"اچھا تو تفریحی رقص کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل: "رقص بطور ایک سماجی تفریح مجھے بہت پسند ہے۔ مشرق میں اس کا عام رواج نہیں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جو اقوام مرد عورت کے آزادانہ میل ملاپ کی حامی نہیں ہیں۔ ان کی معاشرتی اور مجلسی زندگی میں تفریحی رقص و موسیقی کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ مگر جو لوگ مرد عورت کے ملاپ کو بری نظر

نہیں دیکھتے۔ ان کے سماج میں شام یا رات کا رقص بطور ایک تفریح بیحد مقبول ہے۔ یہ رقص بھی ایک کھیل یا تفریح کی حیثیت رکھتا ہے اور معصومانہ طریق سے اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ انصر آپ کا کیا خیال ہے؟"

انصر: "مذہب تو اصولاً لہو و لعب سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ گناہ کی ترغیب عمل میں نہ آئے۔ اسلام بھی تعیش کو پسند نہیں کرتا۔ پاکیزہ موسیقی اور رقص سے حظ اُٹھانا ممنوع نہیں۔ باقی رہا تفریحی رقص کا سوال تو اس کے لئے مشرق کی طرزِ معاشرت میں کوئی جگہ نہیں۔ اسلامی احکام پردہ کی موجودگی میں اس کا جائز یا ناجائز ہونا خارج از بحث معاملہ ہے۔"

مس روبی: "میں رقص کی دلدادہ ہوں۔ مگر مجھے ایک اعتراض ہے کہ تفریحی رقص عام طور پر رات کو دیر میں شروع ہوتا ہے اور آدھی رات گذرنے کے تین چار گھنٹہ بعد جا کر کہیں ختم ہوتا ہے۔ اس سے جسم و صحت کو از حد تکلیف پہنچتی ہے۔ نیند کی کمی اور اس پر کثرت شراب نوشی کا اثر دوسرے دن عموماً نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ناچ شام کو غروب آفتاب کے بعد ہی شروع ہو جانا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے گیارہ بجے ختم ہو جانا چاہئے۔ اس قسم کا قانون میرے خیال میں ضرور وضع ہونا چاہئے تاکہ رقص گاہیں وقت مقررہ پر بند ہو جائیں۔"

مائیکل: "مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ حد سے تجاوز کرنا اپنے ہی حق میں مضرت رساں ہے۔"

انصر: "اس رقص سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟"

مائیکل: "تفریحی رقص بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ رقص ایک قدرتی خواہش ہے۔ اس لئے انسانی ضرورت بھی ہے۔ ورزش کی ورزش اور تفریح کی تفریح۔ اچھا رقص کرنے کے لئے جسم کا کسرتی ہونا لازمی امر ہے بے ڈول جسم سے رقص میں بھدا پن آنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ رقص نوجوان مرد عورت کو باہمی میل ملاپ کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔ اجنبیت دُور ہو جاتی ہے اور اس طرح اپنے لئے شریکِ زندگی کے انتخاب کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ تفریحی رقص سے ہفتہ میں ایک دو دفعہ لطف اندوز ہونا چاہئے۔ ہر روز یہی پروگرام مناسب نہیں۔ دُنیا میں اور کام بھی ہیں اور صحت کے لئے نیند لازمی چیز ہے۔"

النصرؔ:۔ مگر اس قسم کے رقص سے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میرے سننے میں یہی آیا ہے کہ رقص کے دوران میں مرد عورت اپنے اخلاق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور آزادانہ جنسی بھوک کی تسکین کرتے ہیں۔"

مائیکل:۔ یہ کہنا حقائق سے لاعلمی کا اظہار ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی سماج میں بچپن سے ہی لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کی موجودگی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ وہ لڑکپن سے ہی رقص کا درس لینا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح عادی ہو جاتے ہیں۔ عورت کا لمس ان کے لئے بجلی کا جھٹکا نہیں رہتا جیسا کہ مشرقی سماج میں۔ مرد عورت کے جسم یا ہاتھوں کا مس ہونا کوئی انوکھی بات نہیں رہتی۔ رقص میں حصہ لینے والے مہذب ہوتے ہیں۔ البتہ بدکردار مرد عورت ہر سماج میں پائے جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکی جو دیہات میں پلی ہو۔ اسے یکلخت کسی عالی شان رقص گاہ میں ناچنے کا موقع میسر آ جائے۔ اس کے جذبات بھڑک اٹھیں اور کسی مرد کی چاپلوسی کا شکار ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے اس کا اصول یہ ہے کہ جو مرد عورت رقص گاہ کے ماحول کے متحمل نہیں ہو سکتے جو موسیقی کا جنسی ترغیب اور رومانی فضا کا مقابلہ نہیں کر سکتے جنہیں گناہ کی ترغیب ہوتی ہے اور جنہیں اپنے جذبات پر عبور حاصل نہیں ہے۔ ان کیلئے رقص میں حصہ لینا یقیناً گناہ ہے۔ ان کے لئے یہ معصوم تفریح بھی نامناسب اور ناجائز ہے مگر ایسے مرد عورت جو رقص سے معصومانہ طور پر حظ اٹھا سکتے ہیں۔ انہیں اس سے مسرت حاصل کرنے کا حق ہے ان کو رقص کرنے دو۔ جہاں تک وہ کسی بھی قول و فعل سے قانونِ زندگی کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ انہیں ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ ہر چیز سے لطف اٹھاؤ۔ فطری ضروریاتِ زندگی کو پورا کرو مگر گناہ سے دامن کو آلودہ نہ ہونے دو۔ اگر موسیقی اور رقص تمہیں خدا۔ سچائی۔ نیکی کے راستے سے گمراہ کرنا چاہتے ہیں یا تم خطرہ محسوس کرتے ہو تو ان چیزوں سے پرہیز کرو۔ تمہیں ان سے مسرت حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کسی کی آبروریزی کی سعی کرنا نہایت مذموم فعل ہے۔ رقص اور موسیقی پاکیزہ چیزیں ہیں۔ ان کو اپنے گندے خیالات سے آلودہ نہ کرو۔ جو فعل انسانیت کے شایانِ شان ہے وہ کرو۔ نیکی اور سچائی کے راستے پر گامزن رہو یا مذہبی اصطلاح میں اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے رہو۔ خود جیو اور دوسروں کو جینے دو۔ خود پاکیزہ رہو اور دوسروں کی عصمت کا تحفظ کرو۔ اس قانون پر عمل پیرا ہو کر خوب رقص کرو۔

حسن سے ہم آغوش رہو۔ موسیقی سے ہمکنار رہو۔"

اور یہ کہکر مائیکل نے روبی کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ نغمہ رقص پُر کیف تھا۔ موسیقی کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ "ہم کس قدر خوش نصیب ہیں جو ایسے وقت میں پیدا ہوئے۔ موسیقی ریکارڈوں میں بند ہماری خدمت میں ہر وقت دست بستہ حاضر ہے۔ بہترین موسیقار اک پل میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ ریڈیو دنیا کے بہترین موسیقاروں۔ رقاصوں۔ ادیبوں اور شاعروں کو ہماری خدمت میں روزانہ پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں سینما کا پردہ جادو کا وہ قالین ہے جو ہمیں گھر بیٹھے ہر ملک کی سیر کراتا ہے۔ اس قدر آسائشات اور مسرتوں پر میں تو کبھی پرانے وقتوں کو ترجیح نہیں دوں گا۔ کیا پوپلے منہ سے کہہ دیتے ہیں کہ گیا گذرا زمانہ بڑا اچھا تھا۔ خاک اچھا تھا۔ نہ جلنے کا شعور تھا۔ وقت بیکار صرف ہوتا تھا۔ اب بھی کسی کو اگر پرانے وقتوں سے عشق ہے تو اسے چاہئے کہ وہ دیہات میں جا رہے۔ جہاں وقت صدیوں سے گاؤں کے گندے پانی کے جوہڑ کی طرح سڑ رہا ہے اور دیہاتی اس گندی فضا میں کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مرجھاتے ہیں۔ میں تو کاش اور ایک صدی بعد پیدا ہوا ہوتا۔" میں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد ہم کشتی میں بیٹھ کر سیرِ دریا کو نکل گئے۔ واپس آئے تو کھانا تیار ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد تاش کا کھیل شروع ہوا۔ کچھ دیر کھیلنے کے بعد گھاس پر لیٹ گئے۔ مائیکل اور روبی رازو نیاز کی گفتگو میں مصروف تھے۔ اصغر بیحد ملول ہو گیا تھا۔ آہ بھر کر کہنے لگا "میری بھی کوئی زندگی ہے۔ رشتہ حیات سے تو زندگی بھر کے لئے نفرت ہو گئی ہے۔ میری بیوی میرے دل سے اُتر چکی ہے۔ مگر طلاق کے بغیر نجات ناممکن نظر آ رہی ہے۔" ہم سب ششدر رہ گئے "اتنی جلدی کیا شادی سے طبیعت سیر ہو گئی؟ انصر طلاق کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی چلو یہی موضوع سہی۔" مائیکل نے کہا۔

انصر "جو مذاہب طلاق کو روا نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً عیسائیت۔ وہ بھی اپنے اپنے دستورِ شادی میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ طلاق کے متعلق قوانین وضع کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کس قدر مضحکہ خیز امر ہے کہ زبان سے جو ایک دفعہ گرہ دے دی جائے۔ دوبارہ

اسے دانتوں سے کھولا نہیں جا سکتا۔ شادی آخر کیا ہے۔ فقط ایک اقرار نامہ۔ ایک عورت بہ اپنے شریکِ زندگی سے نفرت کرتی ہے اس کے ساتھ اس کو زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا کہاں کی دانائی ہے۔ ایک مرد جو اپنی بیوی سے نفرت کرتا ہے۔ اسے اس کے ساتھ نباہ کرنے پر مجبور کرنا سراسر حماقت ہے۔ جن مذاہب نے اب تک طلاق کے اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ فطرت سے بیکار جنگ کر رہے ہیں۔ ایک میاں بیوی کے باہمی تعلقات کو جو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ کس طرح سماج میں جائز قرار دے سکتی ہے۔ جبکہ ان کا ضمیر اور فطرت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ بیوی خاوند سے نفرت کرتی ہے۔ مگر سماج اسے اس بندھن سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ کیا اس طرح مرد زنا بالجبر کا مرتکب نہیں ہوتا۔ جب مرد عورت میں باہمی محبت اور رفاقت مفقود ہے تو شادی کا مقصد ہی فنا ہو جاتا ہے۔ شادی اسی رفاقت اور محبت کا عہد و پیمان ہے۔ ایک اقرار نامہ ہے جو دونوں کی رضا سے وجود میں آتا ہے۔ اگر ایک فریق اس اقرار نامے سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا قدرتی حق ہے۔ کاروباری معاملات کا بھی یہی دستور ہے۔ جب کبھی عہد نامہ کی شرائط پر عمل درآمد نہیں ہوتا تو اس پر عمل نہ کرنے والے کو ہرجانہ دینا لازمی ہے جس کی ادائیگی کے بعد وہ آزاد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح شادی کا عہد نامہ ہے۔ اگر مرد عورت کو طلاق دے تو اسے مہر کی رقم ادا کرنی ضروری ہے اور اگر عورت طلاق چاہے تو اسے مہر کی آدھی رقم وصول کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔"

مس ربی: "مگر کیا یہ عورتوں کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی نہیں ہے کیا طلاق عورت کی ہتک کے مترادف نہیں؟"

النصریہ: بالکل نہیں، بلکہ طلاق عورت کے حقوق کی محافظ ہے۔ اس کی آزادی کی علمبردار ہے۔ ایک عورت جب ایک ظالم، بدکار اور وحشی خاوند سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے تو طلاق اس کو اس قید سے نجات دلاتی ہے۔ قانونِ طلاق دونوں کے لئے یکساں مفید ثابت ہوتا ہے جو مرد عورت صحبتِ غیر جنس کے بارے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں جو زندگی میں صحیح رفاقت کے طالب ہیں جو جیتے جی زندہ درگور رہنا نہیں چاہتے۔ ان کے لئے یہ قانون نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ آزادی کا یہ پروانہ ہر مرد عورت کو اپنے لئے نئے سرے سے رفیقِ صادق اور مخلص عاشق کے انتخاب کا موقعہ دیتا ہے

اسلام دُنیا کا پہلا مذہب ہے جو اخلاقی رہنماؤں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرواتا ہے جو عورت کی تعظیم اور آزادی کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف اس کی زبردستی شادی نہیں کی جا سکتی اور مجبوری کی حالت میں وُہ خاوند کو طلاق دے سکتی ہے"۔

مائیکل:۔ اس مجبوری کی وضاحت فرمائیے۔ طلاق کس حالت میں مجبوری کا درجہ اختیار کرتی ہے"۔

النصر:۔ قرآن میں اللہ اس کے متعلق یُوں فرماتا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے علیحدگی کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں۔ ان کے لئے چار مہینے انتظار کرنا ضروری ہے۔ اگر وُہ اپنے ارادہ کو تبدیل کر دیں تو اُنہیں اپنی بیویوں کے پاس مراجعت کرنے کی اجازت ہے۔ اللہ بیشک مہربان ہے۔ اگر اس مدت کے گذرنے پر ان کے ارادہ میں کوئی تبدیلی نہ آئے اور طلاق کا تہیہ کر لیں تو اللہ ہی وُہ قوت ہے جسے سب چیزوں کا عرفان ہے۔ اسی طرح عورت کے لئے بھی یہی قاعدہ مقرر ہے قرآن کے احکام کے مطابق طلاق کا دستور یہ ہے کہ خاوند ہر ممکن طریقے سے مصالحت کی کوشش کرے تاکہ باہمی اتفاق و ارتباط ممکن ہو جائے جو نقائص وُہ بیوی میں پاتا ہے یا جو عیوب اُس کی بیوی برداشت نہیں کر سکتی۔ اُن کے دفیعہ کا انتظام کیا جائے۔ اگر فساد کی جڑ اختلاف رائے ہے تو خاوند کو ایثار سے کام لیکر اپنے الفاظ واپس لینے چاہئیں تاکہ صلح ہو جائے اور گھر میں بدامنی کی بُنیاد نہ رکھی جائے۔ اس طرح بیوی کی خوشنودی حاصل کر کے ازدواجی زندگی کو پھر سے استوار کر لے۔ لیکن اس صورت میں کہ خاوند کی تمام مخلصانہ کوششیں بیکار ثابت ہوں اور مصالحت غیر ممکن ہو جائے تو وُہ کچھ عرصہ کے لئے بالکل علیحدگی اختیار کر لے۔ اس پر بھی اگر کوئی اُمید کی صورت نظر نہ آئے اور یقین ہو جائے کہ اُس کی بیوی وفادار اور اطاعت گذار ثابت نہ ہو سکے گی تو واضح الفاظ میں طلاق دے دے یعنی اس فقرے کا مفہوم یہ ہو کہ میں طلاق دیدوں گا اور یہ کہ تیسری دفعہ طلاق کے الفاظ دُہرانے پر پھر وُہ کبھی اپنے الفاظ واپس نہیں لے گا۔ پہلی دفعہ طلاق دینے کے وقت یہ ضروری ہے کہ بیوی ماہواری ایام سے فارغ ہو۔ طلاق کا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد یہ لازمی ہے کہ میاں بیوی ایک مہینے کے لئے قطعاً علیحدہ رہیں یعنی ان کے جسمانی تعلقات بالکل منقطع ہوں۔ اگر ایک مہینہ کے اندر بیوی مصالحت پر آمادہ ہو جائے یا خاوند اپنے الفاظ واپس لینا چاہے تو وُہ بخوشی ایسا کر سکتا ہے۔ اللہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ اگر اس مہینہ کے

اختتام پر بھی طلاق کا ارادہ تبدیل نہ کیا جائے تو طلاق کے الفاظ واضح طور پر ادا کرنے لازمی ہیں۔ دوسرے مہینے کے اختتام تک بھی مصالحت کی اجازت ہے۔ اگر سمجھوتہ نہیں ہوتا تو خاوند دوبارہ کہے کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں تیسرا مہینہ فیصلہ کن اور آخری مہینہ ہے۔ اس کے اختتام تک میاں بیوی ازدواجی زندگی از سر نو شروع کر سکتے ہیں۔ ان کو مذہب کی طرف سے کوئی گرفت نہیں مگر تیسری دفعہ طلاق کے الفاظ ادا کرنے پر طلاق مکمل ہو جاتی ہے اور الفاظ واپس نہیں لئے جا سکتے اور وہ قانونی طور پر علیحدہ ہو سکتے ہیں طلاق کے ارادہ کو ملتوی کرنے میں دونوں کی بھلائی ہے۔ وہ اچھی طرح اپنے اقدام پر تنقید کر سکتے ہیں۔ ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہوگی تو یہ امر مخفی نہیں رہ سکتا۔ یہ امر بھی مصالحت پر آمادہ کرنے کا زبردست باعث بن سکتا ہے اگر وہ حاملہ نہیں ہے تو اس کو اختیار ہے کہ جس مرد سے چاہے۔ شادی کرلے۔ خاوند کو اس کے راستے میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ قانونی طور پر اس کو منع نہیں کر سکتا۔ بالفرض وہ حاملہ ہے اور چاہتی ہے کہ بچے کی پیدائش تک انتظار کرے تو خاوند کو قانوناً عورت کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد دو سال تک عورت ضروریاتِ زندگی کے لیے پریشان نہیں ہو سکتی۔ مرد قانوناً ان اخراجات کا کفیل ہو گا۔ اگر عورت اپنی رضامندی سے یہ اخراجات نہ لینا چاہے یا شادی کرلے تو اور بات ہے۔ کفالت کے دوران میں سابقہ شوہر کو عورت پر کوئی حق نہیں رہتا۔ اس کی حیثیت بالکل اجنبی مرد کی سی ہے جس سے پردہ لازمی ہے۔ عورت کو ملنے یا اس سے گفتگو کرنے کا اسے کوئی قانونی حق نہیں رہتا۔ اخراجات کا کفیل ہونا اسے عورت پر کوئی حقوق نہیں دلاتا۔ اسی طرح اگر مرد عورت پر ظلم کرے اور اُسے طلاق بھی نہ دے عورت سے نفرت بھی کرے مگر آزادی بھی دینا نہ چاہے تو عورت قانونی طور پر طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ آپ لوگ خود ہی انصاف کریں کہ طلاق عورت کی بھلائی کے لئے ہے یا نقصان کیلئے ہے طلاق کے قوانین کے بغیر کوئی دستورِ شادی مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ طلاق کے محاسن پر کچھ اور زیادہ کہنا بیکار ہے۔ کیونکہ یورپ اور امریکہ جو عیسائیت کا گھر ہے۔ وہاں مسلم ممالک سے کہیں زیادہ طلاق کا رواج ہے۔ اس کی وجہ طلاق کے خام قوانین ہیں۔ اسلامی طریقہ طلاق ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی ہے۔ طلاق لینے یا دینے کی وہی سعی کرے گا جو قطعاً مجبور ہو جائے۔ مرد عورت جب تک اس طریقہ پر عمل پیرا نہیں ہوں گے۔ طلاق سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ سماج کو ایسا طریقہ اختیار کرنا ہی ہوگا۔ میں طلاق کے مسئلہ پر اس لئے زور دے رہا ہوں

تاکہ وُہ اقوام جو شادی کی مسرتوں سے تو آگاہ ہیں مگر طلاق کے فوائد سے لاعلم ہیں۔ وُہ اپنے قوانین شادی میں ترمیم کر سکیں۔ ہر مرد کا فرض ہے کہ وُہ اپنے بدنصیب بھائیوں کو انکی فضول خرچ اور بیوفا بیویوں کے چنگل سے آزاد ہونے میں اعانت کرے۔ ہر عورت کا فرض ہے کہ وُہ اپنی مظلوم بہنوں کو ظالم اور عیاش مردوں کے پنجے سے نجات دلانے کی سعی کرے۔ مغربی عورتیں اس بات پر کمر بستہ ہیں کہ ان کو خاوندوں سے آزادی دلائیں۔ اُن مردوں سے جو کورٹ شپ کے دنوں میں اک اشارے پر جان دینے کو تیار تھے مگر شادی کے بعد محبت کے خطوط لکھنے والا عاشق عنقا ہو گیا۔ وُہ ان محبت اور خوشامد بھرے الفاظ کو ترستی ہیں۔ جنہوں نے اُن کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ حکومت خاوندوں کو بیویوں کی پرورش کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اُن کی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں اعانت کر سکتی ہے۔ مگر خاوند کی محبت کا نعم البدل وُہ کہاں سے دستیاب کریں گی۔ وُہ بدنصیب عورتیں کس کے پاس فریاد لے کر جائیں۔ جن کے مذہب میں شادی کی پابندی تو ہے۔ مگر طلاق کی آزادی نہیں۔ ایسی عورتوں کے زخم سوائے طلاق کی مرہم کے مندمل نہیں ہو سکتے۔ اب بھی وقت ہے کہ سماج آنکھیں کھولے اور طلاق کو مجبوری کی حالت میں جائز قرار دے۔ یونانی، رُومی اور شامی مردوں کو تو طلاق دینے کا حق حاصل ہے۔ مگر عورتوں کو نہیں۔ اسلام پہلا مذہب ہے۔ جس نے عورت کو طلاق کا حق دیا۔ عیسائیت نے بھی تسلیم کر لیا کہ طلاق عورت کی بے وفائی کی صورت کے علاوہ بھی اکثر اوقات لازمی ہو جاتی ہے۔ امریکہ طلاق کے معاملے میں باقی دنیا پر سبقت لے جا چکا ہے۔ یعنی امریکہ کے صرف ریاستہائے متحدہ میں جتنی طلاقیں سال بھر میں دی جاتی ہیں۔ اُن کی مجموعی تعداد باقی تمام دُنیا سے زیادہ ہے۔ عدالتیں دن رات اسی کام میں مصروف رہتی ہیں۔ یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے کہ تار برقی اور ٹیلیفون کے ذریعے طلاق دی جانے لگی ہے۔ ذرا سی رنجش پیدا ہونے پر میاں بیوی طلاق کی درخواست دے دیتے ہیں۔ بیوی اگر دُوسرے مرد کو خاوند پر ترجیح دیتی ہے تو جھٹ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جھوٹی شہادت اور بیانات کے بعد طلاق حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے مضحکہ خیز واقعات سُننے میں آتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد خاوند ہنی مون کے لئے

ایک جگہ تجویز کرتا ہے۔ بیوی اُس سے اتفاق نہیں کرتی۔ اسی وقت جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے اور شادی کے کچھ منٹ بعد ہی طلاق کی درخواست جج کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے شکاگو کے ایک جج کا قول ہے کہ طلاق کی ارزانی جذباتی شادی کا باعث ہے۔ طلاق ایک آسان طریقہ ہے جس سے میاں بیوی جب چاہیں علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ اس طلاق کی آسانی نے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ ان شادیوں کو ہم جائز حرامکاری سے موسوم کر سکتے ہیں۔ طلاق کے قوانین کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طلاق کا حصول مشکل ہو۔ طلاق خاندانی زندگی کو برقرار رکھے نہ کہ اُسے برباد کرنے میں مدد دے۔ طلاق خواہ کتنی ہی خوبیوں کا حامل کیوں نہ ہو ہے ایک بدعت۔ ایک تلخ گھونٹ ہے جسے دوا سمجھ کر پینا پڑتا ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ رسُول عربی کا قول ہے کہ اللہ کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں کرتا جتنی کہ طلاق سے۔"

مائیکل: امریکہ کے ایک منصفِ اعلیٰ کا قول ہے کہ ایسے حالات بھی پیدا ہوتے ہیں جس وقت طلاق ایک فریضہ بن جاتی ہے۔ ایسے موقع پر طلاق نہ دینا ایک گناہ کبیرہ ہے۔ جس وقت ایک ظالم شوہر بلا کسی وجہ کے بیوی کو زد وکوب کرتا ہے۔ اس کو بچوں سمیت باہر نکال دیتا ہے ایسی حالت میں شوہر کو بیوی اور بچوں کی پرورش کے اخراجات کو برداشت کرنے پر مجبور کرنا ایک مستحسن فعل ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ طلاق کے پس پردہ روپے کا حصول بھی عورتوں کو طلاق کی درخواست کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ طلاق کو مشکل بنا دیں۔ اس قدر مشکل کہ طلاق کا تہیہ کرنے والے دوبارہ اور سہ بارہ طلاق کی درخواست کرنے سے پہلے کچھ غور بھی کریں۔"

انصر: یہ اسلامی حصولِ طلاق کی تائید نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلامی طریقۂ طلاق کو مدِ نظر رکھئے اور پھر ان امریکی ججوں کے اقوال سے اُن کا موازنہ کیجیئے۔ حقیقت عیاں ہو جائے گی۔"

مس روبی: بیشک طریقہ مناسب تجویز کیا گیا ہے اس وقت مغرب میں طلاق سردردی کا باعث بن چکی ہے علماء اور حکما اس کا حل تلاش کر رہے ہیں مغربی اقوام سے ان لوگوں نے اپیل کی ہے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اپنے لئے نہیں تو کم از کم اپنے بچوں کے مستقبل کا خیال کریں۔ شادی

ایک پاکیزہ انسانی رشتہ ہے۔ آئندہ نسلوں کی بہبودی آج کی شادیوں پر منحصر ہے۔ اس لئے طلاق کا تصفیہ کرنے سے پہلے اس بچے کا خیال کریں جو اُن کے درمیان ایک پُل کی طرح قائم ہے۔ عورت اپنے آپ سے یہ چند سوالات کرے۔ کیا وہ بچے کے حسین تخیل کو برباد کرنے کا حق رکھتی ہے؟ تمہیں بیشک دھوکا ہوا۔ زندگی کے تلخ تجربہ نے تمہیں مایوس بنا دیا ہے لیکن تمہارا بچپن تو خوشی میں گذرا۔ تمہیں تو اپنی نشو ونما کے لئے موقعہ ملا۔ کیا تم اپنے بچے کو اس مسرت اور حق سے محروم رکھنا چاہتی ہو کیا تم اس کے باپ کو اس کی نظروں میں ذلیل کرنا چاہتی ہو؟ زندگی کے متعلق بچے کو مکروہ نظریات قائم کرنے میں اُس کا معاون بننا پسند کرتی ہو؟ اپنی زندگی پر نظر ڈالو۔ تمہاری زندگی کیا ہوتی۔ اگر تمہیں محبت بھرے والدین نصیب نہ ہوتے؟ تم اپنے شوہر پر یہ الزام عائد کرتی ہو کہ وہ خودغرض ہے۔ وہ تمہارا خیال نہیں رکھتا۔ مگر کیا تم بھی اس خودغرضی کی خاطر اپنے بچے کی زندگی تباہ کرنے پر نہیں تلی ہوئی ہو کیا بچے کی پیدائش کی تم ذمہ دار نہیں ہو؟"

اصغری:۔ جب ان ممالک کا یہ حال ہے جو آزادی کے علمبردار ہیں۔ جہاں طلاق امرِ محال تھی۔ جہاں شادی سے پہلے مرد عورت ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں تو وہاں کس لئے یہ شادیاں ناکامیاب رہتی ہیں؟ طلاقوں کی اتنی بھرمار کیوں ہے؟"

مائیکل:۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عشق ومحبت اور شادی کے غلط نظریات کا قیام ہے۔ عشق و محبت کے دور سے گزرنا بیشک ایک حسین تجربہ ہے۔ اگر خوش قسمتی سے دوطرفہ محبت قائم ہو جائے مگر یہ فرض کر لینا کہ عشق ومحبت کی شدت شادی کے بعد بھی قائم رہے گی۔ اپنے آپ کو زبردست فریب دینا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی چیز کا تعاقب اُسی وقت تک کیا جاتا ہے۔ جب تک اُس کا حصول ناممکن ہو جب تمہاری محبوب شے تمہارے قبضہ میں آجائے تو خواہشِ حصول کی موت لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات یخ بستہ ہو جاتے ہیں۔ مرد عورت کے جنسی تعلقات کا بھی یہی اصول ہے۔ عشق کی شدت میں کمی آنا فطری امر ہے۔ محبت، رفاقت، بچوں سے شفقت۔ رشتہ داروں اور ہمسایوں سے اُنس سب مل کر عشق کی جگہ لے لیتے ہیں۔"

مس روبی:۔ اسی لئے مرد کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کی بیوی اُس کی محبوبہ رہ

چکی ہے۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کے عشق میں وہ سب کچھ قربان کرنے پر تلا ہوا تھا اور اب اس سے سخت کلامی سے پیش آتا ہے۔ بچے کی روندھی آواز سن کر برہم ہو جاتا ہے۔ جواب ادھر اُدھر ہو جانے پر پیٹنا اُٹھتا ہے یقیناً اپنی بیوی کو اپنا ساتھی تصور کرو۔ اسے بہترین دوست بنانے کی کوشش کرو۔ وہ تمہارے گھر کی منتظمہ ہے۔ تمہارے بچوں کی ماں ہے۔ عشق اپنا کام کر چکا۔ اس نے تمہیں یکجا کر دیا۔ ایک دوسرے سے ہمکنار کر دیا۔ اس لئے اس بیہودہ مفروضہ دماغ سے نکال دو کہ عشق کی شدت ویسی ہی رہنی چاہئیے۔ عورت محبوبہ ہی بنی رہے ہمیشہ محبت کی باتیں ہی کرتی رہے۔ یہ سب کورٹ شپ کے زمانے کی مسرتیں ہیں۔ جب شادی ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب ایک خاندان کی بنیاد ہے۔ بچوں کی پرورش اور خاندانی زندگی میں عشق کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر تمام عمر عشق سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو ایسی عورت سے عشق کرو جس کا حصول ناممکن ہو۔ یہ فطری اقتضا ہے وصل عشق کی موت ہے۔"

مائیکل: آپ کے خیالات مجھ سے کس قدر متفق ہیں۔ عورت کو بھی شادی کے بعد عشق کی تمنا نہیں رکھنی چاہئیے۔ مرد عورت کو کتنا چاہتا ہے۔ اس کا ثبوت عملی طور پر شادی کرنے کے بعد وہ بہم پہنچاتا ہے۔ اس سے بہترین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس سے توقع رکھنا کہ شادی سے پہلے کا عشق جاری رکھے۔ اس کا تعاقب کرے۔ محبت بھرے الفاظ سے اس کی خوشامد کرے۔ اسے پھول بطور تحفہ بھیجے اسکو اپنائے۔ سراسر حماقت ہے۔"

"بیشک"۔ میں نے کہا۔ "مرد کو بے شمار کام ہوتے ہیں۔ کاروباری تفکرات، خاندان کی پرورش کی تگ و دو یہ سب باتیں اسے عشق و محبت فراموش کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں جس وقت وہ گھر لوٹتا ہے تو بیوی سے ہمدردی اور خوش اطواری کا متوقع ہوتا ہے۔ وہ محبت کے الفاظ سننا چاہتا ہے تاکہ اس کی ساری کوفت دور ہو جائے۔ مگر اکثر بیویاں بیچارے مجھ ایسے خاوندوں کی ــــ بچوں کی لڑائی۔ ساس نند سے تکرار ہمسایوں سے جھگڑا۔ رشتہ داروں سے چپقلیں اور نوکروں کی شکایات سے تواضع کرتی ہیں جوان کی کاروباری مشکلات کے سامنے ذرہ برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ بیوی ایک تھکے ماندے خاوند سے ایسی باتیں سننے کی کس طرح توقع کر سکتی ہے۔ وہ لذیذ کھانے چاہتا ہے مگر وہ شکایتوں سے پیٹ بھرنا چاہتی ہے۔ بعض عورتیں تو اپنے جلے ہوئے کبابوں اور پھٹے ہوئے دودھ کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں۔ اگر ان کو

اس سلسلے میں ہمدردی کی ضرورت تھی۔ تو بہتر تھا کہ کسی خانساماں یا ہوٹل کے منیجر سے شادی کر لی ہوتی کیا بیان کروں۔ مخالف طبائع کی مالک بیوی سے نباہ کرنا مشکل ترین کام ہے۔ میں تو اسے جہاد کا درجہ دیتا ہوں۔ جان دینا آسان ہے مگر گھل گھل کر مرنا بہت دشوار ہے۔"

مائیکل:۔ "بیشک مرد کو بیوی سے عشق کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے مگر اتنا بھی نہ ہو کہ بیوی ان جذبات سے قطعاً عاری ہو جائے۔ مرد آخر مرد ہے۔ اس کی جنسی بھوک بدستور کسی قدر کم شدت سے قائم رہتی ہے۔ اگر وہ ناجائز تعلقات کو گناہ گردانتا ہے اور اس لئے اپنی بیوی سے ہی عشق بھی کرنا چاہتا ہے تو بیوی کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ مرد کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی بھی بدصورت اور دلکش نہ ہو۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ عورت ہر وقت بناؤ سنگار میں ہی مصروف رہے۔ دونوں پہلوؤں میں توازن قائم رکھنا ہی عقلمندی کی دلیل ہے۔ تعلیم کا فائدہ جبھی ہے جب عورت مرد کی نفسیات سے آگاہ ہو کر مرد کی مسرت کو ملحوظ رکھے۔"

مس روبی:۔ "مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ بیوی کو نہ فضول خرچ ہونا چاہیئے اور نہ اتنا کنجوس کہ روپیہ جمع کرنے کی فکر میں اچھے ملبوسات کو ترک کر دے۔ آرائش و زیبائش کا خیال نہ کرے۔ اپنے آپ کو غیر دلکش اور بوڑھی تصور کرے۔ عشق و محبت کا شادی کے بعد خاتمہ کر دے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرد اپنی بیوی کو ہمیشہ آراستہ اور دلکش دیکھنا چاہتا ہے۔ مرد کا جمالیاتی ذوق کبھی مُردہ نہیں ہو سکتا۔"

"کاش میری بیوی یہ حقیقت ذہن نشین کر سکے۔" میں نے کہا۔

اصغر:۔ "جو بیوی خاوند کی بجائے والدین کی اطاعت کرے۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟"

مس روبی:۔ "بیوی کو کبھی رشتہ داروں اور ہمسایوں کی باتوں پر نہیں جانا چاہیئے۔ ان کو خوش کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کو اپنے ذاتی معاملات میں کبھی دخل انداز ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیئے۔ شوہر سے زیادہ کسی کو بیوی سے ہمدردی نہیں ہوتی۔ بیوی کو یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے معاملات آپ سلجھائے۔ زندگی اُس نے بسر کرنی ہے۔ اس کے والدین اور رشتہ داروں نے نہیں۔ ہر مرد میں چند انوکھی باتیں ہوتی ہیں۔ دو طبیعتیں بالکل یکساں نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے زندگی کے ایسے اہم مسئلہ پر وقت صرف کرنا ضروری ہے۔ ایک دوسرے کی نفسیات کا مطالعہ

نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔"

مائیکل: بات تو سیدھی ہے۔ ہر مرد عورت کی زندگی کا طرزِ عمل اُن کی خواہشات پر منحصر ہے۔ دونوں اگر باہمی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ایک دُوسرے کی خواہشات کی تکمیل میں اعانت کرنا ہی باہمی محبت کو استوار کر سکتا ہے۔ دونوں فریقین کو کچھ نہ کچھ ایثار کرنا ہی ہوگا۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر میاں بیوی اپنی اپنی ضد پر قائم رہیں تو مصالحت ناممکن ہے۔ ایسے مرد عورت جو ہٹ دھرم واقع ہوتے ہیں۔ وُہ کسی سے بھی نباہ نہیں کر سکتے۔ ان کے لئے ایک کو طلاق دے کر دُوسرے سے نباہ کی اُمید رکھنا خود فریبی کے مترادف ہے طبیعتوں کی مکمل ہم آہنگی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مرد بھی بیوی کا غلام بن کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ اُس کی بیوی ملکہ ہی کیوں نہ ہو۔ مرد عورت کو دل کی ملکہ بناتا ہے مگر وُہ خود بادشاہ بنا پسند کرتا ہے۔ مرد بیوی کے رونے اور آنسو بہانے کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ مرد خود بہت کم آنسو بہاتا ہے۔ کوئی شوہر یہ پسند نہیں کرتا کہ صبح کا ناشتہ ہچکیوں پر مشتمل ہو۔ اس کی اخبار بینی یا مطالعہ بیوی کے آنسوؤں سے تر ہو۔ اگر خاوند کو مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ وُہ دل برداشتہ ہو کر گھر لوٹتا ہے تو اُس کے زخموں پر اور نمک نہ چھڑکا جائے۔ اس کے دل کو ڈھارس دی جائے۔ یہ نہ ہو کہ آنسو بہانے شروع کر دئے جائیں اور چیخ پکار شروع کر دی جائے۔ رفاقت کا ثبوت دینے کا یہی موقع ہے۔ عورت کی یہی غفلت مرد کی نفرت کا باعث بنتی ہے۔"

مائیکل: آپ کو ان مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔ جن سے ہم دوچار ہیں۔ اکثر مردوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ بیویاں ان کے خطوط پڑھ لیتی ہیں۔ مشرقی عورتیں ابھی بہت جہالت میں مبتلا ہیں مردوں کی خواہشات کا اُنہیں کوئی پاس نہیں۔"

مس روبی: بلاشبہ بیوی کو کوئی حق نہیں کہ خاوند کے خطوط پڑھے۔ البتہ وُہ خوشی سے اس کو اس کی اجازت بھی دے سکتا ہے۔ بیوی صحیح رفیقِ زندگی تو جبھی کہلا سکتی ہے۔ جب وُہ زندگی کو کامیاب بنانے میں مرد کی اعانت کرے۔ عورت کی زندگی کا کامیابی کا راز بہترین بیوی اور ماں بننے پر ہی موقوف ہے۔ مرد کو ازدواجی زندگی کے علاوہ اپنے نصب العین کے حصول کیلئے جدوجہد کرنا بھی لازمی ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار بیوی پر ہے۔ مشاہیر عالم کی زندگی کا مطالعہ

ثابت کرتا ہے کہ ان کی کامیابی میں عورت کا کتنا ہاتھ ہے۔ اگر بیوی ہی اپنے شوہر کا ساتھ نہ دے تو اور کون دے گا۔ وہ ہمدردی اور حوصلہ افزائی کہاں سے پائے گا بے غرض ہمدردی اور اعانت صرف دوستوں کی ذات سے ممکن ہے اور بیوی جب تک دوست نہ بنے۔ اس کا وجود بیکار ہے وہ صرف ایک بوجھ ہے جسے مرد برداشت کرنے پر مجبور رہتا ہے"۔

النصرت: آپ نے بیوی کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے۔ رسول عربی پر بھی جب سب سے پہلے وحی نازل ہوئی تھی۔ آپ پر ایک عجب کیفیت طاری تھی۔ کس قدر اہم فریضہ آپ کو سونپا جا رہا تھا۔ دنیا کے تمسخر اور مخالفت کا مقابلہ درپیش تھا۔ آپ نے سب سے پہلے اپنی بیوی خدیجہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ بیشک آپ نبی برحق ہیں۔ وہ ایمان لے آئیں۔ اپنے شوہر کی ڈھارس بندھوائی۔ پھر آپ نے اپنے جگری دوست حضرت ابوبکرؓ پر اس حقیقت کا انکشاف کیا۔ انہوں نے آمنا وصدقنا کہا۔ اس کے بعد رسول عربی باطل کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر اتر آئے۔ اس کا نتیجہ آج دنیا پر روشن ہے"۔

"کاش ہماری بیویاں بھی ایسی ہی ہوں"۔ میں اور اصغر ایک ساتھ گویا ہوئے۔

مائیکل: "بیشک بیوی اور دوست اگر کسی مرد کی تکمیل خودی میں معاون ثابت نہیں ہو سکتے تو وہ رفیق حیات اور رفیق صادق کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں"۔

پانچواں باب

عورت اور شراب

شام کے خطوط باقاعدہ موصول ہوتے رہتے تھے۔ اس کا کاروبار ترقی پر تھا۔ روپے کی فراوانی نے ایک چھوڑ کئی دنیائیں اُس کے قدموں پہ ڈال دی تھیں۔ عورت اور شراب اس کی دلداری کے لیے اک اشارے کی منتظر رہتی تھیں۔ کلکتہ جیسے شہر میں ان دونوں چیزوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ بنگال میں بھوک سے مرنے والے ایسے انسان تھے جو ذہنی طور پر غلام تھے۔ ذہنی غلامی نے انہیں بزدل بنا دیا تھا۔ ورنہ مرتا کیا نہیں کرتا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے انبار سامنے ہوں اور وہ اسے چھین نہ سکیں۔ وہ جیل آسانی سے جا سکتے تھے۔ وہاں اُنہیں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے عام ضروریاتِ زندگی تو میسر آ سکتی تھیں۔ رہنے کے لیے کوٹھڑی۔ پہننے کے لیے کپڑے۔ کھانے کو روٹی اور ہم جنسوں کی صحبت۔ ریستوران میں احباب جمع تھے۔ شام کا خط سننے کے بعد انصر یوں گویا ہوا۔

انصر: "مائیکل شراب کے متعلق سائنس کا کیا نظریہ ہے۔ اور شراب کا عورت سے کیا تعلق ہے؟"

مائیکل: شراب کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً انگوری شراب۔ وسکی۔ برانڈی۔ رم۔ جن۔ کلیرٹ۔ شیری۔ بیر یا توڑی۔ شراب کی یہ تمام اقسام الکوحل کے تناسب کے مطابق نام پا گئی ہیں فرق صرف الکوحل کی مقدار میں ہے۔ ایک سو اونس بیر میں پانچ فیصدی الکوحل ہے تو

وسکی میں پچاس سے لیکر ستر فیصدی تک الکوحل ہوتی ہے۔ تھوڑی سی مقدار پینے کے بعد خون کا دورہ تیز ہو جاتا ہے۔ ذہن میں چستی اور خیالات میں روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی پینے سے قبل مغموم نہ ہو تو وہ کیف اور سرور سا محسوس کرتا ہے۔ طبیعت بشاش ہو جاتی ہے مگر رنج کی حالت میں شراب اور بھی رنجیدہ کر دیتی ہے۔ اس کا باعث خون کے دورہ کی تیزی ہے۔ ذہن اس تیزی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوں جوں الکوحل کی مقدار زیادہ پی جاتی ہے۔ اتنی ہی تیزی بڑھتی جاتی ہے۔ ذہن زیادہ غور و فکر نہیں کر سکتا۔ اسلئے الفاظ اور خیالات میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ جو منہ میں آ گیا نکل گیا۔ ایک عام مہذب انسان الکوحل کے زیر اثر ایسی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو اسے بیوقوف ٹھہراتی ہیں۔ خاموش اور کم گفتگو کرنے والا بھی باتونی بن جاتا ہے۔ نشہ کی حالت میں کسی چیز کی پروا نہیں رہتی۔ بادشاہ یا حکام اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ بڑے سے بڑے رتبہ والے سے مخاطب ہو سکتا ہے۔ وہ چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ اپنے سے طاقتور کے ساتھ لڑ سکتا ہے۔ دلیر اور شجاع بن جاتا ہے۔ الکوحل کا نشہ بزدل نہیں بناتا۔ شرابی راست گو۔ صاف دل اور دلیر ہوتا ہے۔ جبتک نشہ استوار ہے۔ وہ تمام دنیا کا بادشاہ ہے۔ غم و الم بے معنی ہیں۔ جذبات حکمرانی کرتے ہیں۔ عقل ہتھیار پھینک دیتی ہے۔ جہاں تک ان خوبیوں کا تعلق ہے شراب کا مقابلہ اور کوئی نشہ آور چیز نہیں کر سکتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شراب بھی صفات کی حامل ہے۔ مثل مشہور ہے کہ انسان دو حالتوں میں جھوٹ بولنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ ایک مرنے وقت اور دوسرے مدہوشی کی حالت میں۔ شراب مجرموں کے سینے سے راز برآمد کرنے کی غرض سے اکثر کام میں لائی جاتی ہے۔ مغرب میں سیاسی اور کاروباری معاہدے شراب کی موجودگی میں کئے جاتے ہیں۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو نشہ کی حالت میں بھی اپنے حواس پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔ اور کسی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہوتے جو اپنی ذات کو یا کسی دوسرے کی ذات کو مضرت رساں ہو۔ یہ نشہ کی پہلی منزل کہلاتی ہے۔ اس منزل کا یہ روشن پہلو میں نے بیان کیا ہے۔ اب تاریک پہلو کو لیجئے۔ نشہ کی پہلی منزل سے

یک ذی ہوش انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ جو اپنے آپ پر عبور رکھتا ہے۔ وہ مسرت کے تلخ گھونٹ پیتا ہے۔ وہ خرد کی بدولت پھول چن لیتا ہے اور خس وخاشاک پھینک دیتا ہے۔ مگر جذبات کی رو میں بہہ جانے والا انسان عقل سے بالکل عاری ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ بے پرواہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایسے افعال مثلاً لڑنے جھگڑنے اور گالی گلوچ کو ایک معمولی بات گردانتا ہے۔ اس کے علاوہ خوشی کی حالت میں اور زیادہ مسرت کا طالب ہوجاتا ہے۔ عورت کے بغیر ہر ایک انجمن بے کیف ہوتی ہے۔ اس لئے وہ عورت کی عدم موجودگی کو ضرور محسوس کرتا ہے۔ اس وقت جو عورت بھی دستیاب ہو سکے وہ اس کے لئے کم وبیش مسرت میں اضافہ کی باعث ہوسکتی ہے۔ اگر آزادانہ میل ملاپ کے حامی افراد ایک جگہ جمع ہوں تو قدرتی طور پر مرد عورت رومان کی ترغیب پاتے ہیں اور اس طرح نشہ کی حالت میں گناہ کا ارتکاب کوئی بڑی بات نہیں۔ گناہ اور شراب لازم وملزوم ہیں تفریحی ناچ کے موقعہ پر شراب لازمی طور پر استعمال میں آتی ہے۔ کیونکہ اس کی اعانت کے بغیر انسان اپنی فطری حیا اور شرم سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ کیف وسرور کے زیر اثر وہ کسی اجنبی مرد عورت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اُس کے ساتھ ناچ سکتا ہے اور ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ شراب جائز ہے کہ ناجائز؟ طبی سائنس کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی مقدار میں الکوحل سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔ جسم کو حرارت پہنچانے میں فوری دوا کا کام دیتی ہے۔ ہاضمہ کو تیز کرتی ہے۔ مگر کثرت استعمال نقصان دہ ہے۔ شراب اعلیٰ قسم کی ہی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ گھٹیا شراب پینے سے زہر پینا زیادہ بہتر ہے اگر کوئی شخص پہلی منزل تک ہی محدود رہنے دے تو وہ عقلمندی کا ثبوت دیتا ہے۔ اگر وہ حد سے تجاوز کرے تو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔"

النصر: "وہ کیونکر؟ اس حد کی پہچان کیا ہے۔ کیا شراب کی کوئی خاص مقدار مقرر کی جا سکتی ہے"

مائیکل: "شراب کی مقدار ہر فرد کے لئے یکساں نہیں ہوسکتی۔ مگر مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عام انسان کے لئے کتنی مقدار اُسے پہلی منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہو

سکتی ہے پہلی منزل میں کیف و سرور ہوتا ہے مگر نشہ بے قابو نہیں ہوتا۔ ہوش اور مدہوشی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہیں۔ مدہوشی کج روی اختیار کرنا چاہتی ہے تو ہوش ہاتھ کے جھٹکے سے اسے منع کر دیتا ہے۔"

انصر: "مگر جب ہوش بھی مدہوشی کا ساتھ دے تو پھر کیا ہوتا ہے۔"

مائیکل: "ہر شرابی اپنی حد کو پہچانتا ہے۔ باقی یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرلے یا نہ کرے اگر کوئی تنہائی میں شراب پیتا ہے۔ تو اس کے فعل سے صرف اس کی اپنی ذات کو جسمانی ایذا پہنچنے کا احتمال ہے۔ مگر سماج میں اس کے بے قابو ہونے سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا امکان بھی موجود ہوتا ہے کسی دوست یا اجنبی کی بے عزتی کر سکتا ہے۔ کسی عورت کو گناہ پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اپنی محبوبہ کی عصمت پر حملہ کر سکتا ہے اگر وہ کنواری ہو۔ یا کسی دوسرے شخص کی بیوی کو ورغلانے کا اقدام کر سکتا ہے۔ شراب کی یہ خوبی بالکل بجلی کی قوت سے مشابہ ہے۔ اگر شراب سے بے پروائی کیف و سرور۔ دلیری اور شجاعت کے جذبات پر انسان قابو رکھ سکتا ہے۔ تو وہ اپنی مسرت میں کئی گنا اضافہ کر سکتا ہے۔ اس سے مستفیض ہو سکتا ہے۔ بجلی کی طرح اس قوت سے بڑے کام لے سکتا ہے۔ مگر قوت بے قابو ہو جائے تو اپنا ہی نقصان ہے۔ جو لوگ اپنے جذبات پر قدرت نہیں رکھتے ان کے حق میں یہ بے پروائی ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی نادان کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول۔ جو خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں یعنی انفرادی اور سماجی زندگی میں وہ زندگی کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اگر وہ اس قانون پر عمل پیرا رہے تو اخلاقی طور پر شراب اس کے لئے جائز ہے ورنہ ناجائز۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جسمانی اعتبار سے جب وہ نشے کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے تو دوران خون بے حد شدت اختیار کر لیتا ہے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے ڈورے گلابی ہو جاتے ہیں۔ سر میں ایک بھاری پن سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ خون کی تیزی کی وجہ سے کنپٹیوں

پر زور پڑتا ہے۔ اعضائے جسمانی کو غیر معمولی فعل سرانجام دینا پڑتا ہے۔ فطرت اپنا انتقام لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ زیادتی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ شرابی کو حد سے بڑھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مسرت کی قیمت ادا کرنا لازمی امر ہے۔ وہ شرابی اس طرح ادا کرتا ہے خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کا دل آرام کا خواہاں ہوتا ہے نیند اُس پر غلبہ پا لیتی ہے اعضائے جسمانی اُس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ قدرتی سائنس کا اصول ہے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ضرور ہوتا ہے۔ گیند کو جتنی زور سے زمین پر مارو گے اتنی ہی شدت سے وہ اُوپر ابھرے گی۔ اسی طرح شراب کا ردِ عمل ہے۔ شرابی نے وہ لطف اٹھایا۔ جو عام حالت میں ممکن نہیں تھا۔ اس لئے ردِ عمل سے بھی دوچار ہونا ضروری ہے۔ نشہ جب اترتا ہے اسوقت مسرت کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔ سر میں شدت کا درد پیٹ میں جلن۔ حلق میں پیاس کے کانٹے اور اکثر اوقات قے اگر نشہ کی حالت میں زیادہ پیٹ بھر لیا گیا ہو۔ یہ ہے مسرت کی قیمت۔ قے کر لینے سے کچھ افاقہ ضرور ہوتا ہے مگر غور طلب امر ہے کہ ایسے ایسے لذیذ کھانوں کا یہ حشر کتنا اندوہناک ہے جو شرابی نشہ کی حالت میں کھاتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ گرسنگی کا عمل تیز ہوتا ہے اس لئے عام حالت سے ایک عام انسان کئی گنا کھا جاتا ہے۔ مگر پیٹ میں گنجائش تو اتنی ہی ہوتی ہے۔ شراب معدہ کے فعل کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ اس لئے ردِ عمل کے وقت معدہ بھی الٹا عمل اختیار کرتا ہے۔ کم از کم بارہ گھنٹے یہ ردِ عمل جاری رہتا ہے۔ سر کا درد۔ پیاس اور بے چینی سارا مزا کرکرا کر دیتی ہے۔ سردرد اور قے تو فوری جرمانہ کی صورت میں ادا کرنا پڑتے ہیں۔ قدرت جسمانی انتقام تو فوراً لے لیتی ہے۔ وہ کبھی معاف نہیں کرتی۔ اخلاقی طرزِ عمل کی وہ ذمہ دار نہیں ہے۔ جو قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کرتا ہے سزا پاتا ہے۔ اخلاقی طور پر سزا اس کو سماج دے سکتا ہے۔ انفرادی زندگی میں اس کو سزا خود بخود جسمانی طور پر مل جاتی ہے۔ مگر سماجی زندگی میں اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کی سزا سماج ہی دے سکتا ہے۔ یہ تو فوری سزا کی صورت ہے۔ اس کے علاوہ اعضائے جسمانی

کو کیا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے یہ ہیں وہ حقائق جن سے کوئی شرابی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اگر کسی نے خود تجربہ نہیں کیا تو کر کے دیکھ سکتا ہے۔ یا کسی شرابی سے دریافت کر سکتا ہے۔"

انصر: آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی روشنی میں پھر کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟ شراب استعمال کرنی چاہیئے کہ نہیں؟"

مائیکل: کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دونوں پہلوؤں کو ایک ترازو میں تولنا ضروری ہوگا۔ ایک پلڑے میں خوبیاں ڈالو اور دوسرے میں عیوب۔ شراب کی خوبی پر نظر ڈالیں ــــ

(۱) تھوڑی مقدار میں شراب دوران خون کو تیز کرنے میں فوری مدد دے سکتی ہے جسم کو فوری حرارت پہنچا سکتی ہے۔ یعنی طبّی ضروریات کے لحاظ سے دوا کا کام دے سکتی ہے

(۲) وسکی۔ برانڈی جن۔ بیئر وغیرہ کی مناسب مقدار کیف وسرور۔ سرمستی اور مسرت کا باعث بن سکتی ہے۔ مسرت کو دوبالا کر سکتی ہے۔ غم غلط کرنے میں معاون ہو سکتی ہے بشرطیکہ پینے والا اس پر آمادہ ہو۔ ورنہ رنج میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نشہ کی حالت میں جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ ادراک سست ہوتا ہے۔ میرا تو یہی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ غم غلط کرنے کا شراب دعویٰ نہیں کر سکتی غم غلط اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ حد سے زیادہ پی لی جائے۔ بیہوشی کی حد تک۔ اس کے بعد نیند غلبہ پالے اور اور انسان سو جائے۔ مگر ہوش آنے پر رنج پھر عود کر آتا ہے۔ اس لئے شراب بھی اسی صورت میں اعانت کر سکتی ہے جب خود شرابی اپنے آپ سے یہ کہے کہ گذرے ہوئے واقعات پر افسوس بیکار ہے۔ ماضی کسی کا نہیں۔ حال اپنا ہے اور مستقبل حال پر منحصر ہے۔ مسرت امید کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے۔ امید ہمیشہ بشاش رہتی ہے یاس مسرت کے حق میں زہر قاتل ہے۔ یاس کا علاج شراب کے پاس بھی نہیں اسکی دوا صرف محبت ہے۔ کسی محبوبہ کی محبت جس کے سامنے دنیا کی تمام بہترین شرابیں ہیچ ہیں جس کے نشہ کا کوئی ردعمل نہیں۔ شرابی کی تباہ شدہ زندگی کو اگر نئی زندگی کوئی

چیز بخش سکتی ہے تو وہ عورت ہے۔ عورت کی محبت کا نشہ شراب سے کہیں بڑھ کر ہے (۳) طبیعت جب بالیدگی پاتی ہے۔ ذہن تفکرات سے نجات پاتا ہے تو انسان مسرت محسوس کرتا ہے۔ یہی احساسات کیف و سرور کا باعث ہیں۔ اس صورت میں شراب کی یہ خوبی انسان کو دلیر اور شجاع بنا دیتی ہے۔ وہ کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ بادشاہوں اور چٹانوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ جسمانی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ جھوٹ سے نفرت کرتا ہے وہ آزادانہ گفتگو کر سکتا ہے۔ وہ سچ بولنے کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اس لئے دعوتوں اور تفریحی ناچ کے دوران میں شراب کا استعمال لازمی جزو ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر ناچ اور گفتگو سے حظ کم اٹھایا جاتا ہے۔ (۴) ان کے علاوہ ایک خوبی اور بھی ہے یعنی باقی نشہ آور اشیا کی طرح شراب بھی امساک میں اضافہ کرتی ہے۔ اس لئے عیاشی کا بہترین نسخہ ہے۔ مسرت کو کئی گنا زیادہ کرنے میں زبردست معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو تھیں اس کی خوبیاں اب عیوب کی کو دوسرے پلڑے میں ڈالیے۔ (۱) شراب کا رنگ تو جاذب نظر ہے مگر ذائقہ اچھا نہیں۔ وسکی برانڈی۔ رم کی قسم کی شراب تو تلخ ہوتی ہے۔ مگر اس تلخی سے مزا آتا ہے کباب کی لذت اس تلخی کے باعث دوبالا ہو جاتی ہے۔ اس لئے شراب اور کباب مشرق میں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ یہ عیب بھی ہے اور خوبی بھی۔ اس لئے آدھی آدھی دونوں پلڑوں میں تقسیم کیجا سکتی ہیں اچھا تو اب لیجئے اس کی بو۔ یہ بھی ناگوار ہوتی ہے۔ البتہ جن اور بیر کی بو قدرے بہتر ہے۔ اس کو بھی عیب کے پلڑے میں ڈالو۔ اس کے علاوہ حلق سے اترتے وقت جلن پیدا کرتی ہے۔ اور پیٹ میں بھی جلن دیر تک رہتی ہے (۲) ہاضمہ کو اس کی زیادہ مقدار خراب کرتی ہے۔ سر درد۔ پیاس اور تے شراب کے ردعمل ہیں۔ یہ عیوب نہایت ہی نفرت آگیں ہیں اور شراب کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ چند گھنٹوں کی مسرت کے عوض کئی گھنٹے تکلیف اٹھانا ردِعمل اور جرمانہ کی قیمت ہے۔ شراب کی کثرت استعمال صحت کو تباہ کر دیتی ہے۔ (۳) بہت کم لوگ ایسے ہیں

جو پہلی منزل سے تجاوز نہیں کرتے نشہ کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھنا ہمت کا کام ہے۔ اپنی انفرادی قوت کے حسب مقدار پینا ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے اپنی خواہشات اور جذبات پر کامل اختیار ہو۔ یعنی انفرادی زندگی کے قانون پر پوری طرح سے عمل پیرا ہو۔ مگر اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ وہ اپنی حد کو جانتے بھی ہیں مگر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ وہ شعور سے نابلد ہو جاتے ہیں۔ دوسری منزل میں غیر مہذب حرکات اور گناہ کا ارتکاب معمولی بات ہے۔ جذبات بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ فساد، قتل، عصمت دری اور لوٹ مار میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جیلوں کے ریکارڈ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اکثر جرائم نشہ کی حالت میں سرزد ہوتے ہیں (۴) کیونکہ انسان شرم و حیا بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اس لئے اس بے پروائی کی حالت میں وہ گناہ کی ترغیب پاتا ہے۔ تفریحی رقص کی محفلوں میں یا اور کئی موقعوں پر نشہ اس کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ وہ خدا۔ سماج اور حکومت کو اس وقت خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ تسکین جذبات چاہتا ہے۔ اسکی قیمت اسے کیا ادا کرنا ہو گی۔ اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ شعور اپنی کمزور آواز بلند کرتا ہے ضمیر اس کا ہاتھ روکنے کی سعی کرتا ہے۔ مگر بے سود۔ جذبات بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح مشکل سے ہی قابو میں آتے ہیں۔ یہی خوبی عیب میں بدل ہو جاتی ہے۔ یہی بے پروائی جو مسرت کو دوبالا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے وہی بے پروائی گناہ اور جرم کے ارتکاب کی موجب ٹھہرتی ہے۔ یہی دلیری اور شجاعت کی صفت جو ایک انسان کو نشہ کی حالت میں سچ بولنے کی ترغیب دیتی ہے۔ دوستوں کو قریب تر کرتی ہے وہی دلیری کشت و خون اور لوٹ مار پر آمادہ کرتی ہے۔ گہرے دوستوں کے آپس میں دست و گریباں ہونے کا باعث بنتی ہے۔ اور ہزاروں آفتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے (۵) دوسرا منزل میں نشہ اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ اعضائے جسمانی حرکت کرنے سے جواب دے دیتے ہیں۔ آنکھوں کے پپوٹے کھلے نہیں رہ سکتے۔ قوت ارادی سلب ہو جاتی ہے

نیند اپنا غلبہ پا لیتی ہے۔ ایسی حالت میں انسان بے ہوشی کی نیند سو جاتا ہے۔ موت بھی آ جائے تو بڑی بات نہیں۔ دوستوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ اس حالت میں بیہوشی میں شرابی کو لوٹ لینا یا قتل کر دینا یا کہیں پھینک دینا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ فلم دی کال آف دی فلیش یا اس کا ہندوستانی چربہ جو شرابی کے نام سے مشہور ہے۔ اس امر کی وضاحت کرتا ہے۔ چوروں۔ لٹیروں اور رہزنوں کے لئے شراب بہترین حربہ ہے۔ عیاش لوگوں کے لئے عورت کی عصمت دری کا نہایت آسان ذریعہ ہے۔ پہلی منزل میں انسان مدافعت کر سکتا ہے۔ اس کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ مگر دوسری منزل میں شعور پر غنودگی ہوتی ہے۔ اعضائے جسمانی میں حرکت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ ہوش اگرچہ قائم بھی ہو۔ چور اگرچہ جیب سے بٹوا نکال بھی رہا ہو اور بدمست شرابی اُسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ بھی رہا ہو۔ تب بھی وہ مدافعت نہیں کر سکتا۔ نہ ہاتھ اٹھا سکتا ہے نہ کسی کو مدد کے لئے پکار سکتا ہے (۶) جسم اور صحت کو جو نقصان پہنچتا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ شراب کی کثرت استعمال دل۔ دماغ۔ جگر۔ گردے۔ معدہ وغیرہ کو سخت ایذا پہنچاتی ہے (۷) شراب قوتِ امساک میں وقتی طور پر اضافہ ضرور کرتی ہے۔ مگر ہر بار اس کی مدد لیتا مرد کی قدرتی قوت کو بیکار کر دیتا ہے۔ شرابی شراب کا سہارا لئے بغیر یہ فعل سرانجام نہیں دے سکتا ہے۔"

النصر "بس کیجئے۔ عیوب تو خوبیوں سے بہت بڑھ گئے۔ یقیناً عیوب کا پلڑا بھاری ہو گیا۔"

مائیکل "مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں۔ میں نے بے لاگ تنقید حقائق کی روشنی میں کی ہے۔ عیوب کا پلڑا بیشک جھک گیا ہے۔ میں صحیح تولنے والا ہوں۔ سائنس کا دھرم کانٹا میرے ہاتھ میں ہے۔"

النصر "قرآن بھی تو یہی فرماتا ہے کہ اے ایمان والو۔ بلاشبہ شراب میں خوبیاں بھی ہیں۔ مگر اس کے عیوب خوبیوں سے زیادہ ہیں۔ اس لئے اس سے پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

مائیکل: میں اس اصول کی تائید کرتا ہوں۔ مگر دنیا میں اکثر ایسے انسان بھی ہیں۔ جو شراب نوشی سے معصومانہ حظ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے لیئے مناسب مقدار کا استعمال میں جائز سمجھتا ہوں۔ مذہب کی احتیاط کا مقصد میں خوب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اکثریت حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس لیئے میں نے سائنٹیفک نتیجہ یہی اخذ کیا ہے۔ کہ شراب کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ جسمانی اعضا کے نقصان کا احتمال نہ رہے۔ اس کے لیئے حکومت اپنا ادارہ قائم کر سکتی ہے۔ جو سوائے بہترین شراب کے گھٹیا قسم کی شراب ہرگز تیار نہ کرے۔ اور نہ کسی کو کرنے دے۔ سوائے حکومت کے کسی فرد یا افراد کو شراب کی کشید کا حق نہ دیا جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سے سخت سزا دے۔ تاکہ سوائے بہترین شراب کے لوگ اور کسی قسم کی شراب استعمال نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ سماج کا یہ فرض ہو کہ وہ کسی فرد کو حد سے تجاوز نہ کرنے دے۔ اعتدال سے بڑھنے نہ دے۔ یہ فرض فرد کے احباب۔ رشتہ داروں اور سماج پر عاید ہوتا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ افراد کی اصلاح کرے۔ اور جو افراد صریحاً بدمست ہو کر سماج کے امن میں رخنہ انداز ہوں۔ ان کو حکومت سزا دینے کا حق رکھتی ہے۔"

انصر: جیسی شراب آپ پسند کرتے ہیں وہ صرف بہشت میں ہی میسر آ سکتی ہے۔ قرآن اس سلسلے میں فرماتا ہے کہ جنّت کی شراب دنیاوی شرابوں کے تمام عیوب سے پاک ہوگی۔ وہاں کی شراب کی یہ خصوصیات ہونگی۔ کیف و سرور ہوگا۔ مگر نشہ نہیں ہوگا۔ بدمستی طاری نہیں ہوگی۔ شراب سفید اور شفّاف ہوگی اور اس کا ذائقہ بھی خوش کُن ہوگا۔ ردِ عمل یعنی سر درد۔ پیاس۔ بدہضمی وغیرہ کی شکایات سے بالکل پاک ہوگی۔"

مائیکل: بیشک آپ اس شراب کا انتظار کر سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ صبر نہیں کر سکتے۔ ان کے لیئے یہی اصول وضع کیا جا سکتا ہے۔ کہ زندگی میں دنیا کی ہر چیز سے حظ اٹھاؤ گے مگر اس شرط پر کہ تمہاری اپنی ذات نہ کسی اور کی ذات کو اس فعل سے کوئی ضرر پہنچے یہی سیدھا اور سچا راستہ ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا۔ تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔"

الٰنصر: "عام انسان اس اصول پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ شراب کی مقدار مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ مشکل امر تھا کہ پینے کے ساتھ کوئی پابندی عاید کی جاتی۔ چند لوگوں کے لئے جائز قرار دی جاتی اور باقی لوگوں کے لئے ناجائز۔ اس لئے اسلام نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے شراب تمام لوگوں کے لئے حرام کر دی۔ کیونکہ شراب نیکی کی نسبت بدی کی ترغیب زیادہ دیتی ہے۔"

مائیکل: "مجھے اسلام کی نیک نیتی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بیشک مذہب تقدس کی تعلیم دیتا ہے اور جو شخص پاکباز رہتا ہے۔ اس کی میری نظروں میں بڑی وقعت ہے میں آپ کو پینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ میرا اپنا اصول ہے۔ اور میں اس کا پابند ہونے کی ہمیشہ سعی کرتا ہوں۔ فطری کمزوری سے میں بھی مستثنیٰ نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں میں آدرش کے حصول کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ مذہب کا محتاط راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں میں خطرات سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں بدی پر بہت حد تک فتح پا چکا ہوں۔ آپ کا شیطان بھی مجھے اپنے اصول زندگی سے منحرف ہونے کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ میرا آدرش یہی ہے کہ میں وہی راستہ اختیار کئے رکھوں۔ جو انسان کے شایاں ہے۔ میں بدی کے سمندر میں اپنی کشتی ڈوبنے نہیں دونگا۔ وہ صحیح سلامت کنارے لگے گی۔ اس کا مجھے ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو خدا پر۔"

الٰنصر: "آپ کی باتیں اور اصول بیشک درست ہیں۔ کاش انسان صحیح معنوں میں انسان بن جائیں۔ یہی مذہب کا مقصد ہے۔"

چھٹا باب

علم و ہنر

"تعلیم کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟ علم و ہنر کیوں ضروری ہیں؟ معیارِ تعلیم کیا ہونا چاہیئے؟ ہمارا موجودہ نظام تعلیم کیوں ناقص ہے؟" میں نے مائیکل سے سوال کیا۔

مائیکل: "زندگی حرکت کا نام ہے۔ حرکت کس طرح کرنی چاہیئے یہ ہمیں علم سے پتہ چلتا ہے، علم کی روشنی ہی ہم کو راستہ دکھا سکتی ہے۔ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنا ذی شعور انسان کا کام نہیں۔ یاد ہوگا ہماری گفتگو کا آغاز اسی سوال سے ہوا تھا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جب تک ہم زندہ ہیں ہمیں اس دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے۔ زندگی بسر کیسے کی جائے؟ اسی موضوع پر ہماری گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں ان تجربات اور مشاہدات کا علم ہو جو ہمارے متاخرین ہمارے لئے کتابوں کی صورت میں درج کر گئے ہیں۔ جو کچھ معاصرین علم میں اضافہ کر رہے ہیں اس کا بھی ہمیں علم ہونا چاہیئے۔ پھر اس علم کی روشنی میں اپنے تجربات اور مشاہدات کا جائزہ لینا چاہیئے انکشافات اور ایجادات اس صورت میں ممکن ہیں۔ اس لئے پہلی ضروری بات یہی ہے کہ علم حاصل کیا جائے۔ علوم کی اقسام میں اختصار سے بیان کرونگا تاکہ آپ کا تمام علوم سے تعارف ہو جائے۔ اور یہی ابتدائی اور لازمی تعلیم کا مقصد بھی ہونا چاہیئے۔ انسان کے نکتہ نگاہ سے دو ہی چیزوں کا علم ضروری ہے۔ ایک انسان کا اپنے متعلق

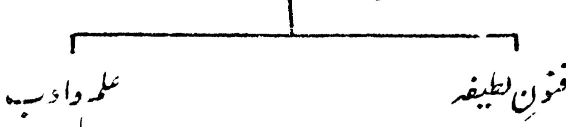
اور دوسرے یہ دنیا جس میں وہ رہتا ہے۔ دنیا کے علم میں تمام دنیاوی اشیا شامل ہیں
میرے خیال میں اس کا نقشہ پیش کرنا مطالب کی زیادہ وضاحت کریگا۔" یہ کہہ کر مائیکل
نے ایک علم و ہنر کا نقشہ بنایا اور پھر اس کی وضاحت کی۔ یہ نقشہ میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

انسان

جسم — ذہن میں نفس اور ادراک دونوں

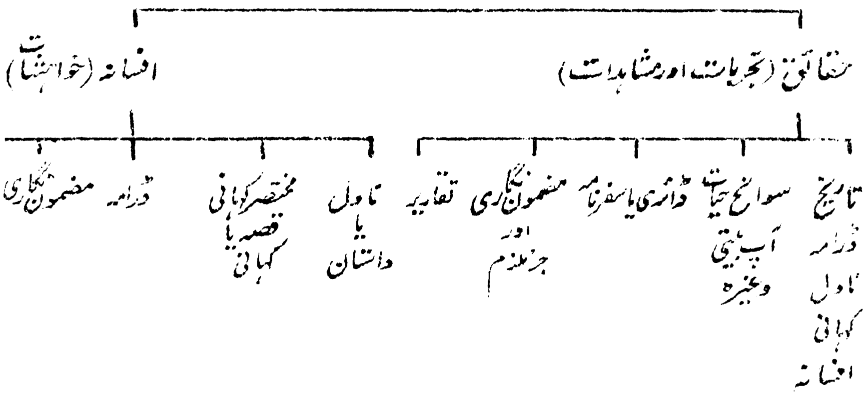
انسان کی خودی دو چیزوں کا مرکب ہے۔ ایک جسم دوسرا ذہن۔ اعضائے جسمانی خدام سے مشابہ ہیں۔ ذہن فرمانروا کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک جسم کا تعلق ہے ہمیں جسم کو زندہ اور صحت مند رکھنے کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے فزیالوجی تشریح جسم انسانی یعنی اناٹومی۔ نسلیات۔ علم الحیوانات اور نباتات۔ جنسیات وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہو کہ انسان کیا ہے اس کے اعضائے جسمانی کی ساخت اور ان کا فعل کیا ہے۔ ان کو افعال کے قابل کس طرح رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقفیت ہونی چاہیئے۔ اگر ہماری صحت خراب ہو جائے یا اعضائے جسمانی میں کوئی نقص آجائے تو اس کی درستی کس طرح ہو سکتی ہے۔ جسم دوبارہ صحت مند کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیماریوں کو شفا دینے کا فن بھی ضروری ہے۔ طب و جراحت اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ اب لیجئے ذہن۔ جسم کی ساخت اور افعال کے علم کی طرح ذہن کے متعلق بھی علم کا حصول ضروری ہے۔ انسان کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں کہاں سے اور کیسے آیا؟ اس کی زندگی یا موجودگی کا مقصد کیا ہے؟ زندگی کا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے؟ انسان کو کس طرح جینا چاہیئے؟ کیا اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے؟ اس دنیا کا کوئی خالق ہے کہ نہیں؟ یہ تمام ضروری سوالات ہیں اور ان کا جواب ہم زیر بحث لا چکے ہیں۔ فلسفہ۔ مذہب۔ اخلاقیات۔ علم النفس۔ سیاسیات اور معاشیات یہ تمام انہی جوابات کو پیش کرتے ہیں۔ بیشتر سوالوں کا جواب دیا جا چکا ہے۔ باقی زیر بحث

لائے جائیں گے۔ ان تمام علوم کا انسان کی زندگی کے ساتھ تعلق ہے۔ دراصل سوال ایک ہی ہے یعنی انسان کو زندگی کیسے بسر کرنی چاہیئے؟ اور یہ تمام علوم اس سوال کے جوابات ہیں۔ اگر آپ غور سے ان علوم کے مقصد پہ نگاہ ڈالیں تو مقصد صاف ظاہر ہو جائے گا یعنی زندگی کو مسرورترین بنانے کا فن



موسیقی اور رقص   فنِ اداکاری   کھیل اور تفریح   نثر   نظم

علم و ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ نظم ہو یا نثر مقصد اظہارِ خیالات و احساسات ہے۔ ادیب اور شاعر زندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں تنقید بھی کرتے ہیں اور مسرورترین بنانے کا راستہ بھی تجویز کرتے ہیں مگر اچھا شاعر یا ادیب وعظ نہیں کرتا۔ یہ کام فلسفیوں۔ مذہبی معلموں وغیرہ کو زیب دیتا ہے۔ علم و ادب کی دو قسمیں ہیں۔



کائنات

- علم
  - جغرافیہ
  - نجوم
  - حساب
    - جومیٹری
    - الجبرا
    - اقلیدس وغیرہ
  - طبیعات
    - حیوانات
    - نباتات
    - جمادات
  - کیمیا
- دنیا کو جلوہ گاہ حسن اور راحت کدہ بنانے کا فن
  - کاشتکاری
    - باغبانی
  - سینا پرونا
    - سونے چاندی اور دھات کا کام۔ لکڑی ہاتھی دانت وغیرہ کا کام
  - مصوری
    - رنگسازی
    - معماری
    - فوٹوگرافی
    - سینما
    - فوٹوگرافی
    - پرنٹنگ
    - کتابت
  - انجینئرنگ
    - ہر قسم کی

دنیا ایک ایسا مقام ہے جہاں ہم نے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے اس کی قدرتی خوبصورتی میں اضافہ کرنا انسانی ضروریات میں شامل ہے۔ اس مقام کو راحت کدہ بنانا ہمارا فرض ہے۔ ہر انسان اس کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ زمین کے جو کچھ باہر ہے اور جو اس میں مدفون ہے اس کا علم بھی ضروری ہے۔ ان علوم سے ہم فائدہ اٹھا کر مختلف فنون کی شکل میں اصل مقصد کے تکملے کی سعی کرتے ہیں۔ اس مختصر تجزیہ علوم وفنون سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہماری تعلیم کا زمانہ دو حصوں میں منقسم ہونا چاہیئے۔ تعلیمی نصاب کے پہلے حصہ میں تمام علوم وفنون سے طالب علموں کو متعارف کروانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر کسی ایک زبان میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فزیالوجی۔ ہائیجن۔ جنسیات۔ فلسفہ۔ دینیات اخلاقیات۔ نفسیات۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ علم الطبیعات۔ کیمیاوی علم۔ ریاضی۔ اقلیدس۔ علم الحیوانات۔ نباتات۔ جمادات۔ نسلیات وغیرہ کی مختصر طور پر تعلیم ضروری ہے۔ تاکہ

ہر فرد کے قدرتی رجحان کا علم ہو سکے۔ ایسے ابتدائی کورس کے لئے آٹھ سال کا عرصہ بہت کافی ہے۔ زندگی بہت تھوڑی ہے۔ اس لئے جوانی کا وقت ضائع کرنا دانائی نہیں ہے موجودہ طریقہ تعلیم میں یہی نقص ہے۔ کہ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ پہلے اردو میں تعلیم حاصل کرو۔ پھر وہی مضمون انگریزی زبان میں دہراؤ۔ کالج میں پہنچ کر بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ طالب علم کا قدرتی رجحان کیا ہے۔ طالب علم کو خود اس بات کا علم نہیں ہوتا۔ وقت گذرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرتی طور پر کس کام کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس کی فطرت اس سے کیا کام لینا چاہتی ہے اور اکثر اوقات ہوش دیر میں آتا ہے۔ یہ سب علموں کا قصور ہے۔ اس لئے آٹھ سال کی لازمی اور ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اس بات کا تصفیہ ہو جانا چاہیئے کہ فرد کا قدرتی رجحان کس علم یا فن کی طرف ہے۔ اس تصفیہ میں معلم طالب علم کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ وہ اپنے تجربات سے اسے مستفید کر سکتا ہے۔ تاکہ طالب علم اپنی خودی کو پہچانے اور پھر اس کی نشوونما کی سعی کرے۔ حکومت سماج اور خود فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تکمیل کرے۔"

میں بھی اسی ناکارہ اور ناقص طریق تعلیم کا شکار رہوں۔ وقت گزر چکا ہے۔ میری فطرت کا جو اقتضا ہے۔ وہ میرے پیشہ سے بالکل مختلف ہے۔ مگر حالات کی مجبوری مجھے ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔" میں نے سرد لہجہ میں کہا۔

مائیکل: "انسان ہمت رکھتا ہو۔ اس کی آرزوئیں اور امنگیں جواں ہوں۔ امید کا دامن اس کے ہاتھ ہی میں ہو تو انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی نے چالیس برس کی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ تم اتنے ہی بوڑھے ہو جتنا کہ تم محسوس کرتے ہو۔ جسم کا بڑھاپا اور چیز ہے۔ ذہن کی پیری اور چیز ہے۔ ذہن کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ تم اب بھی سب کچھ کر سکتے ہو۔ اپنی خودی کی تکمیل اب بھی کر سکتے ہو۔ مجبوریوں کو توڑ دو۔ جس قفس میں تم مقید ہو اسے خیر باد کہہ دو۔ قوتِ ارادی ہو تو راہ خود بخود نکل آئے گی۔

ع عزم راسخ ہو تو ہو جاتے ہیں ساماں پیدا"

"میں اس کا جلد ہی فیصلہ کرنے والا ہوں۔ صرف آپ کی رہنمائی کی ذرا ضرورت ہے"

میں نے جواب دیا۔ "آٹھ سالہ ابتدائی کورس کی وضاحت فرمایئے۔"

مائیکل: "پہلے سال میں طالب علموں کو اس زبان سے روشناس کرایا جائے جو تعلیم کا ذریعہ بنے گی۔ مثلاً ہندوستان میں ہندوستانی۔ اس کے ساتھ ریاضی سے تعارف بھی ہو۔ دوسرے سال زبان کے علاوہ حساب کی جمع۔ تفریق۔ ضرب اور تقسیم سکھائی جائے۔ تیسرے سال میں ہائیجن اور فزیالوجی کے علاوہ اپنے صوبہ کا جغرافیہ شامل کر دیا جائے۔ حساب کی ضرورتا واقفیت کافی ہے۔ زیادہ حساب پر دقت صرف کرنا بیکار ہے۔ جو طالب علم ریاضی کا دلدادہ ہوگا اس کے لئے بعد میں کافی گنجائش ہوگی۔ چوتھے سال میں ہندوستان کا مختصر جغرافیہ اور مختصر تاریخ کا آغاز کر دیا جائے۔ ہائیجن اور فزیالوجی کی جگہ علم الطبیعات سے تعارف کرایا جائے۔ ریاضی کی جگہ الجبرا کا درس دیا جائے۔ پانچویں سال میں تعلیمی زبان کے علاوہ کوئی دوسری غیر ملکی زبان مثلاً انگریزی شروع کر دی جائے۔ تاریخ ہند اور جغرافیہ ہند اس سال ختم ہو جانا چاہیئے۔ الجبرا کا سبق جاری رہے۔ فزکس کا کورس بھی جاری رہے۔ چھٹے سال میں تعلیمی زبان کی جگہ انگریزی کو دے دی جائے۔ دنیا کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ کا کورس شروع کر دیا جائے جو آٹھویں سال میں مکمل ہو جائے۔ فزکس کیساتھ کیمسٹری کا تعارف بھی کروا دیا جائے اور الجبرا کی جگہ جومیٹری کا ابتدائی درس دیا جائے۔ ساتویں سال میں انگریزی۔ تاریخ اور جغرافیہ کا کورس جاری رہے۔ فزکس اور کیمسٹری کی جگہ ابتدائی علم الحیوانات اور نباتات کی تعلیم شروع کی جائے۔ جومیٹری کی جگہ ڈرائنگ شروع کی جائے اور فلسفہ۔ دینیات۔ اخلاقیات اور سائیکالوجی کا تعارف کروایا جائے۔ آٹھویں سال میں ساتویں سال کے مضامین جاری رہیں۔ امتحان تین تین ماہ بعد لیا جائے۔ اور ترقی چاروں سہ ماہی امتحانات کے اوسط نمبروں کی بنا پر دی جائے۔ آٹھویں سال کے اختتام پر یونیورسٹی کا امتحان ہو۔ جس جس مضمون میں کوئی فیل ہو جائے اس کا سہ تین مہینہ بعد امتحان ہو۔ آٹھویں سال کے اختتام پر طالب علم کو تصفیہ کر لینا چاہیئے کہ وہ کالج میں کیا مضامین انتخاب کرے۔ کالج

کا کورس چار سال کا ہو۔ اور تین چار مضامین کا ایک ایک مجموعہ ایسا ہو جو کسی مخصوص پیشہ کے اختیار کرنے میں معاون ہو۔ مثلاً حساب۔ الجبرا۔ جومیٹری۔ فزکس اور ڈرائینگ انجنیئرنگ کے کورس کے لیئے ضروری ہیں کیمسٹری۔ بیالوجی۔ بوٹانی۔ زوآلوجی وغیرہ میڈیکل کورس کے لیئے لازمی ہیں۔ اسی طرح تاریخ۔ جغرافیہ۔ سیاسیات اور معاشیات کاروباری سیاسی یا حکومت کے شعبوں میں ملازمت کے لیئے مفید ہونگے۔ علم ادب۔ فلسفہ۔ دینیات۔ اخلاقیات اور علم النفس ادبی یا اخباری یا فنونِ لطیفہ کی قسم کے پیشوں کے لیئے لازمی ہیں۔ یہ مضامین ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور ان چاروں مجموعوں میں سے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ مگر انتخاب کرتے وقت پیشہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پیشہ کے مطابق مضامین کا انتخاب عمل میں لانا چاہیئے۔ چار سالہ یونیورسٹی کورس کے بعد پیشہ کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ معاشی کورس چار پانچ سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کورس کے پاس کرنے پر اس مخصوص آرٹ کے ماسٹر ہونے کی سند ملنی چاہیئے۔ دراصل بی۔ اے اور ایم۔ اے غلط اصطلاحیں ہیں۔ ان ڈگریوں کا حصول کسی بھی آرٹ کا ماسٹر نہیں بناتا۔ البتہ کسی پیشہ کے سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس لیئے یہ ڈگریاں تو فقط کلرک بناتی ہیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ چار سالہ یونیورسٹی کورس میں کامیابی حاصل کرنے پر عالم کی ڈگری عطا کی جائے۔ جو طالب علم کسی خاص علم سے لگاؤ رکھتا ہے اور اسی کو پیشہ بنانا چاہتا ہے اسے چار سال اور ایک ہی علم کی مفصل تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے پر اسے ماہرِ علم کی ڈگری دی جائے۔ اسی طرح کسی فن میں کامیاب ہونے پر ماہر فن کی ڈگری ملنی چاہیئے۔ اس طریق پر عمل پیرا ہونے سے طالب علم اکیس بائیس سال کی عمر میں ماہرِ علم یا ماہرِ فن بن سکتا ہے اور وہی پیشہ آسانی سے اختیار کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کے لیئے کام مہیا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ ڈگری تو ماہرِ علم ادب کی ہو اور کام اس سے کلرکی یا حساب کتاب کا لیا جائے۔ یا فلسفہ کے ماہر کو کارخانے کا منیجر بنا دیا جائے۔ موجودہ حالات اور نظام حکومت میں یہی بے راہروی مستعمل ہے

اس لیے حکومت کے ذمہ یہ اہم فرض ہے کہ ہر شخص کی تکمیل خودی میں اعانت کرے۔ اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے۔ اور اس کے لئے کام مہیا کرے۔ بیکاری کا نام و نشان تک نہ ہو۔ کوئی شخص بھی معاشی تفکرات سے دوچار ہونے نہ پائے۔ تعلیم ابتدائی کورس سے لیکر ماہر علم و فن کی ڈگری حاصل کرنے تک کے تمام فرائض حکومت کے ذمہ ہوں۔ تعلیم کے اختتام پر بیکاری سے کوئی بھی دوچار نہ ہونے پائے۔ یہ ہے آدرش جو انسان کے شایان شان ہے۔"

"اچھا تو عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے" میں نے پوچھا۔

مائیکل: "آٹھ سالہ ابتدائی تعلیم کا کورس لڑکیوں کے لئے بھی یکساں ضروری ہے۔ میں مخلوط تعلیم کا حامی ہوں مگر جو اقوام پردہ کی پابند ہیں۔ وہ لڑکیوں کو علیحدہ تعلیم دلواسکتی ہیں۔ سکول دونوں قسم کے ہونے چاہئیں۔ اس کورس کے اختتام پر جو لڑکیاں کوئی مردانہ پیشہ اختیار کرنا چاہئیں وہ کالجوں میں تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ اور ماہر علم یا فن کی ڈگری لے سکتی ہیں۔ مگر جو لڑکیاں بہترین بیویاں اور مائیں بننا پسند کرتی ہیں۔ انہیں اس ابتدائی کورس کے بعد چار سالہ کورس پاس کرنا لازمی ہوگا۔ اس کے پاس کئے بغیر کوئی عورت شادی نہیں کر سکتی۔ اس کورس میں تمام ضروری امور مثلاً سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ بچوں کی پرورش۔ نرسنگ اور جنسیات وغیرہ کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ بے خطر ازدواجی زندگی میں قدم رکھ سکیں اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے پر عالم کی ڈگری عطا کی جائے۔ اس طرح ایک عالم مرد کیلئے عالم بیوی میسر آسکے گی۔ جو لوگ ابتدائی کورس سے آگے بڑھنے کے اہل نہ ہوں۔ انہیں کسی پیشہ میں شاگرد کے طور پر شامل ہونے میں حکومت اعانت کرے۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ تعلیم کس عمر سے شروع ہو اور تربیت کس طرح ہو" میں نے کہا

مائیکل: "ابتدائی تعلیم جو ہر مرد و عورت کے لئے لازمی ہوگی اس کے ساتھ تربیت بھی معلموں کا فرض ہوگی۔ والدین پر تربیت کی ذمہ داری زیادہ عاید ہوتی ہے۔ تربیت نہایت ضروری چیز ہے اور اس کے لئے بہترین وقت بچپن کا ہے۔ یہی وہ عمر ہے جس وقت بچہ اچھی یا بری

عادت اختیار کرتا ہے۔ یہ عادات فطرتِ ثانی ہیں متبدل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر جوانی میں ان کا تبدیل کرنا ایک امر محال بن جاتا ہے۔ اس لئے تربیت کا صحیح زمانہ بچپن ہی ہے معلموں اور والدین کو اس طرف گہری توجہ مبذول کرنی چاہیئے تعلیم کسی عمر میں بھی حاصل کی جا سکتی ہے مگر تربیت کے لئے پھر موقعہ ہاتھ نہیں آسکتا۔ اخلاقی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنی کہ دوسرے علوم سے واقفیت۔ انہی عادات سے کسی انسان کا کردار بنتا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں تاثرات جو نقوش ذہن پر بنا دیتے ہیں وہ پھر مٹائے نہیں مٹتے۔ یہ نقوش لاشعور کا جزو بن جاتے ہیں اور شعور ان سے رہائی نہیں پا سکتا۔ مثل مشہور ہے کہ جو ہاتھ بچہ کا پنگھوڑا ہلاتا ہے۔ وہ دنیا پر حکومت کرتا ہے کسی قوم کی ترقی کا راز اس کے افراد کا اعلےٰ کردار ہے تعلیم تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔"

انصر "تربیت کا بہترین زمانہ تو بیشک بچپن ہی ہو سکتا ہے۔ مگر تربیت کا بہترین طریقہ کیا ہے"

مائیکل "تربیت کا بہترین طریقہ بچوں کو کہانیاں سنانا ہے۔ بچے کہانیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کہانی سننے کا شوق انسان کا تمام عمر ساتھ دیتا ہے۔ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے ہم افسانے۔ ناولیں اور ڈرامے سنتے اور پڑھتے ہیں اور یہی جذبہ ہمیں تھیٹر اور فلم دیکھنے پر اکساتا ہے۔ علم ادب تفریح بھی ہے اور اصلاح بھی لطیف پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے ناگوار نہیں گذرتا۔ کہانیاں سننا فطری اقتضا ہے۔ اس لئے بچوں کو شروع میں صرف کہانیوں سے محظوظ کرو۔ اخلاقی درس ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ نیکی اور بدی کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔ مگر کہانی میں نیکی اور بدی کے کردار کو عمل کرتے ہوئے محسوس کر سکتے ہیں کیبنبکا کی کہانی میں ہم وفاداری کو مجسم طور پر ثبوت بنا کر پیش کرتے ہیں بچے وفاداری کی کہانی سن کر اپنے دل میں ایک جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ اس بہادر لڑکے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح اعلےٰ کارنامے ہمیں اعلےٰ کارناموں کی ترغیب دیتے ہیں۔ جنگ کے وقت بہادروں کے کارنامے سنائے جاتے ہیں۔ جو جوش و خروش میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاعر منظوم کارنامے بیان کرتے ہیں۔ اور سپاہی سر دھڑ کی بازی لگا

دیتے ہیں۔موجودہ جنگ میں امریکی پراپیگنڈا فلموں نے بیحد کام کیا ہے۔کہانیاں کس قدر دلچسپ تھیں اور مقصد خود بخود دیکھنے والوں کے ذہن کو متاثر کر دیتا تھا۔جاپان اور جرمن کے خلاف نفرت اسی طریق پر پیدا کی گئی۔اس لئے کہانی کی اہمیت سے احتراز ناممکن ہے۔لیکن کہانیوں کے انتخاب میں احتیاط بہت اہمیت رکھتی ہے۔کس قسم کی کہانی کس عمر کے بچے کو پیش کرنی چاہیئے ایک غور طلب بات ہے۔کہانیاں لاتعداد ہیں۔اس لئے انتخاب آسان کام نہیں ہے۔معلموں اور والدین کو اس معاملے میں بڑی دانائی سے کام لینا چاہیئے۔ایک بارہ سال کا لڑکا سات سال کی عمر کے بچے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔وہ پریوں کی کہانی کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ یہی کہانیاں بچپن میں اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دیا کرتی تھیں۔وہ اب ٹھوس حقیقت چاہتا ہے۔وہ ایسے ہیرو کے کارنامے سننا پسند کرتا ہے۔جو واقعی اس دنیا میں گزر چکے ہیں۔اس لئے عمر کے مطابق کہانیوں کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔بس یہ اصول سمجھ لیجئے کہ بچوں کو ان کی سمجھ سے بالاتر کہانی سنانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ انکو مجھ سے گھٹیا کہانی سنانے سے ہو سکتا ہے۔معلم کو بچوں کی نفسیات سے واقفیت لازمی ہے میرے خیال میں ابتدائی کورس کے معلموں کے لئے ایک سال کا کورس مقرر ہونا چاہیئے۔جو بچوں کی تربیت اور ان کی نفسیات کے متعلق آگاہ کرے۔ابتدائی کورس کے معلموں کے لئے عالم کی ڈگری کافی ہے۔اس لئے مدرس بننے کے لئے ایک یا دو سال کا نصاب مقرر ہو جس میں تعلیم و تربیت کے طریقوں سے آگاہ کیا جائے۔اس امتحان کو پاس کر لینے پر ماہر درس کی ڈگری عطا کی جائے۔اس سند کے بغیر کوئی معلم یا مدرس مقرر نہ کیا جائے۔"

النصر:"اس امر کی ذرا وضاحت فرمائیے۔"

مائیکل:"مثال کے طور پر معلم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ بچے شرارتیں کیوں کرتے ہیں۔یا وہ غلط راہ کیوں اختیار کرتے ہیں اور کس طرح انہیں صحیح راستے پر لگایا جا سکتا ہے۔بچے ضد کیوں کرتے ہیں۔وہ کیا چاہتے ہیں۔ہم ان بچوں کو شرارتی۔ضدی اور خراب کہہ کر اکتفا کر لیتے ہیں۔مگر ان کی اصلاح کا طریقہ نہیں جانتے۔ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ بھی بےسود

ثابت ہوتی ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ یا تو بچہ میں کام کرنے کی قوت معمول سے زیادہ ہے یا بہت کم۔ ضد۔ سستی۔ شرمیلا پن۔ ڈرپوک ہونا۔ جھوٹ بولنا وغیرہ اس امر کی دلیل ہیں کہ بچہ میں قوت کی کمی ہے۔ وہ عالی ہمت نہیں ہے۔ اس کے برعکس غصیلا۔ جھگڑالو۔ شرارتی چوری اور لوٹ مار کرنے والا بچہ قدرت کی عطا کی ہوئی قوت سے مالا مال ہوتا ہے۔ یہ ایک قوت ہے جو غلط راستہ اختیار کر چکی ہے۔ اس کی مثال ایک ہوائی جہاز کی سی ہے جو بمباری بھی کر سکتا ہے اور مسافروں کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی خدمت بھی سرانجام دے سکتا ہے۔ اس لئے ایک بچہ جو اس قوت سے مالا مال ہے۔ وہ اس قوت کو صرف کرنا چاہتا ہے یعنی موٹر میں پٹرول بھرا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے جا رہی ہے مگر ڈرائیور موجود نہیں۔ اس کے برعکس جو بچہ کم قوت کا ہے اس کی موٹر میں پٹرول ہی نہیں تو ڈرائیور بیکار ہے۔ مجھے ایک کہانی یاد آئی ہے سنیئے۔ ایک سکول کے پرنسپل نے آٹھویں جماعت میں لکڑی کے کام کی تعلیم اپنے طور پر شروع کر دی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ بات یہ تھی کہ عام لڑکوں کی طرح اس سکول کے لڑکے بھی میزوں اور ڈیسکوں پر چاقو سے اپنے اپنے نام کھود ڈالتے تھے۔ اس جذبہ کا اظہار آپ نے کئی جگہ مشاہدہ کیا ہوگا۔ قطب مینار کی آخری منزل پر مقبروں کی دیواروں پر، درختوں کے تنوں پر، اور مرنے کے بعد قبروں پر کندہ کئے ہوئے نام سب اسی جذبہ کی کارفرمائیاں ہیں۔ یہ جذبہ ہے دوسروں کی نظر میں اہمیت حاصل کرنا۔ اس جذبہ کا اظہار آرٹسٹ اپنی تصویر کے نیچے اپنا نام لکھ کر اور ایک مصنف اپنی کتاب کے سرورق پر اپنا نام چھپوا کر کرتا ہے۔ ایک حاکم اپنی مہر سے اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے۔ پرنسپل نے اس نفسیات کی روشنی میں اقدام کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے خود پرنسپل سے درخواست کرتے تھے کہ انہیں میزوں کو پالش اور مرمت کرنے کی اجازت دی جائے۔ کیونکہ ان کا نام میز کے کونے میں کندہ ہو سکتا تھا۔ وہ فخر کرتے تھے کہ یہ میز میں نے درست کی ہے۔ انصرِ بھیا یہ ''میں'' بڑے کام کرتی ہے۔ یہ سب تصنیفات عمارتیں اور عجائبات اسی ''میں'' کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ایک ڈاکو اور خونی بھی قابلیت کے جوہر سے

مالامال ہوتا ہے۔ کبھی انصر چوری بھی کی ہے۔ نہیں۔ میں نے اس کا بھی تجربہ کیا ہے۔ ورنہ میری تحقیق مکمل کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ فعل آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے ہمت چاہیئے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ چور اپنی قوت کو غلط راستے پر استعمال کرتا ہے۔ ایک سائنسدان یا شاعر اسے صحیح راستے پر گامزن کرتا ہے۔ "چارسوبیس" کرنے والے اپنی قابلیت کا ثبوت غلط طور پر پیش کرتے ہیں مگر ہیں وہ قابل —— اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شرارتی بچوں کو غنیمت جانو۔ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر شرارت سے باز نہ رکھو۔ ان کی قوت کو سلب نہ کرو۔ بلکہ اس قوت کو صحیح راستے پر لگا دو۔ علم و قوت فساد کی جڑ بھی ہیں اور انسان کے لئے کارآمد بھی۔ فرق صرف راستے کا ہے۔"

ساتواں باب

کامیاب زندگی

"مائیکل۔ میں تو اس دفتری زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ سارا دن افسروں سے بک بک رہتی ہے۔ میری رائے میں تو ہندوستانی حکومت کے ابھی تک اہل نہیں ہوئے۔ میں تو انگریزوں پر کوئی الزام عائد نہیں کرتا۔ وہ حکومت کرنا جانتے ہیں۔ اس لئے وہ راج کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے عیوب پر نگاہ ڈالنی چاہیئے۔ جس دن ہم حکومت کرنے کے قابل ہونگے اس دن طوق غلامی خود بخود اتر جائے گا۔ میں نے کم از کم آزاد ہونے کا تصفیہ کر لیا ہے۔ میں گو ایک معزز عہدے پر فائز ہوں مگر میں اس پر قناعت نہیں کر سکتا۔ میں اسے کامیابی تصور نہیں کرتا۔ مگر میرا تلخ تجربہ تو یہی ہے کہ تقدیر تدبیر سے زبردست ہے۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے" میں نے پوچھا۔

مائیکل "زندگی میں کامیابی کا مفہوم یہ ہے کہ تکمیل خودی ہو۔ اس کے متعلق آغاز میں گفتگو ہو چکی ہے۔ یعنی کسی فرد کی جسمانی اور ذہنی قوتیں ہر ممکن طور پر نشو و نما پائیں۔ کامل کامیابی کے معنی یہی ہیں جہاں تک ممکن ہو کسی فرد کی تکمیل خودی کی جائے۔ اس سلسلے میں پہلی حقیقت یہی مدنظر رکھنی چاہیئے کہ ہر فرد کی قدرتی قوتیں محدود ہیں۔ ہر فرد اس لحاظ سے مختلف ہے کسی شخص کی صلاحیت اس کی انفرادی قوت سے معلوم کر سکتے ہیں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ تو یہی ثابت کرتا ہے کہ ہر فرد قدرتی قوتیں اور صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور

ماحول پر موقوف ہے حقائق سے انکار کرنا ہے۔ شاعر۔ ادیب۔ آرٹسٹ۔ سائنسدان پیدا ہوتے ہیں۔ بنائے نہیں جاتے۔ قدرتی صلاحیتیں ایک ناتراشیدہ ہیرے کی طرح ہیں جنہیں محنت سے ایک انمول ہیرے میں مبدل کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کامیابی کا اندازہ ہم نسبتاً ہی کر سکتے ہیں۔ یعنی قدرتی صلاحیتیں کیا ہیں اور ان کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ ہر شخص اقبال یا غالب نہیں ہوسکتا۔ ایک معمولی ماسٹر اگر کسی کالج کا پرنسپل ہو جائے تو اس کی زندگی کامیاب کہلائی جا سکتی ہے۔ ایک سپاہی جد وجہد کر کے جرنیل یا کمانڈر انچیف کے عہدہ تک پہنچ سکتا ہے یا کسی ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ اس کی زندگی بے شک کامیاب ہے۔ مگر سپاہی شاعر یا ادیب بننے کی خواہش کرے تو اسے کامیابی کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اگر وہ ایسا کرے تو اسے کوئی کامیابی کی امید نہیں رکھنی چاہیئے اور ناکامیابی پر کوئی افسوس بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ایک گوئیے کی مثال ہے۔ وہ خواہ گانے اور موسیقی کی تمام تکنیک سے واقف ہو مگر رسیلے گلے یا خوش آواز کی عدم موجودگی میں وہ لوگوں کو محظوظ نہیں کر سکے گا۔ اس لئے وہ عام اصطلاح میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے۔ اسے کامیابی حاصل ہے کیونکہ وہ تکنیک کا ماہر ہے۔ اور اس علم کو وہ موسیقی کی طرزیں اختراع کرنے میں استعمال کر سکتا ہے۔ اور ناموری حاصل کر سکتا ہے۔ مگر خود کامیاب گویا نہیں بن سکتا۔ اگر قدرت نے اسے آواز عطا نہیں کی۔ آواز قدرت کا عطیہ ہے۔ گانے کا علم اپنی محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعرانہ مذاق قدرت کا عطیہ ہے۔ ایک قدرتی جرنیل۔ لیڈر۔ سائنسدان۔ شاعر یا ادیب کا درجہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ جو صرف محنت کے بل بوتے پر پروان چڑھے۔ اس لئے پہلا اصول یہ ہے کہ خواہشات اور قدرتی صلاحیتوں میں امتیاز کیا جائے۔ خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ انسان پرندوں کی طرح پر لگا کر نہیں اڑ سکتا مگر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پرندوں پر سبقت لیجا سکتا ہے۔

اس لئے ایسی خواہش رکھنا بے معنی ہے جس کا حصول ناممکن ہو۔ اس سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کامیابی کا انحصار

قدرتی صلاحیت پر ہے۔ ہر شخص ایک خاص حد تک کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے
زیادہ نہیں۔ ایک کمزور انسان اپنی جسمانی قوتوں کے مطابق صحت کو بہتر بنا سکتا ہے
اگر وہ سینڈو یا گاماں پہلوان بننا چاہے تو اس کی یہ تگ و دو عبث ممکن ہے۔ کیونکہ یہ اس
کا قدرتی حق نہیں ہے۔ اس کی کامیابی کی ایک حد مقرر ہے۔ جس سے آگے بڑھنے کی
خواہش اس کا حق نہیں ہے۔ اس لئے خواہش کو حق تصور نہ کرو۔ اپنے بچوں کی صحت
آپ بہتر بنانے کے خواہشمند ہیں تو اس آدرش کے حصول کے لئے لازمی امر یہ ہے کہ
تمہاری اپنی صحت بہت اچھی ہو۔ اور بیوی کی صحت بھی اچھی ہو۔ اس طرح بچوں کی
قدرتی صحت کی امید کر سکتے ہو اور پھر انکی صحت کو اور بہتر بنا سکتے ہو۔ نسلیں اسی طرح
بہتر بنائی جا سکتی ہیں۔ تمہارے آباؤ اجداد اگر صحت کا خیال نہیں رکھتے تھے تو اس کا
تمہیں بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لئے کوشش فرض ہے۔ جو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے وہ
جائے گی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح تم بھی دولت مند ہو سکتے ہو مگر راک فیلر
نظام حیدر آباد نہیں بن سکتے۔ کیونکہ کامیابی کا انحصار چار باتوں پر ہے۔ تم

(۱) قدرتی صلاحیت۔

(۲) موافق حالات اور ماحول۔
(۳) حالات یا ماحول کو موافق بنانے کے امکانات
(۴) محنت یعنی موافق ماحول وغیرہ سے استفادہ

کامیابی قدرت کا عطیہ نہیں ہے۔ قدرت صرف قوت اور صلاحیت عطا کرتی ہے
اسے نشو و نما دینا۔ موافق حالات سے استفادہ کرنا۔ محنت سے حالات کو اپنے موافق
بنانا اور قدرتی قوت پر جلا کرنا انسان کی اپنی جدوجہد ہے اور اسی پہ کامیابی کے مدار
کا انحصار ہے۔ اس روشنی میں یہ مسئلہ یہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔
(۱) پہلے اپنی قدرتی صلاحیتوں کا جائزہ لو۔ یہ آگہی حاصل کرو کہ قدرت تم سے کیا

کام لینا چاہتی ہے؟ کیا کام تم بہترین طور پر سر انجام دے سکتے ہو؟ کس پیشہ شغل یا کام میں تمہیں زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے؟

(۲) اس سوال کا جواب پا لینے پر اگلا قدم یہ ہے کہ موافق حالات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ ناموافق حالات کو موافق بنانے کا طریق سوچا جائے۔ اور امکانی موافق ماحول کو زیر استعمال لایا جائے۔ تمہارا ناموافق حالات سے استفادہ کرنا (۳) امر کی [illegible] ہے کہ تم موافق حالات سے بہت فائدہ اٹھا سکو۔ اگر تم نے موافق حالات سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر یہ تمہارا قصور ہے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور ایمانداری سے ان سوالوں کا جواب دو۔

(۱) کیا تم نے اپنی قدرتی قوتوں اور صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنایا ہے؟

(۲) کیا تم نے موافق ماحول سے کوئی استفادہ کیا ہے؟ یا پوری طرح اپنے ذرائع کامیابی کو استعمال میں لائے ہو؟

اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔"

"بے شک پوری طرح نہیں" میں نے جواب دیا۔

"اس لئے مکمل طور پر اپنے آدرش کے حصول کے لئے جدوجہد کرو۔ اس بات کی پرواہ مت کرو۔ کہ کامیابی کس درجہ تک حاصل ہوگی۔ وقت اس کا فیصلہ کریگا۔ تمہارا کام کامیابی کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ ایسے بھی حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ کامیابی خود تمہارے قدم چوم لے۔ تمہارا آدرش تمہارے پاؤں میں آگرے۔ سب کچھ ممکن ہے مگر تمہارا فرض صرف جدوجہد کرنا ہے۔ خواہ آدرش کا حصول غیر ممکن ہو۔ پھر بھی تمہاری جدوجہد ایک کارنامہ بن کر دلوں میں یاد رہے گی۔ محنت کبھی برباد نہیں ہوتی۔ کامیابی کا ایک سنہری گر یاد رکھو اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ "کبھی امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دو۔ جو کچھ دوسرے انسان کر سکتے ہیں تم بھی کر سکتے ہو۔ ہمت کبھی نہ ہارو۔ کامیابی تمہارے قدم ضرور چومے گی اپنی قوتوں پر کامل اعتماد اور قوتِ ارادی ایسی صفات ہیں۔ جو ہر آدرش کا حصول ممکن بنا دیتی ہیں۔ ہر خواہش کی تکمیل کر سکتی ہیں بشرطیکہ محنت ہمت اور استقلال سے کام لیا جائے احساسِ کمتری تمہارے راستے میں زبردست رخنہ ہے۔ تمہاری کامیابی کے حصول میں

سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ تم اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہو۔ دوسروں سے اپنے آپ کو کمتر تصور کرتے ہو۔ یہ خیالات تمہارا حوصلہ پست کر دیتے ہیں۔ تم مصائب کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے تو نہیں مگر تمہیں تشویش ضرور رہتی ہے کسی کی پرواہ مت کرو۔ اپنے آورش کے حصول کے لئے جان لڑا دو۔ تم کسی سے کم نہیں ہو۔ قدرت نے تمہیں بھی قوت اور صلاحیت بخشی ہے۔ ان کو بروئے کار لاؤ۔ موافق حالات اور ماحول سے ہر ممکن استفادہ حاصل کرنے کی سعی کرو۔ ناموافق حالات کو موافق بنا لو۔ اپنی تکمیل خودی کے راستے میں جس چیز کو رکاوٹ سمجھو اسے ٹھوکر سے ہٹا دو۔ آگے بڑھتے چلو۔ آگے بڑھتے چلو۔"

دوسرے دن میں نے ملازمت سے استعفے دے دیا۔ اب میں بھی آزاد تھا۔

آٹھواں باب

دولت۔ سرمایہ اور مزدِ محنت

مائیکل۔ ابتدائی انسان کی ضروریاتِ زندگی غذا۔ چند کھالیں اور ایک غار تک محدود تھیں تہذیب کی ترقی کے ساتھ اس کی روزانہ ضروریات بھی بڑھتی گئیں۔ آج کے انسان کے لئے صرف زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے، اچھی غذا۔ ملبوسات۔ دوائیاں۔ مکان۔ فرنیچر۔ برتن۔ کتابیں۔ تصاویر۔ ریڈیو۔ موٹر ایسی ضروریات کی طلب ہے۔ یہ تعیش نہیں انسان کی ذہنی ترقی کے لحاظ سے یہ راحتیں ضروریات کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ابتدا میں ایسی راحتیں میسر نہیں تھیں۔ اس لئے انسان کی ضروریات بڑی محدود تھیں۔ لیکن جب انسان نے آوارہ اور شکاری زندگی کو ترک کرکے گھروں میں سکونت اختیار کر لی اور مہذبانہ سماجی زندگی بسر کرنی شروع کر دی تو اس کی ضروریات میں اضافہ ہو گیا۔ ابتدا میں ہر انسان اپنی تمام ضروریات روزانہ خود پیدا کر لیا کرتا تھا مگر ضروریات کی کثرت نے اسے کچھ اور ذریعہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ اکیلا زمین کی کاشت نہیں کر سکتا تھا۔ غذا کا انتظام نہیں کر سکتا تھا۔ کپڑا نہیں بن سکتا تھا۔ مکان تعمیر نہیں کر سکتا تھا۔ فرنیچر اور برتن تیار نہیں کر سکتا تھا۔ ان راحتوں سے وہ دست کش بھی ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اور اکیلے تمام راحتوں کو مہیا کرنا بھی اس کے لئے محال تھا۔ اس لئے جب خیموں اور جھونپڑیوں نے مکانوں اور عمارتوں کی صورت اختیار کی آبادیاں بستیوں۔ دیہاتوں اور شہروں میں تبدیل ہو گئیں

اس وقت ہر انسان نے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ ایسی چیز پیدا کرتا تھا جس کی دوسرے انسانوں کو ضرورت ہو۔ اور اس طرح اپنی ضرورت کی چیز کے بدلے میں وہ اپنی پیدا کردہ اشیاء کو دوسرے کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہ تھا طریقِ تبادلہ۔ یعنی ایک کسان جس کے پاس غلّہ یا بھیڑ بکریاں تو موجود تھیں۔ مگر کپڑے جوتے یا برتن نہیں تھے۔ وہ ایسے شخص کی تلاش میں مصروف رہتا تھا جس کے پاس اس کی اپنی ضرورت کی چیزیں موجود ہوں مگر مشکل یہ پیدا ہوتی تھی کہ دوسرے شخص کو غلّہ یا بھیڑ بکریوں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پھر تبادلہ کیسے ہو؟ اس وقت کو رفع کرنے کے لئے غلّہ شئے تبادلہ ٹھہرایا گیا۔ یعنی غلّہ وہی فعل سرانجام دیتا تھا۔ جو موجودہ زمانہ کے سکّے۔ نوٹ اور چیک وغیرہ اس طریق کار سے ایک شخص اپنی اجناس کو مارکیٹ میں لے جاتا تھا۔"

"اجناس کا مطلب کیا ہے۔ اس کی وضاحت فرمایئے۔" میں نے کہا۔

مائیکل: "اجناس ان تجارتی اشیا کا نام ہے۔ جو کسی انسانی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔ یہ ضرورت کسی طریق سے پوری ہو اس سے غرض نہیں۔ مثلاً ایک روٹی ہماری بھوک کی تسکین بالواسطہ عمل میں لاتی ہے۔ مگر ایندھن۔ توا۔ پانی۔ آٹا گوندھنے کا برتن اسی ضرورت کو بلاواسطہ تسکین دینے میں مدد دیتے ہیں۔ جس حد تک کوئی جنس یا تجارتی شے کارآمد ہو سکتی ہے اس کی اتنی ہی قدر ہوتی ہے۔ اس لئے قدر کا انحصار کارآمد ہونے پر ہے ہر چیز اپنی مخصوص قدر کی مالک ہے۔ اجناس کی قدر مقابلتاً قیمت سے ظاہر کی جاتی ہے جتنی قدر کسی جنس کی زیادہ ہو اتنی ہی قیمت اس کی زیادہ ہوتی ہے۔ جب قدر کم ہو جاتی ہے۔ قیمت بھی گر جاتی ہے۔ قدر کا موازنہ کرتے وقت ہم صفت کو ملحوظ رکھتے ہیں قیمت کا موازنہ کرتے وقت ہم **تعداد** کا خیال رکھتے ہیں۔ اس تبادلہ کی قیمت کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اتنے گز ریشم کا کپڑا اتنے روپوں کو مل سکتا ہے۔ فرض کرو ایک شخص کے پاس بیس گز ململ ہے۔ اس کی قیمت دس روپے ہے۔ وہ فروخت کرنے کے بعد دس روپے کا مالک بن جاتا ہے۔ اسے مطالعہ کا شوق ہے۔ اسلئے وہ دس روپے میں

ایک کتاب خرید لیتا ہے۔ تبادلہ یوں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

جنس .... سکہ .... جنس

یعنی پہلے اس شخص کے پاس بیس گز ململ تھی۔ اب ایک کتاب ہے۔ قدر و قیمت کے لحاظ سے دونوں اجناس یکساں ہیں۔ مگر کارآمد ہونے کی صورت مختلف ہے۔ سکہ صرف تبادلہ کا ذریعہ ہؤا۔ دراصل اس معاملہ کی صورت اتنی ہے۔ جنس کے بدلے جنس۔ یعنی خریدنے کی خاطر فروخت کرنا۔ یہ اجناس کا کاروبار ہے۔ مگر اس کے علاوہ ایک دوسرے قسم کا کاروبار بھی ہے۔ یعنی فروخت کرنے کے لئے خریدنا۔ ایک شخص سو روپے کا مالک ہے۔ وہ سو گز گرم کپڑا خریدتا ہے۔ اور پھر اس کپڑے کو فروخت کر دیتا ہے۔ اگر وہ سو روپے میں ہی فروخت کر دے تو اس کا یہ فعل بیہودہ ہے۔ اس لئے وہ منافع پر فروخت کرتا ہے۔ فرض کرو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سو روپے کے ایک سو دس روپے بن جاتے ہیں اس کاروبار کی صورت یہ ہوئی۔ سکہ .... جنس ..... سکہ جمع منافع۔

تبادلہ اجناس کا مقصد صرف ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ کتاب اور کپڑا دونوں استعمال میں آئے اور یہ تجارت مکمل ہو گئی۔ مگر سو کے ایک سو دس بنانے والا شخص سکے کو نہ کھا سکتا ہے نہ پہن سکتا ہے۔ سکہ بالواسطہ تو کوئی انسانی ضرورت پوری نہیں کر سکتا اس کا فائدہ اسی صورت میں ہے جب وہ اس سے اجناس خرید کر استعمال میں لائے یا ایک سو دس کا پھر وہی چکر شروع کر دے اور ایک سو دس کے ایک سو بیس بنا ڈالے۔ اس طرح روپیہ سرمایہ میں مبدل ہوتا ہے۔ یہ منافع ہی ایسی مد ہے جو روپیہ یا سکے کو سرمایہ میں بدل دیتا ہے۔ اسی طرح سکہ بالواسطہ سود کے منافع کی صورت میں بھی سرمایہ میں مبدل ہو جاتا ہے۔ تمام اجناس میں ایک جزو باہم ہے اور وہ ہے محنت کی پیداوار۔ اسی محنت پر قیمت کا انحصار ہے۔ قیمت محنت کے اظہار کی صورت ہے۔ سونا چاندی وغیرہ قیمت کی صورتیں ہیں۔ اور مہذب انسانوں میں ہی کام دے سکتی ہیں کسی صحرا یا جنگل میں سونا چاندی اور جواہرات کسی کام نہیں آ سکتے۔ ان سے بھوک پیاس اور دوسری

انسانی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ جہاں کوئی آبادی نہ ہو وہاں رابن سن کروسو کی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی اپنی محنت سے پیدا کرنا ہونگی۔ نتیجہ یہی نکلا کہ محنت سے اجناس پیدا ہوتی ہیں۔ جو کچھ زمین کے اُوپر ہے یا مدفون ہے۔ وہ محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ اجناس کو ہم دولت سے موسوم کرتے ہیں۔ دولت کا مطلب صرف سونا۔ چاندی۔ زمین یا جائیداد نہیں ہے۔ ایک حسین عورت حسن کی دولت سے مالامال ہوتی ہے۔ اس جنس کی قدر و قیمت بے پناہ ہے۔ اسی طرح علم و فن بھی دولت میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک مہذب سماج میں انسانی ضروریات کی تکمیل کے دو ہی ذرائع ممکن ہیں۔ ایک دولت دوسری محنت۔ پہلے دولت کو لیجئے۔ دولت یا سرمایہ کا فارمولا میں بتا چکا ہوں یعنی سکہ ...... جنس ...... سکہ بمع منافع۔ سرمایہ کے زیرِ تحت زر۔ زمین۔ جواہرات۔ جائداد۔ کارخانے۔ مشینیں وغیرہ آتی ہیں۔ اس سرمایہ کی بدولت اجناس کی پیداوار کی جاتی ہے اور پھر ان اجناس کو منافع پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سرمایہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یا سود منافع کی صورت میں بڑھتا چلا جاتا ہے اس طرح سرمایہ دار اپنے پیچھے اتنی دولت چھوڑ جاتا ہے۔ جو اس کے پسماندگان کو عیش و راحت مہیا کر سکتی ہے۔ سرمایہ داری کاروبار کا اصول یہی ہے کہ جنس کو زیادہ منافع پر فروخت کر دیا جائے۔ یہی منافع دولت کو سرمایہ میں مبدل کرتا ہے۔ سرمایہ کا مفہوم ذہن نشین کر لیجئے۔ فقط دولت کا مالک ہونا سرمایہ داری نہیں ہے۔ فرض کرو ایک شخص رابنسن کروسو کی طرح ایک جزیرہ میں آباد ہو جاتا ہے۔ اپنی محنت سے وہ ایک مکان۔ فرنیچر۔ بھیڑ بکریاں۔ کھیت و باغات وغیرہ کا مالک بن جاتا ہے تو اس صورت میں وہ دولت مند کہلا سکتا ہے۔ مگر سرمایہ دار نہیں۔ سرمایہ دار اس صورت میں بنے گا۔ جب وہ دوسرے انسانوں سے کام لیکر ان کی محنت کی پیداوار کو اپنی لاگت سے زیادہ قیمت پر فروخت کرے گا اور منافع اپنی جیب میں ڈالے۔ سرمایہ دارانہ کاروبار کی تین صورتیں ہیں (۱) اجناس سے بالواسطہ منافع حاصل کرنا مثلاً جائداد کا

کرایہ مصنوعات یا انسانی راحتوں کے سامان کی پیدائش وغیرہ (۳) پیدا کردہ اجناس کو خرید کر منافع پر فروخت کرنا"

النصر: "اس کا مطلب یہی ہوا کہ سرمایہ داری کے درجے ہیں۔ اور چھوٹے سے لیکر بڑا کاروبار کرنے والا سرمایہ دار کہلا سکتا ہے"

مائیکل: "بیشک مگر فرق صرف یہ ہے کہ ایک دکاندار جو اجناس خرید کر منافع پر فروخت کرتا ہے۔ وہ سرمایہ داروں میں شامل نہیں ہے۔ منافع اس کی محنت کا صلہ ہے جو وہ اجناس مہیا کرنے کے سلسلے میں کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی خوانچہ والا بھی سرمایہ دار نہیں کہلا سکتا جو اجناس فروخت کرتا پھرتا ہے۔ اگر یہی خوانچہ والا یا دکاندار ایک دو ملازم رکھ لے۔ انکی محنت سے جو آمدنی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کہیں کم ان کو اجرت دے تو وہ سرمایہ داروں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔

النصر: "اچھا تو پھر مزدور کون ہوا؟ اور مزدو محنت کا سرمایہ سے کیا رشتہ ہے؟"

مائیکل: "محنت سے مراد تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ان قوتوں کو اپنے ذاتی کام میں صرف کرنا مزدوری نہیں کہلاتا۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں جو محنت صرف ہوتی ہے۔ وہ اس محنت سے مختلف ہے۔ جو دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے لیئے کی جاتی ہے کسی دوسرے انسان کی بلا عوض خدمت یا ضرورت پورا کرنا بھی مزدوری کے تحت میں نہیں آتا۔ انسان مزدور اسی صورت میں کہلاتا ہے جب وہ دوسرے انسان کے لیئے اجرت پر محنت کرے۔ اپنی ضروریات کے لیئے خود اجناس کی پیداوار کرنا مزدوری نہیں کہلائی جاسکتی اور اس کی محنت کی پیداوار بھی اجناس نہیں کہلاتی ایسی اجناس بھی ہیں جو بیحد قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ مگر وہ بالکل مفت دستیاب ہوتی ہیں مثلاً ہوا۔ پانی۔ کنواری زمین اور جنگلات وغیرہ۔ ان پر کوئی انسانی محنت صرف نہیں ہوئی۔ مگر ان کی کارآمد قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیئے اجناس کہلانے کیلیئے ضروری ہے کہ کوئی جنس یا تجارتی شئے تبادلہ کے قابل ہو۔ جو چیز کسی کے کارآمد نہیں

ہو سکتی۔ وہ جنس کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ اور جو محنت اس پر صرف ہوتی ہے۔ وہ بیکار جاتی ہے۔ اور یہ محنت مزدوری نہیں کہلا سکتی کسی جنس کی قدر و قیمت اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کی پیدائش میں محنت صرف ہوتی ہے۔ مزدوری کی پیدائش وقت کے لحاظ سے ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی جنس کے تیار کرنے میں چھ گھنٹے صرف ہوئے۔ یہاں ایک اوسط انسانی قوتِ عمل کا ذکر ہے۔ فرض کرو کوئی شخص ایسی مشین ایجاد کرتا ہے۔ جو اسی چیز کو دو گھنٹے میں تیار کر سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہاتھ سے کام کرنیوالے کو تین گنا وقت صرف کرنا ہوگا اور اس کی پیدا کردہ جنس کی قیمت ایک تہائی رہ جائے گی۔ سرمایہ دار تجارتی اشیا کی تیاری کے لئے جن اجناس کو خریدتا ہے انہیں اسی قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا۔ یہ نفع وہ کس طریق سے حاصل کرتا ہے ایک غور طلب بات ہے۔ سرمایہ دار ایک ایسی جنس کا طالب ہوتا ہے۔ جو کارآمد ہونے کے علاوہ منافع کی موجب بھی بن سکے۔ اور وہ جنس ہے انسان کی قوتِ عمل یعنی مزدوری۔ سرمایہ دار اور مزدور کی مارکیٹ میں اس طرح ملاقات ہوتی ہے۔ ایک قوت عمل خریدنی چاہتا ہے۔ دوسرا بیچنی چاہتا ہے مزدور اپنی قوت عمل ایک مخصوص وقت کے لئے فروخت کرتا ہے۔ اگر تمام عمر کیلئے ایسا کرے تو مزدور نہیں رہتا بلکہ غلام بن جاتا ہے۔ وہ جنس کا مالک کہلانے کی بجائے خود جنس میں مبدل ہو جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ دار مزدور کی قوت عمل خریدتا ہے۔ نہ کہ مزدور کی خودی۔ اگر کسی مزدور کے پاس سرمایہ نہیں تو وہ اپنی قوت عمل کے ذریعے اجناس کی پیدائش نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے سرمایہ دار کے پاس اپنی قوتِ عمل فروخت کرنی پڑتی ہے۔ یہ قوتِ عمل مزدور کی اپنی جنس ہے جس کا وہ مالک ہے اس جنس کی بھی باقی اجناس کی طرح ایک قیمت مقرر کرنا لازمی ہے۔ ورنہ اس کی خرید و فروخت کیسے عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ یہ بھی اسی طریق پر مقرر کی جاتی ہے۔ جیسا کہ تمام دیگر اجناس کی قیمت وقت کی پیدائش کے ذریعے مقرر کی جاتی ہے۔ قوت عمل کی جنس اسی لئے کارآمد ہے۔ کیونکہ اس کا مالک ایک جاندار چیز ہے۔ اور ایک جاندار چیز کی زندگی برقرار رکھنے

کے لیئے چند ضروریات بہت اہم ہیں مثلاً غذا۔ کپڑے۔ جائے رہائش وغیرہ۔ ان ضروریات کی مجموعی قیمت مزدور کی قوتِ عمل کی قیمت مقرر ہو سکتی ہے۔ یہ قیمت یا اجرت اتنی ہونی چاہیئے جو مزدور کی صحت کو بحال رکھے تا کہ وہ تندرست رہ کر کام میں ہر روز مصروف رہے۔ مختلف ملکوں میں مختلف معیارِ محنت اسی بنا پر مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ اُجرت میں اتنی گنجائش بھی ضروری ہے کہ یہ قوتِ عمل فنا نہ ہو کیونکہ مزدور کسی نہ کسی دن بوڑھا ہو جائے گا اور مر جائے گا۔ اس لیئے سرمایہ دار کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ مزدور کی نسل کو برقرار رکھے۔ مزدور کی اولاد اس قوتِ عمل کو جاری رکھے گی۔ مزدور کی اُجرت اس قدر ہو کہ وہ شادی کر سکے اور بچے پیدا کرنے کے بعد ان کی پرورش کر سکے۔ ایک کاریگر مزدور حاصل کرنے کے لیئے اجرت میں تعلیمی اخراجات بھی شامل ہونگے۔ فرض کرو یہ تمام ضروریات مزدور کو دو روپے روزانہ اجرت دینے سے پوری ہو سکتی ہیں۔ یہ دو روپے مزدور کی قوتِ عمل کی قیمت ہونگے فرض کرو مزدور چھ گھنٹے کام کرتا ہے اور دو روپے کی قیمت کے برابر اجناس تیار کر دیتا ہے۔ یعنی جتنی اجرت اس کو ملتی ہے اتنی قیمت کی تجارتی اشیا تیار کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تبادلہ اجناس ہے مزدور اپنی مزدوری کی جنس کے بدلے جنس تیار کر کے دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیس گز ململ کے عوض ایک کتاب حاصل ہوئی تھی۔ مگر اس تبادلہ اجناس سے سرمایہ دار کو نہ کوئی نقصان پہنچا اور نہ نفع حاصل ہوا۔ یہ بھلا سرمایہ دار کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ فرض کرو سرمایہ دار مزدور سے چھ گھنٹے کی بجائے آٹھ گھنٹے کام لیتا ہے۔ اُسے آٹھ گھنٹے کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان دو گھنٹوں کی محنت کا صلہ مزدوری کی بجائے سرمایہ دار کو ملیگا یہی وہ راز ہے جو سرمایہ دار کی دولت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ منافع اسی طریق پہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس لیئے سرمایہ دار جتنے گھنٹے فالتو کام لے سکتا ہے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ سرمایہ دار مصنوعات وغیرہ اسی مقصد کے پیش نظر بناتا ہے۔ اسے اجناس کی پیدائش سے اسی لیئے دلچسپی ہے کہ وہ منافع کا موجب ہونگی۔ وہ فروخت کرنے کیلیئے

تجارتی اشیا بناتا ہے۔ جو اجناس ان تجارتی اشیا کی تیاری میں صرف ہوئی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت سے کہیں زیادہ قیمت، وہ حاصل کرنی چاہتا ہے۔ منافع تو اسی صورت سے حاصل ہوگا۔ اس لیے مزدور کو کم سے کم اجرت دینا اور نفع زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا سرمایہ داری کا اصول ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوت عمل کی جنس سے منافع حاصل کرنے کا حق سرمایہ دار کو کیسے پہنچتا ہے؟ صرف یہی جنس ہے جو منافع کا باعث ہو سکتی ہے۔ تمام اجناس کی قدر و قیمت کا انحصار اسی قوتِ عمل پر ہے۔ سرمایہ اور مزدوری کا مسئلہ یہ صورت اختیار کر لیتا ہے (۱) معاشی زندگی میں سرمایہ اور مزدوری دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ حکومت اگر تمام کاروبار اپنے قبضے میں لے لے تو عوام کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ (۲) اگر حکومت کوئی مداخلت نہ کرے تو باہمی مقابلہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی موت بھی نہیں چاہتے۔ مگر اسے پوری طرح زندہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مزدور سسکتا رہے۔ کام بھی کرنے کے قابل رہے مگر اتنی قوت حاصل نہ کر سکے کہ مقابلے کے لیے سر اٹھا سکے۔ اسی طرح طاقتور اقوام بھی یہی خواہش کرتی ہیں کہ وہ کمزور اقوام سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔ ان کو زندہ درگور رہنے دیں۔"

انصر: "تو اس معاشی مسئلہ کا حل آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟"

مائیکل: "سرمایہ اور مزدوری کی جنگ موجودہ زمانے میں ایک اہم مسئلہ بن چکی ہے۔ میری تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ کارل مارکس نے جو حل پیش کیا ہے وہ نہایت مناسب اور احسن ہے۔"

انصر: "اس حل کی وضاحت فرمایئے۔"

مائیکل: "میں اختصار سے کام لیکر سوشلزم کی روح رواں سے آپ کو آگاہ کرنے کی کوشش کرونگا۔ پہلا قدم یہ ہے کہ اجناس کی پیدائش کے تمام ذرائع حکومت کے ہاتھوں میں سونپ دیئے جاتے ہیں۔ دوسرا قدم یہ ہے کہ پیدائش کے طریق کار میں تنظیم عمل میں لائی

جاتی ہے جس میں دو بنیادی اصول ہیں۔ ان کی میں اب وضاحت کروں گا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اجناس کی پیدائش مارکیٹ میں فروخت اور منافع کی غرض سے کی جاتی ہے کیونکہ مارکیٹ محدود ہوتی ہے۔ اس لئے پیدائش کے ذرائع بھی محدود ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں تن ڈھانکنے کے لئے مناسب کپڑا اور جوتے نہیں ملتے۔ غذا نصیب نہیں ہوتی۔ مگر ان چیزوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپکو شہروں کے بازار اور دکانیں ان اشیا سے معمور نظر آئیں گی۔ دوکاندار فروخت کے خواہشمند ہیں مگر سامان سے دکانیں بھری رہتی ہیں۔ کیوں؟ کیا لوگوں کو ان اشیا کی ضرورت نہیں بیشک ہے مگر دقت تو یہی ہے کہ جنہیں یہ ضروری اشیا درکار ہیں ان کے پاس خریدنے کے لئے دام نہیں ہیں اور جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں انہیں ان اشیا کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مکان اور کوٹھیاں سامان عیش و راحت سے اٹی پڑی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کا یہ ایک بھاری نقص ہے۔ اجناس منافع کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہیں بنائی جاتیں۔ اگر سرمایہ دار کو ان کی فروخت سے منافع حاصل نہیں ہوتا تو ان کو فروخت کرنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتا۔ خود غرضی اسے انسان بننے نہیں دیتی۔ اس کے برعکس اشتراکی معاشی نظام میں اشیا استعمال کی غرض سے پیدا کی جاتی ہیں۔ منافع مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے تنظیم ممکن ہے۔ فرض کرو ایک بستی میں ایک لاکھ روپے کی مالیت کی اجناس موجود ہیں۔ اس کی آبادی ایک ہزار نفوس ہے تو یہ رقم ان لوگوں میں قوت عمل اور قابلیت کے معیار کے مطابق تقسیم کر دی جاتی ہے تمام اشیا کی ایک دائمی قیمت مقرر ہو جاتی ہے۔ آبادی کے تمام بالغ مرد عورت کام پر لگا دیئے جاتے ہیں۔ بغیر مزدوری کے کسی کو اجرت نہیں ملتی۔ فرض کرو اس آبادی کو کپڑوں اور جوتوں کی ضرورت زیادہ ہے۔ تو بیشتر افراد ان کی پیدائش پر مامور کر دیئے جاتے ہیں۔ اگلے سال بجائے کپڑوں اور جوتوں کے فرنیچر اور سائیکل وغیرہ کی طرف توجہ مبذول کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح جس چیز کی مانگ ہوتی ہے۔ اس کی پیدائش پر

توجہ دی جاتی ہے۔ جس قدر اشیا کی پیدائش زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اُسی قدر افراد کی تنخواہ وغیرہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اجناس کی پیدائش اور ان کی تقسیم میں توازن رکھنا ہی مقصدِ تنظیم ہے۔ اجناس اشیا کی صورت میں تقسیم نہیں کی جاتیں۔ پیدا کردہ اجناس کی قیمت کے برابر سکے افراد میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں تاکہ افراد اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق اجناس خرید کر سکیں۔ اس طریق سے پیدائش اور کھپت میں ہم آہنگی قائم رہتی ہے۔ یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی کہ جنگ چھڑ گئی تو بیکار لوگوں کو کام مہیا ہو گیا۔ کاروبار میں ترقی ہو گئی۔ اجناس کی قیمتیں کئی گنا زیادہ ہو گئیں۔ اور جنگ کے خاتمہ پر حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ ایسے اشتراکی نظام میں تو جو کچھ بھی پیدا کیا جاتا ہے وہ تمام افراد کی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ کسان گندم پیدا کرتا ہے۔ وہ چار روپے من حکومت کو فروخت کر دیتا ہے۔ حکومت گندم کو دکانداروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ عوام ان سرکاری دوکانوں سے چار روپے من گندم اپنی ضرورت کے مطابق خرید سکتے ہیں۔ حکومت کو نفع سے کوئی غرض نہیں۔ کیونکہ حکومت عوام کی ہے۔ اس طریق سے پیدائش کی افزائش کی کوششیں جاری رہتی ہیں۔ اور اس طرح عوام کی زندگی کا معیار بلند ہوتا جاتا ہے مجموعی دولت میں اضافہ افراد کی انفرادی دولت میں اضافہ ہے

النصر "اجناس کی تقسیم کس اصول پر مبنی ہے؟ کیا تمام افراد کو برابر حصہ ملتا ہے؟"

مائیکل "تمام افراد کو مساوی درجہ دینا ناانصافی ہے۔ کیونکہ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لیتا ہے۔ اس لئے وہ افراد جو سابقہ نظام میں ایک معزز درجہ رکھتے تھے۔ ان کے لئے مناسب درجہ تجویز کیا جاتا ہے۔ ایک کاریگر اور ایک معمولی مزدور ایک ہی لاٹھی سے ہانکے نہیں جا سکتے۔ جو بے انصافی سرمایہ دارانہ نظام میں روا رکھی جاتی ہے وہ اشتراکی نظام میں ہرگز برداشت نہیں کی جا سکتی۔ کارل مارکس نے اس نکتہ کو بالکل واضح طور پر بیان کر دیا تھا کہ تمام افراد کے حقوق یکساں نہیں ہو سکتے۔ انصاف کا دامن کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ سوشل نظام کا فائدہ یہی ہے کہ بغیر محنت کے اجرت

کا حصول ناممکن ہے۔ جو کام نہیں کریگا اسے تنخواہ نہیں ملے گی۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو شخص سماج کے لئے زیادہ کام سرانجام دیتا ہے یا زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔ اس کا معیارِ زندگی بھی بلند ہونا لازمی ہے۔ اس لئے مزدوری کی اُجرت قابلیت اور محنت پر منحصر ہے یہ ممکن نہیں کہ ایک نا قابل اور بد اخلاق انسان اس لئے عیش و راحت کی زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ اس کا باپ یا کوئی رشتہ دار بہت دولتمند ہے۔ اس نظام میں یہ ممکن نہیں کہ بیٹھے توند پر ہاتھ پھیرتے رہیں اور بنک میں روپیہ بھی بڑھتا رہے۔ تنخواہ کا یکساں مقرر نہ کرنا اصولِ مقابلہ کو حرکت میں لاتا ہے۔ ہر فرد قابلیت اور محنت میں سبقت لے جانے کی سعی کرتا ہے اور اس کا صلہ اس کو اجرت کی شکل میں دستیاب ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے ہر فرد بہتر سے بہتر بننے کی کوشش کرتا ہے۔ عزت و شہرت کا حصول انسانی فطرت کا زبردست اقتضا ہے۔ ہر فرد کا بہتر بننا سماج کے لئے بیحد سودمند ہے۔ جس قدر عوام کی قابلیت کا معیار بلندی کی طرف رُخ کرے گا۔ اُسی قدر اجناس کی پیدائش میں ترقی ہوگی یعنی عوام میں اجناس زیادہ تقسیم ہونگی اور اس طرح معیارِ زندگی بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائیگا۔ اس لئے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اشتراکی نظام میں ترقی محدود ہوتی ہے اور افراد میں باہمی مقابلہ جاری نہیں رہتا جو ترقی کے لئے از حد ضروری ہے۔ عدم مساوات یا عدم یکسانیت اس لئے ایک ایسا حربہ ہے جس سے تمام سماج کا معیارِ زندگی بلند کیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح چند اشخاص کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا یہ ذریعہ نہیں بنتا۔ یہ ناممکن ہے کہ چند اشخاص حکومت کریں۔ عیش و راحت کی زندگی بسر کریں اور بیشتر انسان ضروریاتِ زندگی تک کو ترسیں۔"

انصر: "کیا یہ عدم یکسانیت ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی؟"

مائیکل: "اجناس کو قابلیت اور محنت کے مطابق تقسیم کرنا اس امر کا اعتراف کرنا ہے۔ کہ اجناس تمام افراد کی ضروریات کو مساوی طور پر پورا نہیں کر سکتیں۔ جس وقت پیدائش کا معیار اس قدر بلندی اختیار کرلے گا کہ ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق اشیا حاصل کر سکے

اس وقت امتیاز کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی جس وقت یہ آدرش حاصل ہو جائے گا۔ اس وقت تقسیم اجناس کا اصول یہ ہو جائے گا۔ یعنی کام قابلیت کے موافق اور دام ضرورت کے مطابق۔ ہر شخص خوشحال اور دولت مند ہو گا۔ سبھی یکساں طور پر مزدور ہونگے۔ اور سبھی مساوی طور پر دولتمند لیکن سرمایہ دار کوئی نہیں ہو گا۔ اب آپ ہی بتائیے کیا یہ آدرش قابل جدوجہد نہیں ہے"

النصر "پہلے آپ کو اسلام کا معاشی حل پیش کرتا ہوں۔ موازنہ کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں گے یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ سرمایہ اور مزدوری دونوں ایک دوسرے کی بقا کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اسلام نے ایسے ذرائع اختیار کئے ہیں جس سے سرمایہ کی قوت کو ضعف پہنچتا رہے۔ اور مزدور کی اعانت ہوتی رہے۔ میں اختصار سے کام لیکر صرف یہ اصول بیان کرونگا

(۱) اسلام کا قانون وراثت سرمایہ کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ایک دولتمند شخص کی جائداد اور ملکیت اس کے بیٹوں، لڑکیوں، بیواؤں وغیرہ میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک شخص قوت پر قوت نہیں پکڑ سکتا۔ سرمایہ ایک ہی مقام پر ساکن ہونے کی بجائے حرکت کرتا رہتا ہے۔

(۲) اسلام نے سود لینا اور دینا دونوں حرام قرار دیئے ہیں۔ سود کی وساطت سے سرمایہ دار دولت میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور غریب لوگ بد سے بدتر حالت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ کسی حکومت کے خزانے میں اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ بغیر قرض لئے ایک ہفتہ جنگ جاری رکھ سکے۔ اگر سود کی ممانعت ہو جائے تو کوئی شخص حکومت کو بلاسود روپیہ قرض دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو گا۔ اور حکومت جنگ کو جاری نہیں رکھ سکے گی۔ اس طریق سے وہ مدعا حاصل کرنا ممکن ہے۔ جو جمعیتہ الاقوام نہ کر سکی۔

"النصر موجودہ بنکوں کے سود کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ جائز ہے یا ناجائز؟" میں نے پوچھا۔

الغرض میری رائے میں یہ سود جائز منافع کی صورت ہے۔ اسلام کا مقصد تو یہ ہے کہ مفلس لوگوں سے سود نہ لیا جائے۔ ان کا خون نہ چوسا جائے۔ مگر بینک کے ادارے تو مفلس نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کے روپے سے کاروبار چلاتے ہیں اور منافع کماتے ہیں اس میں سے تھوڑا سا حصہ وہ لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر بینک فیل ہو جائے تو اس صورت میں سارا یا بیشتر جمع شدہ روپے کا حصہ واپس نہیں ملتا۔ اس لئے اگر نقصان کا احتمال ہے تو نفع لینے کا بھی حق ہے۔ یہ ایک کاروبار کی صورت ہے جس میں نقصان اور فائدہ دونوں ممکن ہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص اس اصول کا احترام ملحوظ رکھنا چاہتا ہے تو وہ سود کے روپے کو مساکین میں تقسیم کر سکتا ہے یا کسی اور نیک کام میں خرچ کر سکتا ہے۔ مگر بنک سے وصول نہ کرنا سراسر حماقت ہے۔ بنک کوئی مفلس شخص نہیں ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ مذہبی جنون میں آکر لوگ اتنی سیدھی سادی بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ ظاہری صورت کو مدنظر رکھتے ہیں مگر اسلام کے اصولوں کی روح رواں کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اچھا تو اس کے بعد اسلام نے تیسرا قدم اس سلسلہ میں یہ اٹھایا ہے کہ سونا چاندی اور جواہرات کو جمع کرنے سے منع کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سکہ گردش میں رہے۔ دولت ایک جگہ قیام کرنے نہ پائے۔ امریکہ میں سونے چاندی کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر بیکاری کا انسداد نہیں ہو سکا۔ ایک امریکی مصنف کا قول ہے کہ بیکاری کی وجہ یہی ہے کہ یورپ اور ایشیا کے عوام کے پاس اس قدر سونا اور چاندی باقی نہیں رہا جس سے وہ امریکہ سے مال خرید سکیں۔ مال کا نکاس بند ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ کارخانے بند ہیں اور مزدور بیکار ہو جائیں۔ اسی لئے اسلام دولت کو تجارت میں لگانے پر زور دیتا ہے اور سود کو حرام قرار دیتا ہے۔

(۴) ان کے علاوہ اسلام نے ایک عملی طریق بھی اختیار کیا ہے اور وہ ہے زکوٰۃ کا ادا کرنا۔ اس قانون کے مطابق جس شخص کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا باون تولے چاندی چالیس بکریاں یا تیس گائیں ہوں اس کے مالک کو مجموعی قیمت کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ

ادا کرتا رہے بشرطیکہ یہ اشیاء ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہ چکی ہوں۔ اب ذرا اس
قانون پر غور فرمائیے۔ فرض کرو ایک شخص کے پاس چالیس ہزار روپے جمع ہیں۔ وہ ان کو
تصرف میں نہیں لاتا۔ اگر ہر سال اسے چالیسواں حصہ دینے پر مجبور کیا جاتا ہے یقیناً اس
کے بڑھاپے تک یہ رقم قریب الاختتام ہو جائیگی۔ اسی طرح سونا چاندی اگر زیورات اور
برتنوں کی صورت میں ہو تو بھی ہر سال زیورات کی رقم ادا کرتے کرتے زکوٰۃ کی رقم
اصل قیمت سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس لئے پس انداز کی رقم ثابت نہیں ہو سکتی
ایسی صورت میں قوم حکومت ایک علیحدہ مد کے طور پر جمع رکھتی ہے۔ جو مفلس و نادار
اور مستحق لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اس طرح اسلامی سماج میں کوئی مفلس نہیں رہ
سکتا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اگر یہ مفلس و نادار لوگوں کی باقاعدہ طور پر امداد نہیں
کرتے تو وہ لوگ چوری یا ڈاکہ زنی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تمہیں پولیس ان کو گرفتار کرنے
کے لئے متعین کرنی پڑتی ہے۔ عدالت ان کا فیصلہ کرنے پر مامور کرنی پڑتی ہیں۔ اور
جیلیں ان کو محبوس رکھنے کے لئے تعمیر کرنی پڑتی ہیں۔ یہ تمام اخراجات ظاہر ہیں کہ وہ شہریوں
کی جیب سے پورے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کیا یہ مناسب اور بہتر نہیں کہ زکوٰۃ خوشی
سے ادا کی جائے ورنہ حکومت ٹیکس لگا کر جیل وغیرہ کے اخراجات کے لئے روپیہ فراہم
کرنے پر مجبور ہوگی۔ اس طرح خوش قسمت لوگ غریب لوگوں کی اعانت کر سکتے ہیں۔ اور
ان کی محبت اور شکریہ کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ کیوں سعید آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے
بالکل خدا لگتی کہنا۔

سعید: دونوں نظریوں کے مقاصد تو ایک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی سرمایہ اور مزدوری
میں توازن قائم رکھنا۔ فرق صرف طریقہ کار کا ہے۔ اسلام اس توازن کو قائم کرنے کا
اختیار افراد کے ہاتھوں میں سونپتا ہے۔ اور وہ فرض سے آگاہ کرتا ہے۔ اپنے احکام پر
عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر دنیا کا تجربہ اور مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ انسان خود غرض
ہے اور جب سب ... تو وہ دوسروں کی بہبود کا خیال پس پشت

ڈال دیا جاتا ہے۔ بہت ہوا تو خیرات سے کام لیا جاتا ہے۔ خیرات ایک غیر منصفانہ
فعل ہے جس کے متعلق مائیکل نے مفصل گفتگو کی تھی۔ حکومت کو طاقت کے ذریعہ [illegible]
اور لوگوں کو مفلس، نادار لوگوں کی امداد پر مجبور کرنا پڑتا ہے۔ اسلامی حکومت بھی مسلمانوں
کو زکوٰۃ کی ادائیگی وغیرہ پر مجبور کر سکتی ہے۔ حکومت ہی یہ کام سر انجام دے سکتی ہے
تاریخ گواہ ہے کہ جب لوگوں کو ناپسندیدہ کوئی بات چھوڑ جاتی ہے تو خود غرضی اور خیر
ان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے سوشلزم میری رائے میں معاشی مساوات کی
بہترین عملی صورت ہے۔ ان دونوں کا کوئی تضاد نہیں ہے"

مائیکل: بے شک۔ سوشلزم کے ذریعے سماج میں کوئی شخص بھی دولت زیادہ نہیں رکھتا
کسی کو خیرات دینے یا لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر پیٹ بھر کھائیں گے تو سب
اکٹھے اور اگر بھوکوں مریں گے تو تب بھی اکٹھے۔ معاشی زندگی کا بہترین حل ہونے کے
علاوہ اشتراکیت میں اور بہت سی خوبیاں ہیں جن کو میں اب بیان کروں گا۔ اس سے آپ
اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان کے لئے یہ نظام کس قدر مفید ثابت ہوتا ہے۔ روس
کی مثال آپ کے سامنے ہے جہاں یہ تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ سوشلزم ذکر کئے گئے نظریوں
کے بموجب پیداوار قوم سے کیونکہ ذرائع پیدائش کے تمام ذرائع عوام کی ملکیت بن جاتے
ہیں۔ اور اس طرح انسان، انسان کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور یہی اسلام کا مقصد
ہے جیسا کہ حضرت نے فرمایا تھا۔ معاشیات کا بہترین حل ہونے کے علاوہ سوشلزم ہی
اخلاقی، ذہنی ترقی کی بنیاد رکھتا ہے۔ (۱) پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اقوام میں سے
نسل، قوم اور ملت کی دیواریں اٹھ جاتی ہیں۔ رنگ اور مذہب کا امتیاز دور ہو جاتا ہے
تمام افراد ایک ہی حکومت کی رعایا کہلاتے ہیں۔ اور اس لیے حکومت کی نظر میں برابر کا
درجہ رکھتے ہیں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ فوقیت قابلیت پر منحصر ہے۔ ہر قوم کو
اپنا مذہبی، نسلی یا وطنی، مذہبی اور قومی رکھنے میں پوری آزادی ہے۔ مختصر الفاظ میں ہر قوم
اپنے میجر کو ترقی دینے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ تعلیمی و تہذیبی ثقافت ہر قوم کے بچوں کے لیے

یکساں فراہم کی جا سکتی ہے۔ والدین کی حیثیت خواہ کچھ ہی ہو۔ بچے جہاں تک چاہیں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور انہیں بیکاری سے دوچار ہونے کا کبھی اندیشہ نہیں رہتا۔ تمام افراد تعلیم یافتہ ہوتے ہیں (۳) اس کے ساتھ ساتھ تمام مزدور (۴) عورت مرد کے برابر حقوق رکھتی ہے۔ وہ بھی کام کرتی ہیں اور اپنی قابلیت کے مطابق مردوں کے برابر اجرت پاتی ہیں (۵) دیہات اور شہر کا امتیاز نہیں رہتا۔ زندگی کا معیار ہر جگہ بلند ہو جاتا ہے۔ (۵) ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کی ضرورت ہی پیش نہیں آئیں گی جب تمام ممالک اس پر عمل پیرا ہو جائیں کسی بھی اشتراکی ملک میں ایسا گروہ پیدا نہیں ہو سکتا جو دوسرے ممالک یا قوموں کو زیر نگیں لانے کی خواہش کرے۔ ایک سرمایہ دار ملک یا قوم اسی لئے دوسری کمزور قوموں اور ملکوں پر حملہ آور ہوتی ہے تاکہ اپنی تجارت کی منڈی کو وسعت دے سکے۔ اپنے سرمایہ کو منافع بخش تجارتوں میں لگا سکے۔ اس کے برعکس ایک اشتراکی حکومت کو اس بات میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی کہ کسی ملک یا قوم کو ترقی پذیر ہونے دے۔ اسے غلام بنائے رکھے اس کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی میں سد راہ بنے تاکہ وہ اپنے پیروں پہ کھڑے نہ ہو سکیں۔ یہ سب سرمایہ داری کے عیوب ہیں اشتراکیت ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ جو ممالک سوشلزم کو اپنا لیں گے۔ وہ ترقی یافتہ ممالک پسماندہ اقوام اور ممالک کی صنعت کو فروغ دینے میں اعانت کریں گے کیونکہ انکا مسلک ایسا ہی ہوگا۔ اگر تمام دنیا اس پر عمل پیرا ہو جائے۔ تو انسانی ذہن اس ترقی کا اندازہ نہیں کر سکتا جو عمل میں آسکتی ہے۔ ہر ملک کی صنعتی ترقی اور تمام ممالک کا ترقی کیلئے جد و جہد کرنا اور اگر منضبط نظام سے عمل میں لایا جائے تو دنیا بہشت میں مبدل ہو سکتی ہے سائنس کی ایجادات اور اس کے انکشافات سب ممالک کیلئے یکساں طور پر مفید بنائے جائیں اخلاقی اور ذہنی ترقی میں باہمی کوششیں کی جائیں۔ اس طرح انسان ترقی کی طرف بلا روک ٹوک پرواز کر سکتا ہے۔ اس ترقی کی انتہا کے متعلق مارکس نے کوئی تشریح کی کوشش نہیں کی اور نہ اس پر غور و خوض کی ضرورت ہے لیکن اتنی بات اظہر من الشمس ہے کہ ایک ایسی منزل

کا امکان ضرور ہے جس وقت انسان کے پاس اس قدر پیدائش کے ذرائع موجود ہونگے کہ ہر انسان صرف دو گھنٹے کام کریگا اور اسے تمام عیش و راحت کے سامان مہیا ہوں گے باقی وقت وہ کھیل۔ تفریح۔ علمی مشاغل میں صرف کیا کریگا۔ انسان گروہوں میں تقسیم نہیں رہیں گے سب انسان کہلائیں گے۔ اور وہ صحیح معنوں میں انسان ہونگے۔ نیکی بدی پر فتح کا مل پائے گی دنیا جنت ہوگی۔ اس وقت انسان انسان سے برسر پیکار ہونے کی بجائے قدرت کی طاقتوں سے جنگ آزما ہوگا۔ وہ قدرت کو سرنگوں کرنے کا قدم اٹھائے گا۔ مگر اس وقت تقدیر اس کا ساتھ دے گی۔ وہ قدرت کی طاقتوں کو جادو۔ خوشامد۔ دیوتاؤں کی چاپلوسی کے ذریعے رام کرنے کی سعی نہیں کرے گا۔ وہ اپنی قوتوں سے آگاہ ہوگا۔ اس کی ذہنی قوتیں پوری طرح بیدار ہونگی۔ وہ قدرت کی قوتوں پر اختیار حاصل کرلے گا۔ تقدیر اس کی ادنےٰ غلام بن جائے گی" محفل برخاست ہوگئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ اشتراکیت کے معنی آج صحیح طور پر مجھے معلوم ہوئے۔ زندگی کے تمام مسائل اور ان کے جوابات پر میں نے طائرانہ نگاہ ڈالی۔ مائیکل اور ناصر کے نظریات کا موازنہ کیا۔ جہاں تک زندگی موت کی سرحد سے ملتی تھی سائنس اور مذہب کے مقاصد میں کوئی تصادم نہیں تھا۔ البتہ کہیں کہیں نظام عمل میں کچھ اختلاف تھا مثلاً پردہ اور معاشی نظام۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ سچائی۔ نیکی اور خدا ایک ہی چیز کے نام ہیں۔ میں سچائی کے راستے کا جویا ہوں۔ مذہب کا راستہ خدا کی اطاعت ہے جس کا مفہوم ہے نیکی اور سچائی کے راستے پر گامزن ہونا۔ مذہب کے اصول بھی انسان کی بہبود کو ملحوظ نظر رکھتے ہیں۔ اس سے دو نکات جو تشنۂ تشریح تھے ان کا بھی تصفیہ ہو جاتا ہے یعنی (۱) جمہوری نظام حکومت بہتر ہے یا جمہوری حکومت سے کا نظام بہترین ہے؟ (۲) مذہب کو قومیت کی بنا قبول کیا جائے کہ وطن کو یا کسی اور جذبہ کو؟ عملی زندگی میں یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں کثرت رائے سچائی کی ہمیشہ ترجمانی نہیں کرتی جس کی مثال امریکہ کے قانون امتناع شراب کا حشر ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ سچائی کو اصول یا قانون تسلیم کیا جائے اور اس میں کوئی دوب

صرف کثرتِ رائے کے بل بوتے پر عمل میں نہ لایا جائے۔ سچائی کبھی بدل نہیں سکتی
انسان کی فطرت بھی کبھی نہیں بدل سکتی۔ زندگی کے قوانین بھی سائنس کے اصولوں کی طرح
اٹل ہیں۔ اور زندگی کا دستور العمل انہیں اصولوں پر مبنی ہونا چاہیئے۔ ایک سچائی کا دلدادہ
ان اصولوں کی پیروی عشقِ حق کی بنا پر کرتا ہے مگر ان قوانین کی پیروی پر مجبور کرنے
کے لیئے خوف کا حربہ بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے جس کی مثال چوک پہ کھڑے ہوئے سپاہی
کی سی ہے جو لوگوں کو راہِ راست پہ چلنے کے لیئے مجبور کرتا ہے۔ خدا کو حاکمِ اعلیٰ تصور کرنے
میں انسان پہ ایک بڑی بھاری ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے۔ حاکمِ اعلیٰ کی ناراضگی کا خوف
اسے راہِ راست سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ یہی خوف عام انسانوں کی زندگی کو ٹھیک کے سانچے
میں ڈھالتا ہے۔ ایک حق پرست خوف یا لالچ کے زیرِ اثر نیکی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اس
کی نظر میں خدا راستی ہے۔ دو نقطوں کے درمیان ایک ہی خطِ مستقیم کھینچا جا سکتا ہے
یعنی راہِ راست ایک ہی ممکن ہے لیکن ٹیڑھے خطوط کی انتہا نہیں۔ اس لیئے راہِ راست
انہی اٹل قوانینِ فطرت پہ مبنی دستور العمل کا نام ہو سکتی ہے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے
کہ انسانوں کو اسی دستور العمل پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ اس میں رد و بدل کا نہیں کوئی حق
نہیں ہونا چاہیئے جس طرح قوانینِ قدرت اٹل ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کا آئین بھی
مستحکم ہو۔ یعنی طرزِ حکومت جمہوری حکومتِ الٰہیہ ہو۔ اس طریق سے دنیا میں دو ہی
گروہ وجود میں آتے ہیں۔ ایک راہِ راست کا علمبردار اور دوسرا شیطنت کا پیروکار۔
اور ایک گروہ سے دوسرے میں منتقل ہونا ہر وقت ممکن ہے یعنی اپنے خیالات یا رائے
کی تبدیلی ہر وقت ہو سکتی ہے مگر رنگ نسل اور جائے پیدائش کی تبدیلی ناممکن ہے۔ اسلئے
جمہوری حکومتِ الٰہیہ کی باگ ڈور ایک ہی گروہ کے ہاتھوں میں سونپی جا سکتی ہے۔ اس
کا مطلب یہی ہوا کہ ہر راہِ راست کے دعویدار کا یعنی کسی مذہب کی حکومت کے لیئے
ایک علیحدہ علاقہ مقرر ہو۔ یہی مذہب کا بنیادی اصول ہے جس کی بنا پر پاکستان خالصتان
وغیرہ کے مطالبات پیش کیئے جا رہے ہیں۔ ہے یہ ناممکن ہے جہاں ایک ہی مذہب کے لوگ

آباد ہیں۔ مثلاً یورپ۔ امریکہ۔ ایران۔ مصر اور عرب وغیرہ وہاں ایک ہی مذہب کی حکومت ممکن ہے۔ مگر ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب اور بنگال جیسے صوبوں میں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ ایسی حکومت کا قیام مشکل ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت ممکن نہیں جس سے لوگوں کو اپنا اپنا وطن ترک کئے بغیر جمہوری حکومت الٰہیہ میسر آسکے؟ کل مائیکل سے یہی سوال کرونگا۔"

دوسرے دن میں نے سوال پیش کیا۔

مائیکل: تاریخ عالم کے مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ قوموں کی بنیاد تین امور پر ہے یعنی نسل۔ وطن۔ اور مذہب۔ ان تینوں عناصر میں سے کوئی ایک عنصر قوم کو دائرۂ عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثلاً یہودی ایک ہی نسل کے افراد ہیں اگرچہ وہ تمام دنیا میں آباد ہیں۔ لیکن ان کا وطن فلسطین ہی تصور کیا جاتا ہے۔ نسل اور مذہب کی بنا پر تمام دنیا کے یہودی ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ امریکہ کے ممالک متحدہ میں بیشمار نسلیں آباد ہیں۔ جو مختلف ممالک سے آکر آباد ہوئیں۔ مگر وہ تمام امریکی کہلانے پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ قومیت کی بنا وطن قرار دی جا چکی ہے۔ جرمنی کے لوگ مدتوں سے دوسرے ممالک میں آباد ہونے کے باوجود جرمن قوم کے افراد کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی مذہب کی بنا پر ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ اسی طریق پر قومیں بنتی ہیں۔ ایک ہی عنصر قوم کا بانی ہو سکتا ہے۔ جتنے عناصر کسی قوم کے افراد میں باہم مشترک ہونگے اتنی ہی افراد میں انسیت کی شدت زیادہ ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک پنجابی مسلمان طالب علم برطانیہ میں سکونت پذیر ہے۔ اس کے دو ہم جماعت ہیں۔ ایک پنجابی مسلمان ہے۔ دوسرا مصری مسلمان۔ دونوں کو مالی امداد کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ صرف ایک شخص کی اعانت کی استطاعت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پنجابی مسلمان کی مدد کرے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ مذہب کے علاوہ وطن کا عنصر بھی دونوں میں مشترک ہے اور اس لئے یہ عنصر اسے مصری مسلمان پر ترجیح دینے پر مجبور کرتا ہے

فرض کرو انتخاب کا دائرہ اور محدود ہو جاتا ہے یعنی ایک مسلمان اس کی اپنی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا گوپنجابی ہے۔ مگر نسل مشترک نہیں ہے تو اس صورت میں تینوں مشترک عناصر زیادہ باعث کشش ہونگے۔ ان حقائق سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جب مذہب مشترک ہو مثلاً یورپ۔ امریکہ یا ایران۔ تو اس صورت میں حب الوطنی قومیت کی بنا بن جاتی ہے۔ مذہبی اختلاف اتنی شدت اختیار نہیں کرتا کیونکہ ان ممالک میں ہندوستان کی طرح مذہبی سوال درپیش نہیں آیا۔ اس لئے وہ لوگ وطن کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان کے لوگ مذہب کو بنائے قومیت ٹھہراتے ہیں کیونکہ ان کا ملک ایک ہے۔"

"مگر صحیح راستے پر کون ہے؟ قومیت کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے؟" میں نے پوچھا۔
مائیکل۔ "میرے نزدیک صحیح قومیت کی تعریف یہی ہے کہ ایک قوم کے افراد میں تینوں اہم عناصر مشترک ہوں تینوں عناصر اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ نسل ہمیں جسمانی خصوصیات وراثت میں عطا کرتی ہے۔ وطن ہمیں زبان۔ لباس اور رسم و رواج وغیرہ۔ فراہم کرتا ہے۔ مذہب ہمیں زندگی کا راستہ پیش کرتا ہے۔ یہ تینوں مل کر ایک مخصوص کلچر یا طرز معاشرت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس لئے صحیح معنوں میں قومیں کلچر سے پیدا ہوتی ہیں۔ کسی ایک عنصر کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ تینوں کسی قوم کی بقا کیلئے لازمی ہیں۔ کسی قوم کے افراد میں انسیت اسی بنا پر استوار ہوتی ہے۔ تمام اقوام کے کلچر کو ایک ہی رنگ میں رنگنا عملی طور پر ناممکن ہے۔ جب دو گھڑیاں بالکل یکساں وقت کی پابند نہیں ہو سکتیں تو دو انسان کس طرح بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ نیرنگی انسان کی فطرت ہے۔ دنیا کی دلچسپی اس نیرنگی پر موقوف ہے۔ مختلف زبانیں۔ صورتیں۔ لباس اور رسم و رواج اسی تضاد کی تشنگی کو تسکین دے سکتے ہیں۔ تمام انسانوں کو ایک ہی کلچر پر لانا امر محال بھی ہے اور ناگوار بھی۔ صرف ایک چیز مشترک ہو سکتی ہے یعنی فطرت انسان اور ایک ہی راستہ مشترک ہو سکتا ہے یعنی انسانی ضروریات کی تکمیل کا بہترین طریق۔ زندگی کے

حقائق پر ہمیں نگاہ رکھنی چاہیئے۔ مذہبی اختلافات کو ہم دور نہیں کر سکتے۔ مذہب۔ زبان۔ لباس۔ رسم ورواج کو یک رنگ کرنے کی سعیِ بیکار میں وقت ضائع کرنا عقلمندی سے بعید ہے۔ ہر قوم اپنے کلچر کے تحفظ کا حق رکھتی ہے۔ انسانی فطرت کا اقتضا یہی ہے کہ ہر شخص اپنے عقاید وغیرہ کو صحیح تسلیم کرتا ہے۔ اپنے عقائد کے ناکارہ ہونے کا اعتراف کرنا اسے قبول نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قومیں احساسِ برتری کے جذبہ کو مختلف طریقوں سے تسکین دینے کی سعی کرتی ہیں۔ قوموں پر نظر کیجیئے۔ اسی جذبہ کی تسکین کی خاطر مقابلہ جاری ہے۔ ایک قوم دوسری قوموں سے اور ایک ملک دوسرے ملکوں سے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب سے ٹکراتی جا رہی ہے۔ ہر قوم یہی دعویٰ کر رہی ہے کہ اس کا تمدن۔ مذہب طرزِ معاشرت۔ زبان اور آرٹ بہترین ہیں۔ اور دوسری قوموں کو اس برتری کو تسلیم کروانے کے لیئے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ اپنی برتری ثابت کرنے کے لیئے وہ دوسری قوموں سے جنگ آزما ہوتی ہے۔ کمزور انسانوں اور کمزور قوموں کو مغلوب کر کے وہ تسکین حاصل کرنے کی سعی کرتی ہے اور وہ تسکین حشمت و دولت کے حصول سے ہوتی ہے۔ یہی جذبہ جنگوں کی بنیاد ہے۔ گناہ اور کشت وخون کا یہی سرچشمہ ہے۔ دنیا کے تمام مصائب کی یہی جڑ ہے اس کا یہی علاج ہے کہ ہر قوم کے تمدن کو بہترین تسلیم کر لیا جائے۔ اپنی اپنی جگہ سب اسی احساسِ برتری میں تسکین پائیں۔ فارسی کی مثل مشہور ہے کہ اچھا عطر وہی ہے جس کا ثبوت خود عطر کی خوشبو پیش کرے نہ کہ عطر فروش۔ اس لیئے جس قوم کا تمدن اچھا ہوگا۔ وہ خود بخود دوسروں کو اپنی طرف کھینچے گا۔ منطق و دلائل کی کوئی حاجت ہی پیش نہیں آئے گی۔ اب رہا دولت کے حصول کا سوال۔ جب انسانوں کو تمام ضروریاتِ زندگی میسر ہوں تو کسی کو چوری۔ ڈاکہ زنی۔ فریب کاری اور مکاری کی ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی اور اس آدرش کے حصول کا بہترین طریقہ میں بیان کر چکا ہوں یعنی اشتراکی نظامِ معاش۔ اس سے بہتر دنیا میں اور کوئی معاشی حل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی نجات اسی حل کو عملی جامہ پہنانے میں ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو عالمگیر امن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ یہی وہ طرزِ حکومت ہے

جس میں تمام قومیں اپنے اپنے تمدن کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اپنے اپنے علاقہ میں جمہوری حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں لا سکتی ہیں۔ ہر انسان خود جی سکتا ہے اور دوسروں کو جینے دے سکتا ہے۔ کشت و خون کیے بغیر فطری جذبہ جنگ کی تسکین بھی کر سکتا ہے۔ برتری کی جنگ کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ تمام فطری ضروریات کو بہترین طریق پر پورا کر سکتا ہے اس طریقہ کو میں نے ایک آئین کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ کل آپ کو اس سے روشناس کراؤں گا۔"

تیسرا حصّہ

پہلا باب

آئینِ مسرت

مائیکل: زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اسے آپ پر واضح کرتا ہوں۔ عالمگیر امن قائم کرنے کا اور کوئی بہتر طریق مجھے سجھائی نہیں دیتا۔

(۱) اقوام کی بنا جغرافیائی حدود پر نہ رکھی جائے۔ جن افراد کا کلچر ایک سا ہے۔ وہ ایک ہی قوم کے رکن شمار کئے جائیں۔ کلچر سے مراد یہ ہے کہ مذہب۔ وطن۔ نسل۔ زبان۔ لباس۔ طرزِ معاشرت وغیرہ میں تقریباً ہم آہنگی ہو۔ ہر ملک اور صوبہ کی آبادی کو اقوام میں بانٹ دیا جائے۔ ہر شہر۔ قصبہ اور دیہات کو بستیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر ایک بستی میں ایک قوم آباد ہو۔ ایک بستی میں ایک ہزار مکانات ہوں۔ ایک مکان میں ایک خاندان آباد ہوں۔ یعنی ایک مرد۔ اس کی بیوی اور بچے۔ بچے جب جوان ہو جائیں اور شادی کر لیں تو وہ اپنے اپنے علیحدہ مکانوں میں منتقل ہو جائیں۔ مثال کے طور پر لاہور جیسے شہر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ حصوں کی تقسیم آبادی کے تناسب کے مطابق ہو گی۔ بڑے شہروں میں کئی کئی بستیاں اکٹھی ایک ہی قوم کے افراد سے آباد ہونگی۔ بستیوں کے مجموعے کو ٹاؤن یا آبادی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طریق سے لاہور میں مسلم ٹاؤن۔ ہندو ٹاؤن۔ سکھ ٹاؤن۔ اچھوت ٹاؤن اور کرسچن ٹاؤن وغیرہ بنائے جا سکتے ہیں۔ قابلیت

کے لحاظ سے انسانوں کو تین گروہوں یا طبقوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک طبقہ عام مزدوروں پر مشتمل ہو۔ دوسرے طبقہ میں درمیانی قابلیت اور تعلیم کے لوگ شامل ہوں۔ ان کو معاون کہہ سکتے ہیں۔ اور تیسرے طبقہ میں اعلیٰ دماغ کے اشخاص کا شمار ہو جو حکام کا درجہ رکھیں گے اسی طرح مکانات کو بھی تین قسموں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اعلیٰ رہائشی مکانات میں اعلیٰ دماغ کے افراد اور عام مکانات میں عام لوگوں کی رہائش کا انتظام حکومت کیطرف سے کیا جائے۔

(۲) ہر ٹاؤن کی تنظیم نہایت اہم امر ہے تنظیم سے بہت فائدے وابستہ ہیں۔ ایک تو فائدہ انتخابات کے سلسلے میں پہنچ سکتا ہے۔ دوسرے فوجی تنظیم آسان ہو جائیگی اس کی وضاحت پھر کرونگا۔ کوشش یہ کی جائے کہ ہر ٹاؤن کی ہر ایک بستی میں ایک ہی نسل کے لوگ آباد کئے جائیں۔ مثلاً مسلم ٹاؤن میں پٹھانوں، مغلوں، شیعوں، سیدوں، شیخوں وغیرہ کی بستیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ ہر ٹاؤن کی آبادی اپنے کلچر کی ترقی کیلئے آزادانہ اقدام کر سکتی ہے۔ جہاں تک ٹاؤن کے نظم و نسق کا تعلق ہے وہ صوبائی حکومت کا پابند نہیں ہوگا مثلاً مسلم، ہندو یا سکھ ٹاؤن میں اپنے اپنے مذہب کے قوانین نافذ ہونگے۔ دوسرے لفظوں میں جمہوری حکومت الٰہیہ رائج ہوگی۔ ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جو کلچر وہ پسند کرے اس ٹاؤن میں سکونت اختیار کرے۔ ہر ٹاؤن اس طریق سے پاکستان، خالصتان وغیرہ بن سکتا ہے۔ ہر ٹاؤن کی اپنی پولیس چوکیاں اور عدالتیں ہوں اور مقدمات کا فیصلہ مذہبی قوانین کی بنا پر کیا جائے۔ ہر ٹاؤن میں کئی کئی سکول اور ہسپتال ہوں۔ ہر ٹاؤن کا ایک ٹاؤن ہال ہو۔

(۳) ٹاؤن کمیٹی کا انتخاب اس طریق سے عمل میں لایا جائے۔ ہر بستی سے ایک ایک نمائندہ بلایا جائے۔ یہ شخص ایک ہزار خاندانوں کی نمائندگی کا فرض سر انجام دیگا۔ انتخابات کے لئے کسی قسم کا پروپیگنڈا کرنا منع ہوگا۔ بستی میں جو شخص سب سے زیادہ قابل۔ تعلیم یافتہ اور صاحب کردار ہوگا وہی نمائندگی کا حق رکھے گا۔ یہ چند نمائندے اپنا صدر چن سکتے ہیں۔ ان نمائندوں کے علاوہ ہر ایک ٹاؤن کا اپنا اعلیٰ منصف۔ پولیس انسپکٹر۔ سکول انسپکٹر۔ ہسپتالوں کا انچارج اور محکمہ تعمیرات عامہ کا حاکم اعلیٰ۔ یہ تمام ٹاؤن کمیٹی کے

رکن ہوں۔ ٹاؤن کے معاملات صفائی وغیرہ اس کمیٹی کے ذمہ ہونگے اور ٹاؤن کی بہتری کی تجاویز صوبائی حکومت کے پاس بھیجنا وغیرہ بھی اسی کمیٹی کا فرض ہوگا۔

(۴) صوبائی حکومت کے ارکان کا انتخاب اس طریق سے عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ ایک تعداد بستیوں کی مقرر کی جاسکتی ہے۔ مثلاً دو سو بستیوں کی نمائندگی ایک شخص کرے اس طرح مجلس نمائندگان وجود میں آئے گی۔ صدر اعظم کا انتخاب یہی مجلس عمل میں لائیگی۔ مجلس کی تشکیل جمہوری اصولوں پر مبنی ہوگی۔ مجلس کے ذمہ دو اہم فرائض ہونگے۔ (۱) دفاع یعنی سیاسی معاملات کا تصفیہ اور (۲) معاشیات یعنی پیدائش اجناس کے ذرائع کو فروغ دینا اور اجناس کو عوام میں تقسیم کرنا یا زندگی کے معیار کو بلند سے بلند تر کرتے جانا۔ اخلاقی سماجی تعلیمی اور جسمانی ترقی مذہب کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔

(۵) مرکزی حکومت کے ارکان کا انتخاب اس طرح بہتر رہے گا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے ہر صوبے سے پانچ پانچ نمائندے لئے جائیں۔ یہ پانچ نمائندے صوبے کی پانچوں اقوام کی ترجمانی کرسکتے ہیں یعنی ہندو۔ سکھ۔ اچھوت۔ عیسائی یا اینگلو انڈین۔ صوبوں کی حدبندی کا مقصد صرف نظام حکومت کو چلانے کی غرض سے ہو۔ یہ تمام منصب اعزازی ہونگے۔ اجلاس ہر سہ ماہ کے بعد منعقد ہوسکتے ہیں۔ صرف وزرا سارا وقت کام کریں گے۔ ہر صوبے میں پانچ وزرا حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتے ہیں۔ ہر ایک وزیر اپنی قوم کی نمائندگی کرے گا۔ اجلاس کے دوران میں قیام وطعام اور سفر وغیرہ کے اخراجات حکومت کے ذمہ ہونگے۔ وزرا کو ایک رقم بطور الاؤنس دی جاسکتی ہے۔ مرکزی حکومت کے بھی صوبائی حکومتوں کی طرح وہی دو فرائض ہونگے۔ مرکزی حکومت پسماندہ صوبوں کی صنعتی ترقی کو ملحوظ رکھے گی۔ صوبوں کی اجناس کا تبادلہ ان کے ذمہ ہوگا۔"

(۶) سب سے پہلے آبادیوں کی حدود بندی ضروری ہوگی۔ ایک ایک ہزار مکانات پر ایک بستی مشتمل ہوگی۔ تمام اراضی اور مکانات وعمارات حکومت کی ملکیت ہونگی۔ مکان

سے مراد ایک عمارت نہیں ہے۔ بلکہ اتنی جگہ مقصود ہے۔ جو ایک خاندان کے لیئے آرام دہ ثابت ہو سکے۔ اس نقطۂ نگاہ سے کئی عمارات میں ایک سے زیادہ خاندان آباد ہو سکتے ہیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے مکانات اور آبادی کی تعداد معلوم کی جائے۔ تمام کارآمد اجناس کی قیمت مقرر کر دی جائے۔ اور اس طرح مجموعی دولت کی قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔ موجودہ انسانوں کو قابلیت کے معیار کے مطابق تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے۔ ان کو مزدور۔ معاون اور حاکم کے الفاظ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اس موجودہ دولت کو تینوں طبقوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی اجناس کی مجموعی قیمت کے برابر سکے تقسیم کر دیئے جائیں۔ یہ سکہ پہلے رائج شدہ سکے سے بالکل مختلف ہونا چاہیئے۔ سکہ تمام نوٹوں کی شکل میں ہو۔ نیا سکہ اس لیئے ضروری ہے۔ کیونکہ لوگوں کے پاس جو پہلے روپے اور نوٹ موجود ہونگے وہ بیکار جائینگے اور کسی سے واپس لینے کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔ جن لوگوں کے پاس ضروریات سے زیادہ دولت ہو۔ وہ دولت دکانوں میں اور گوداموں میں جمع کی جا سکتی ہے۔ دکانیں تمام حکومت کی ملکیت ہونگی۔ دکاندار تنخواہ دار ملازم ہونگے۔ حکومت دکانداروں کے حوالے سٹاک اسی طریق پر کرے گی جس طرح باٹا کمپنی باٹا شاپ کو مال سپلائی کرتی ہے۔ کارخانے تمام حکومت کی ملکیت ہونگے۔ کارخانوں سے تیار شدہ مال تمام دکانوں میں منتقل کر دیا جائے۔ جس چیز کی مانگ زیادہ ہو اسی کی پیدائش پہ توجہ اور محنت صرف کی جائے۔ مکانات حکومت کی ملکیت ہونگے مگر مکانات کی آرائش کا سامان وغیرہ ذاتی ملکیت ہونگے۔ اسی طرح زمین حکومت کی ملکیت ہوگی۔ مگر اس زمین کی پیداوار کسان کی ملکیت ہوگی۔ اس کے علاوہ ذاتی استعمال کی تمام اشیا مثلاً فرنیچر کپڑے۔ برتن وغیرہ کسان کی ملکیت ہونگی۔ ذاتی استعمال کے لیئے گھوڑا۔ گائے مرغیاں وغیرہ ہر کوئی رکھ سکتا ہے۔ کاشتکاری کے آلات حکومت کی ملکیت ہونگے۔ اور حکومت کسانوں کو یہ آلات کرایہ پر فراہم کرے گی۔ لگان وغیرہ کوئی نہیں ہوگا۔ مجموعی کاشتکاری کو ترجیح

دی جائے گی۔ اس کے متعلق زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ سویٹ روس کی مثال موجود ہے۔ اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کوئی تعلیم حاصل کریگا۔ اسے تنخواہ نہیں ملے گی۔ اس کے اخراجات کے کفیل اس کے والدین یا سرپرست ہونگے ذہین ہونے کی صورت میں وظیفہ دیا جائے گا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اگر وہ کام کرنا چاہے تو حکومت اسے فوراً کام پر لگا سکتی ہے۔

(۷) موجودہ زمانے کی بیکاری اور عسرت کی سب سے بڑی وجہ آبادی کی کثرت ہے۔ صحت مند اور ذہین افراد کے مقابلے میں کمزور۔ اپاہج اور جاہل لوگوں کی بیحد کثرت ہے۔ اس کا انسداد ایک نہایت اہم امر ہے۔ نسلوں کو بہتر بنانے کی غرض سے ہر بستی کی آبادی کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے۔ یہ تقسیم جسمانی صحت کے لحاظ سے کی جائے گی۔ اوّل درجہ کی صحت رکھنے والے کو تین بچے پیدا کرنے کی اجازت ہوگی۔ دوئم درجہ کے انسانوں کو دو بچے اور سوئم درجہ کی صحت رکھنے والوں کو صرف ایک بچہ کی پیدائش کی اجازت ہوگی۔ یہ فرض ٹاؤن کے محکمہ صحت کے حاکم کے ذمہ ہوگا۔ ٹاؤن کے تمام ڈاکٹروں پر مشتمل ایک کمیٹی ہوگی جو لوگوں کو صحت کے لحاظ سے درجہ عنایت کرے گی۔ کوشش یہی کی جائے کہ ہر شخص کی زندگی دراز ہو سکے۔ کروڑوں جانوں کو بیماری۔ قحط اور افلاس کے منہ میں دھکیلنے سے یہ ہزار درجے بہتر ہے کہ بچوں کی پیدائش کم کر دی جائے تاکہ وہ خوشحال زندگی بسر کر سکیں اگر ایک کروڑ انسان خوشحال رہ سکتے ہیں۔ تو ایک کروڑ سہی۔ اگر ایک لاکھ بمشکل اطمینان کی زندگی گذار سکتے ہیں تو کثرت سراسر حماقت ہے۔ دنیا ایک محدود جگہ ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ شادی سے قبل شادی کی قابلیت کی سند حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ جس کے بغیر شادی قرار نہیں پا سکتی۔ اگر کوئی شخص نامرد ہے یا کسی مخصوص مہلک مرض کا شکار ہے۔ جو اس کے بچوں میں منتقل ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اگر عورت رضامند ہو تو شادی کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ مگر بچے پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہر قوم کو ایک ہی تناسب سے آبادی میں

اضافہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ ہر ٹاؤن ہال میں پیدائش و اموات کا رجسٹر ہوگا۔ ہر قوم کے ذمے یہ فرض ہوگا کہ وہ ایمانداری سے اس سلسلہ میں کام لے۔ ہر تین سال بعد مردم شماری ہوا کریگی ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت ترین سزا دی جائے گی۔ سب سے بڑی سزا شہری حقوق سے محروم کرنا ہوگی۔ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔ ضبطِ تولید کی تعلیم عام سکول میں دی جائے۔ مردم شماری سے پتہ چل سکتا ہے کہ کس قوم نے اس پیدائش کے معاملے میں کمی بیشی سے کام لیا ہے۔ اگلے تین سالوں میں وہ قوم تناسب کو برقرار رکھنے کے اقدام اختیار کر سکتی ہے۔ مقصد یہی ہو کہ پیدائش اموات کے مساوی ہو تاکہ خوشحال زندگی بسر کرنے کا امکان پیدا ہو۔ اور اس کے علاوہ ہر قوم کے ذمہ یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد تقریباً یکساں رہے۔ عورتوں کی تعداد بڑھنے نہ پائے اس سلسلہ میں بھی طبّی انکشافات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم میں اس کے متعلق بھی واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے بچے جو اپاہج پیدا ہوں اور جن کی صحت بہتر ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں بچپن میں ہی ختم کر دیا جائے۔ یہ امر باعث رنج تو ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مگر انکی بہبود اسی میں ہے۔ تمام صحت گاہیں اور ہسپتال عوام کے لئے مفت ہونگے۔ ہر ٹاؤن میں ایک بڑا ہسپتال ہونا ضروری ہے اور ڈسپنسریاں اس تناسب سے کھولی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ہر سو خاندانوں کے افراد کیلئے ایک ڈسپنسری یعنی ایک ہی میں دس شفا خانے۔ ایک ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر۔ ایک لیڈی ڈاکٹر۔ ایک نرس۔ ایک کمپاونڈر وغیرہ مقرر کیئے جا سکتے ہیں۔ یہ تمام عملہ ان ایک سو خاندانوں کی خدمت کے لئے مامور ہوگا۔ جو کیس زیادہ خطرناک ہو وہ ٹاؤن ہسپتال میں بھیجا جا سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ ہر شہر کا بڑا ہسپتال تمام اقوام کے لیئے مشترکہ ہو۔ مگر اسے آبادی کے تناسب سے حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے اسی طرح ایک ہی قوم سے آباد شدہ بستیوں کا ٹاؤن ہال بھی مشترکہ سرکاری عمارات میں قائم ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ٹاؤن ہال بستیوں کے درمیان ہی واقع ہو۔

کیونکہ موجودہ رہائشی مکانات۔ محلات اور آبادیاں بالکل ناقص ہیں اور ان کے درست کرنے میں ابھی وقت درکار ہوگا۔

(۸) اسی طرح تعلیم بھی ابتدائی تعلیم سے لیکر ماہر علم و فن کی ڈگری حاصل کرنے تک مفت ہوگی۔ ہر ٹاؤن میں ابتدائی سکول اور کالج ہونگے۔ ہر قوم کا ایک کالج ہوگا۔ ہر بستی کا ایک سکول ہوگا۔ ماہر علم و فن کی ڈگری کے حصول کے لئے کالج مشترکہ ہونگے۔ جہاں تمام اقوام کے طالب علم مفت تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ تعلیم کے نصاب کے متعلق میں پہلے ذکر چکا ہوں۔ ابتدائی تعلیم ہر لڑکے لڑکی کے لئے لازمی ہوگی۔ جو طالب علم ذہین ثابت ہونگے یا ارباب ذوق ہونگے انہیں کالج میں شامل ہونے کی ترغیب دیجائے گی۔ مدرس اس سلسلے میں ان کی راہنمائی کریں گے۔ جن طالب علموں کے متعلق معلموں کی رائے ناقص ہوگی انہیں ابتدائی تعلیم کے بعد مختلف پیشوں میں بطور شاگرد بھرتی کر لیا جائے گا۔ اور ان کو آدھی اجرت ملے گی اور کام بھی نصف کرنا ہوگا۔ جو ذہنی طور پر بالکل نکمے ثابت ہونگے وہ بالکل معمولی کام مثلاً صفائی۔ جاروب کشی اور قلی کا کام سرانجام دیں گے۔ اچھوت قوموں کو ان کاموں پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کی اپنی آبادیاں ہونگی۔ اس لئے ہر قوم کو اپنی بستیوں کی صفائی وغیرہ اپنے ہی قوم کے کند ذہن انسانوں سے کروانی ہوگی۔ کوئی قوم کسی قوم کی غلام نہیں ہوگی۔ کوئی شخص کسی شخص کا نوکر نہیں کہلا سکتا ہے۔ سبھی مزدور ہونگے۔ سبھی آقا۔ قابلیت پر اجرت کا انحصار ہوگا۔ ہر قوم قابل بننے کی سعی کرے گی۔ اقوام میں اصول مقابلہ عمل میں آئے گا۔ ہر قوم سبقت لیجانے کی کوشش کرے گی۔ اپنی اپنی بستیوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے گی۔ اپنے اپنے کلچر کو بلند کرنے کی سعی کرے گی۔ انسان کا فطری اقتضائے جنگ یہ صورت اختیار کرے گا۔ بجائے لڑنے کے۔ دست و گریبان ہونے کے وہ انسانیت کی جنگ لڑیں گے۔ وہ بہتر سے بہتر انسان بننے کی کوشش کریں گے جس قوم کا کلچر بلند ہوگا۔ لوگ اس کو قبول کرنے پر خواہ مخواہ آمادہ ہونگے یہ تبلیغ کا صحیح طریقہ ہوگا۔ اعمال سے کوئی قوم اپنے کردار کو پیش کرے گی۔ اقوال

طاقتوں کی زینت نہیں بنیں گے۔

(۹) ہر قوم کی عورتیں بھی اسی طریق پر عمل پیرا ہونگی۔ اپنی اپنی بستیوں میں وہ کام کریں گی انہیں مردوں کے برابر تنخواہ ملے گی۔ جو عورت کام نہیں کریگی۔ اسے کوئی اجرت نہیں ملے گی یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ حکومت کو افراد کی انفرادی اور سماجی زندگی میں کوئی دخل نہیں ہوگا یہ کام مذہب کے ذمہ ہوگا۔ ہر قوم اس کی خود ذمہ دار ہوگی۔ اپنے قوانین کے مطابق وہ افراد کے چال چلن کے متعلق باز پرس کر سکتی ہے۔ مثلاً کرسچن ٹاؤن کی بستیوں میں ایسے افراد ہیں جو برہنہ رہنے کے قائل ہیں۔ ایسے افراد ایک بستی میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ اور اپنی پسند کے مطابق سماجی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ کسی دوسری قوم یا حکومت کو ان سے باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اگر وہ دوسری اقوام کے امن عامہ میں دخل انداز ہونگے۔ تو حکومت کو بیشک انہیں سزا دینے کا اختیار ہوگا۔ اسی طرح مسلمانوں کی بستیوں میں بھی مذہبی اختلافات کی بنا پر ہر بستی ایک ہی کلچر کے پیروکاروں سے آباد ہونی چاہیئے۔ مثلاً ایسے مسلمان بھی ہیں جو پردہ کے پابند نہیں رہنا چاہتے۔ یا وہ مغربی طرز زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے مسلمان ایک علیحدہ بستی میں منتقل کیئے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اصلاح اور تبلیغ کی اجازت ہوگی۔ مگر کسی قوم کے مسلک یا مذہب کی توہین گوارا نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح ہر ٹاؤن سماجی طور پر آزاد ہوگا۔

(۱۰) ہر مرد عورت کو گیارہ مہینے کام کرنے کے بعد ایک مہینہ کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ ملے گی۔ عورتوں کو حاملہ ہونے کی صورت میں ایک مہینہ کی چھٹی مزید دی جائے گی۔ تفریح گاہیں سیرگاہیں صحت گاہیں وغیرہ سب مشترکہ ہونگی۔ ان کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہوگا۔ معمولی دام خرچ کرنے پر ان مقامات سے ہر کوئی لطف اندوز ہو سکے گا۔ حکومت کی طرف سے کھیل۔ تفریح۔ رقص اور موسیقی کا انتظام ہوگا۔ ایسی درسگاہیں بھی ہونگی جہاں عوام فنونِ لطیفہ کی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ یہ درسگاہیں مفت تعلیم دیں گی۔ یہ ادارے مشترکہ ہونگے اور سیرگاہوں اور پارکوں میں قائم کیئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہر قوم اپنے علاقہ

میں ایسی تفریح گاہیں اور کلبیں بنا سکتی ہے۔ جہاں قوم کے افراد مل جل سکتے ہیں۔ اور سماجی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(۱۱) حکومت کی امانت میں ایسے محکمے ہوں۔ مثلاً (۱) محکمہ تعمیرات عامہ جس میں مختلف شعبے ہو سکتے ہیں۔ عمارتیں۔ سڑکیں۔ نالیاں۔ پل وغیرہ (۲) محکمہ صنعت و حرفت یعنی تمام مصنوعات کی تیاری کے کارخانے وغیرہ (۳) محکمہ تقسیم اجناس یعنی اشیائے خوردنی اور مصنوعات کے ڈپو اور دکانیں (۴) محکمہ فوج یا دفاع (۵) تار اور ڈاک کا محکمہ (۶) محکمہ رسل و رسائل۔ یعنی ریل۔ لاریاں۔ بسیں۔ ٹرامیں وغیرہ۔ بقایا محکمے مثلاً محکمہ صحت تعلیم۔ امن عامہ۔ عدالت اور صفائی وغیرہ بستیوں کی پنچایت یا ٹاؤن کمیٹی کے سپرد ہوں۔ اس تقسیم کو سرکاری محکموں اور قومی محکموں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک بستی میں ایک ہزار خاندان آباد ہوں گے۔ عملی تجربہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ ایک بستی کے قومی اداروں کے لئے کتنے اشخاص کی ضرورت ہو گی۔ مثلاً ایک بستی میں اگر دس ڈسپنسریاں ہوں تو دس ڈاکٹر۔ دس کمپاؤنڈر۔ دس لیڈی ڈاکٹر۔ دس نرسیں درکار ہونگی۔ ایک ابتدائی تعلیم کا سکول ہو گا۔ یہ مخلوط ہو یا علیحدہ علیحدہ ایک تعداد مدرسوں کی مقرر کی جا سکتی ہے۔ فرض کر دیہ تعداد ایک سو ہے۔ اسی طرح پولیس۔ عدالت۔ صفائی کے محکموں کے عملہ کی تعداد مقرر ہو سکتی ہے۔ اسی طریق پر سرکاری محکموں کے عملہ کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ قومی اداروں کا عملہ اس بستی میں سکونت اختیار کریگا۔ سرکاری اداروں کا عملہ ٹاؤن کی کسی بستی میں مقیم ہو سکتا ہے۔ ہر ٹاؤن کے سرکاری اداروں میں ایک ہی قوم کے افراد کام کریں گے۔ مشترکہ اداروں مثلاً ریلوے۔ کارخانے کالج۔ دفاع وغیرہ میں سب اقوام کے افراد اکھٹے کام کریں گے۔

دوسرا باب

کلمہ۔ نماز۔ زکوات۔ روزہ اور حج کا صحیح مفہوم

انصر: "مائیکل میں تو ساری رات خواب میں بھی آپ کے آئین کے متعلق سوچتا رہا حکومت تو واقعی ایک وقت میں ایک ہی گروہ کی بہتر ہے۔ بہتر معاشی نظام میں ہی بہتر زندگی کا راز مضمر ہے۔ اسلام بھی مکمل نظامِ حکومت پیش کرتا ہے۔ خواہ اشتراکی حکومت آپ کے آئین کے مطابق قائم کی جائے یا اسلامی حکومت الٰہیہ کے مطابق علیحدہ علاقے مقرر کر دیئے جائیں۔ دونوں صورتوں میں اسلامی نظامِ زندگی کامیاب ہوسکتا ہے۔"

مائیکل: "اس کی ذرا وضاحت فرمایئے۔ آپ کا اسلام تو سائنس کی کسوٹی پر بھی پورا اُترا ہے۔"

"انصر گو میں پیدائشی مسلمان ہوں مگر اسلام کی حقیقی روح سے اب واقف ہوا ہوں آپ مجھے مسلمان بنا لیجیئے۔" میں نے کہا۔ اپنے لیئے میں مذہب یعنی زندگی کا راستہ انتخاب کر چکا تھا۔

انصر: "اسلام کے دستور العمل سے آپ کو کماحقہ واقفیت ہو چکی ہے۔ اگر آپ اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں تو شوق سے کلمہ پڑھ کر یعنی حلفِ وفاداری اٹھا کر اس پارٹی میں شامل ہو جایئے۔ مگر اتنی بات اور ذہن نشین کر لیجیئے کہ ہر سیاسی پارٹی کا ایک نصب العین ہوتا ہے جس کے حصول کے لیئے ایک لائحہ عمل وضع کیا جاتا ہے۔ اسلام کا نصب العین ہے کہ انسانوں پر خدا کی حکومت ہو یعنی دنیا میں نیکی اور سچائی کا بول بالا ہو۔ اس لیئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں وہ صرف خدا کی اطاعت کرے یعنی راہِ راست پہ

گامزن رہے۔ راہِ راست کیا ہے اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان ایک سپاہی ہے اور خدا کی حکومت قائم کرنا اس کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔ سپاہی کے ذمہ چار فرائض ہیں (۱) پانچ وقت روزانہ نماز (۲) سال میں ایک مہینہ روزے رکھنا (۳) سال کے بعد زکوات ادا کرنا (۴) تمام عمر میں ایک دفعہ مکہ کا حج کرنا۔

مائیکل "یہ مذہبی رسوم ہیں یا اُن کا کچھ اور بھی مفہوم ہے؟ اسکی وضاحت فرمایئے۔"

النصر "میں بھی یہی بیان کرنے والا ہوں۔ آپ غور سے سنتے رہیئے مطلب خود بخود واضح ہو جائے گا۔ پہلے نماز کو لیجئے۔ نماز کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ انسان برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ وہ کیسے سب سے پہلے اذان کو لیجئے " اللہ سب سے بزرگ ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں۔ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز کے لیئے آؤ۔ بھلائی کے لیئے آؤ۔ نماز نیند سے بہتر ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" اللہ کے سپاہی کے لیئے اذان کی آواز وہی اثر رکھتی ہے جو بگل کی آواز ایک فوجی کے لیئے۔ اس آواز کو سنتے ہی وہ تمام کاروبار وہیں چھوڑ دیتا ہے اور مسجد کا رُخ کرتا ہے۔ اگر کوئی سپاہی دن میں پانچ دفعہ اس بگل کی آواز پر حاضر نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اللہ کی فوج میں شامل نہیں رہ سکتا ایسے کاہل اور باغی سپاہی کو دنیا کی کوئی فوج قبول نہیں کر سکتی۔ اس لیئے نماز کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ پابندی وقت کا درس دیتی ہے۔ اور سپاہی کی مستعدی کا امتحان بھی ہو جاتا ہے اس کے بعد وقت مقررہ پر تمام حاضر سپاہی ایک ہی امام کی قیادت میں قطاروں میں کھڑے ہو جاتے ہیں امیر او مفلس۔ قابل او رجاہل شانہ بشانہ ایک ہی شخص کی حرکات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ مساوات کا عملی ثبوت ہے۔ نماز ایک ہی امیر کی اطاعت کرنا سکھاتی ہے فوج میں تنظیم کس قدر اہم امر ہے کسی سے مخفی نہیں۔ نماز انہی خوبیوں کی حامل ہے۔ فوج کے سپاہی قطاروں میں ترتیب وار کھڑے ہونے کے بعد بالکل ساکت (اٹینشن) ہو جاتے ہیں یعنی حکم کی تعمیل کے لیئے مستعد ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا سپاہی کعبہ کی طرف منہ کر کے

ایک ہی زبان یعنی عربی میں خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ میں نے اپنا رُخ خلوص دلی سے اس ہستی کی طرف کر دیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدا کی حکومت میں کسی دوسرے کو شریک کرتے ہیں۔ یہ کہنے کے بعد سپاہی دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھاتا ہے جس کا یہ مفہوم ہے کہ اس نے اپنے حاکم اعلیٰ کے لئے سب کچھ ترک کر دیا۔ اور وہ اللہ کو سب سے بڑا کہہ کر پھر ہاتھ باندھ لیتا ہے اور یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ پاک ہے تیری ذات جس کی میں پرستش کرتا ہوں۔ تمام ستائش تیرے ہی لائق ہے۔ تیرا رتبہ سب سے بلند ہے۔ تیرے سوا کوئی ہماری اطاعت گذاری کا حقدار نہیں ہے۔ اس کے بعد قرآن کی آیات پڑھی جاتی ہیں۔ جو اللہ کے احکام۔ قوانین یا زندگی کے طرز عمل کو بیان کرتی ہیں۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ مسلمان دن میں پانچ دفعہ اپنے حاکم سے حلف وفاداری اُٹھاتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن مسجد سے نکلنے کے بعد وہی مکاری۔ فریب دہی۔ رشوت ستانی جھوٹ بولنا سود لینا۔ دوسرے انسانوں کو ایذا پہنچانا۔ مفلس انسانوں پر ظلم کرنا۔ زنا کرنا۔ غیبت کرنا وغیرہ شروع کر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب پھر وہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ تو اقرار کرتا ہے کہ وہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہیں کریگا۔ کس طرح ممکن ہے کہ تم بار بار حلف وفاداری اٹھاؤ۔ نیکی اور سچائی کے راستہ پر گامزن ہونے کا اقرار کرو اور پھر تمام عمر وعدہ خلافی کرتے رہو۔ گناہوں کا ارتکاب کرتے رہو۔ کیا تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہ کریگا۔

اگر نماز سے بھی کسی کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو اس میں اسلامی نظم کار کا کیا قصور۔ صابن اور پانی کا کام میل کو دھونا ہے اگر ان کی مدد سے تارکول کا داغ دور نہیں کیا جا سکتا تو صابن اور پانی کو ناکارہ قرار دینا نامناسب ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ نماز کو ایک مذہبی رسم تصور کر لیا گیا ہے۔ پوجا پاٹھ سمجھ لیا گیا ہے۔ اللہ کوئی جسم نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ انسانی جذبات سے عاری ہے۔ اسے خوشامد اور تعریف کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ شیریں الفاظ سے پھسلایا نہیں جا سکتا۔ وہ اعمال کو جانچتا ہے۔ اقوال کو وہ ہرگز خاطر میں نہیں لاتا۔ تمام رات یا اللہ یا محمد کا ورد کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہیں اتنی ہی فرصت ہے تو جاؤ خلق خدا

کی خدمت کرو۔ انسانوں کو راہِ راست پر لگاؤ۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کارِ ثواب ہاتھوں میں لو۔ گمراہوں کو ہدایت دو۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ دنیا والے تمہیں سر آنکھوں پر جگہ دیں گے۔ اللہ تمہارے لئے جنت کے دروازے وا کر دے گا۔" یہ ہے نماز کا مفہوم یعنی سچائی کے راستے پر گامزن ہونے کی کوشش۔ اگر تمہیں جو کچھ عربی زبان میں نماز کے دوران میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے معانی سے واقفیت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا کردار بلند نہ ہو سکے۔"

"بیشک اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جنہیں عربی کے الفاظ تو یاد ہیں مگر نہ اُن کا ترجمہ معلوم ہے اور نہ نماز کے مفہوم کا علم ہے۔" میں نے کہا۔

الغرض رونا تو یہی ہے اور بدنام اسلام کو کرتے ہیں۔ یہ تو ہوا نماز کا اصلاحی رخ اب نماز باجماعت کے مفہوم پر غور کیجئے۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ہی مفہوم ہے یعنی خدا کی اطاعت کرنا اور کروانا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے نماز افراد کو تربیت دیتی ہے ایک ہی کمانڈر یا امیر کے احکام کی پیروی کرنا سکھاتی ہے۔ اللہ کے سپاہیوں کی تنظیم عمل میں لاتی ہے۔ جو مسلمان اس قواعد میں حصہ نہیں لے سکتا وہ اللہ کی ملازمت سے برطرف ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہے نماز کا سیاسی پہلو۔ اب لیجئے سماجی اور معاشرتی پہلو۔ مسجد ایک کلب کی مانند ہے جہاں سماج کے افراد جو ایک ہی اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور ایک ہی رسول کی پیروی کرتے ہیں دن میں پانچ دفعہ جمع ہوتے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ ایک دوسرے سے رابطہ اتحاد قائم ہو۔ اخوت کا عملی ثبوت پیش کیا جائے۔ اگر کوئی بھائی پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ہے یا اس کا چہرہ فاقہ زدہ ہے یا وہ بیمار ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک سچا مسلمان اس کی حالت سے متاثر نہ ہو اور اس کی تکلیف رفع کرنے کی سعی نہ کرے۔ اگر کوئی شخص غیر حاضر ہے تو فطری طور پر اس کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا جائیگا۔ اگر وہ بیمار ہے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہے تو آپ کو اس کی احوال پرسی کے لئے گھر جانا مناسب ہوگا۔ ایسی تمام چھوٹی چھوٹی باتیں اخوت کے رشتے کو مضبوط بنا سکتی ہیں۔ یہ نہیں کہ مسجد میں آئے۔ چند منٹ رسمی طور پر رکوع و سجود کیا اور باہر نکل گئے۔ اللہ کو یہ ہرگز قبول نہیں کہ اس کی ذات

سے محبت کی جائے۔ مگر اس کے بندوں سے نفرت کا اظہار ہو۔ کہاں تک بیان کروں۔ نماز کے بیشمار محاسن اور فوائد ہیں۔ کاش مسلمان ایک ہی خوبی اپنا لیں مسجدوں کو مندر تصور کرنا چھوڑ دیں مسجد ایک دیوان عام ہے۔ جہاں پنچایت کے ذریعے معمولی تنازعوں کا تصفیہ ہو سکتا ہے آپس کے جھگڑے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر طے ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کے اقدام تجویز کئے جا سکتے ہیں کس قدر مواقع مسلمانوں کو دستیاب ہوتے ہیں جن سے کوئی استفادہ نہیں کیا جاتا۔ روزانہ پانچ وقت کی ملاقات۔ پھر جمعہ کے دن تمام شہری مسلمانوں کا اجتماع۔ سال میں دو دفعہ عید کے موقع پر سارے شہر اور گرد و نواح کے دیہات کا جم غفیر اور پھر ہر سال حج کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع۔ نماز کا سیاسی پہلو نہایت اہم ہے۔ جسے بیدردی سے نظر انداز کیا جاتا ہے"

مائیکل: "یہ تو بہت زبردست تنظیم ہے۔ مسلمان تو اس قسم کی نماز سے دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں"

النصر: "ابھی تو اسلام کے ایک ہی اصول کی تشریح کی ہے۔ نماز کے بعد زکوٰت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ معاشی نظام کا بہتر ہونا ایک نہایت ہی لازمی امر ہے۔ سرمایہ اور مزدور محنت کے مسئلہ کا اسلامی حل میں بیان کر چکا ہوں۔ زر۔ زن۔ زمین تمام فسادات کی جڑیں ہیں۔ دوستوں۔ رشتہ داروں ہمسایوں وغیرہ کی محبت اور انس کا امتحان اسی زر پر منحصر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مفلسی میں سب کنارہ کشی کر جاتے ہیں حقیقی دوست کی پہچان اسی وقت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ بھی اپنے اطاعت گذاروں کا امتحان لیتا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں خرچ کر سکتا ہے وہی اس کا دوست بن سکتا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے " نیکی اسی امر پر موقوف نہیں کہ تم اپنا رخ نماز کے وقت مشرق یا مغرب کی طرف کرلو۔ نیک وہ ہے جو اللہ کی ہستی۔ روز جزا۔ فرشتوں۔ تمام رسولوں اور آسمانی کتابوں پر یقین رکھتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں اپنی دولت میں سے ایک حصہ اپنے حاجتمند رشتہ داروں یتیموں ہمسایوں مسافروں اور تمام دوسرے انسانوں کی اعانت میں صرف کرتا ہے جو مفلسی کی وجہ سے

مسرت سے محروم ہوتے ہیں یا مفلس قرض داروں اور غلاموں کو ان آفات کے چنگل سے آزاد کرواتا ہے۔" اللہ کو اس اعانت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک مہذب سماج میں خیرات ایک اہم ادارہ ہے۔ اس لئے دولتمندوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے ایک حصّہ ناداروں کی حاجت روائی کے لئے وقف کر دیں۔ اشتراکی نظام کی عدم موجودگی میں خیرات ہی اعانت کی دوسری صورت ہے۔ قرآن کی روشنی میں خیرات کا مفہوم یہ ہے (۱) خیرات صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر کی جائے۔ اگر خیرات کسی ذاتی مفاد کے پیش نظر کی جائے۔ تو خیرات کا مفہوم ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ خیرات اس طرح کرو کہ اگر دایاں ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کی خبر نہ ہو۔"

مائیکل: " یہ تمام باتیں تو میرے نظریے کے مطابق ہیں یعنی نیکی برائے نیکی ہی سب سے بلند آدرش ہو سکتا ہے۔ سچائی اگر اللہ کا نام ہے تو سائنس اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے۔"

انصر: " بیشک۔ اصولوں میں کوئی فرق نہیں منزل ایک ہی ہے راستے دو ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہمیشہ اچھی چیز خیرات کرو۔ پھٹے پرانے کپڑے اور دستر خوان کا بچا کھچا کھانا خیرات میں دینا اللہ کو پسند نہیں ہو سکتا۔ جو چیز تم خود پسند نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کے لئے پسند کیوں کرتے ہو خیرات صرف حقداروں کو دو۔ اچھی غذا اور اچھے ملبوسات ایسی ضروریات ہیں جو ہر ایک انسان کو میسر آنی چاہئیں۔ خواہ وہ قیدی ہو یا مجرم مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خیرات ناداروں کو شراب اور افیم مہیا کرے۔ اگر خیرات سست۔ کاہل اور دست نگر بننے میں مدد دیتی ہے تو ایسی خیرات ناجائز ہے۔ خیرات کا مقصد یہی ہے کہ جائز ضروریات کے مہیا کرنے میں ناداروں کی مدد کی جائے (۴) اگر کسی کو روپیہ قرض دو تو اسکی ادائیگی پر زور مت دو۔ قرضدار کو مہلت دو اور اگر واقعی وہ قرضہ ادا کرنے کے ناقابل ہو تو اس کو قرضہ معاف کر دو۔ اللہ اس کا اجر کئی گنا زیادہ عطا کرے گا (۵) حد سے تجاوز کرنا ہر حالت میں بُرا ہے۔ اس لئے اللہ اپنی خیرات اور سخاوت کرنے سے بھی منع کرتا ہے جس سے

وہ خود مفلس ہو جائے اور اُس کے بیوی بچوں کو فاقہ کشی کرنا پڑے۔ خیرات اتنی ہی مناسب ہے جو ذاتی اخراجات کے بعد آسانی سے کی جا سکے۔ یہ تو ہیں پسندیدہ خیرات کے اصول۔ اب لیجئے زکوات کو یعنی لازمی خیرات کی ادائیگی کے قوانین (۱) بارش سے جو اناج۔ سبزیاں اور پھل وغیرہ پیدا ہوں ان کا دسواں حصہ۔ آبپاشی سے جو پیداوار ہو اس کا بیسواں حصہ۔ یہ حصہ فصل کی تیاری پر واجب الادا ہو جاتا ہے (۲) اگر کسی شخص کے پاس کم از کم ساڑھے سات تولے سونا ہے یا ساڑھے باون تولے چاندی ہے یا دونوں ملا کر اس قیمت کے مساوی ہیں اور جو ایک سال کے لئے ملکیت میں رہ چکے ہوں تو اس قیمت کا چالیسواں حصہ زکوات ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس کم از کم چالیس بھیڑیں یا بکریاں یا گائیں ایک سال سے قبضہ میں ہیں تو ان کی مجموعی قیمت کا چالیسواں حصہ بطور زکوات دینا ہوگا۔ اس لئے اسلام دولت کو خرچ کرنے کا درس دیتا ہے۔ اگر کوئی جمع کرتا ہے تو اسے خسارہ ہی رہے گا۔"

مائیکل:"بڑے ہی کارآمد قوانین ہیں۔ بیشک یہ اشتراکیت کے مدمقابل بن سکتے ہیں مگر کیا ان قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے؟ اس صورت سے کوئی مسلمان مفلس و نادار نہیں رہنا چاہیئے۔"

انصر:"یہی تو کمی ہے۔ جو کام کی چیز ہے اسے علمائے دین نظر انداز کئے بیٹھے ہیں میرے تنہا زکوات دینے سے کیا بنتا ہے۔ میں جی میں بہت کڑھتا ہوں۔ مگر فکرِ معاش سے مجھے فرصت نہیں ملتی ورنہ . . . . "

مائیکل:"اس لئے اشتراکیت بہتر ہے کہ ہر شخص کو مجبوراً وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کی آپ کا اسلام تلقین کرتا ہے۔"

انصر:"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ اشتراکیت یا جمہوری حکومتِ الٰہیہ۔ آخر الذکر نظام میں دوسرے مذہب کے پیروکار بطور رعایا ہی رہ سکتے ہیں اس کے برعکس اول الذکر میں تمام مذاہب اور قومیں نشوونما پا سکتی ہیں۔ اس لئے میں تو

اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کے نظریے کے مطابق ہر ملک میں اشتراکیت ہو مگر آبادیوں میں مذاہب کی حکومت ہو۔"

مائیکل:- "اچھا تو یہ بتایئے کہ زکوات کے روپے کی وصولی اور تقسیم کا کیا طریقہ اسلام نے تجویز کیا ہے۔"

انصر:- "زکوات کی رقوم ایک بیت المال میں جمع ہوں اور پھر مستحق لوگوں میں تقسیم کی جائے۔ مستحق لوگوں کی فہرست اسلام نے یہ پیش کی ہے (۱) ایسے اشخاص جو تنگی سے گذر اوقات کرتے ہیں مگر دست سوال نہیں دراز کرسکتے (۲) ایسے افراد جو نابینا ہوں۔ اپاہج یا مایوس العلاج ہوں۔ کام کی تلاش کے باوجود بیکار ہوں (۳) زکوات وصول کرنے والے جو حکومت کی طرف سے مقرر ہوں۔ ان کی تنخواہ یا ان کا معاوضہ بھی اسی بیت المال میں سے ادا کیا جائے (۴) ایسے اشخاص جو اسلام کو قبول کرنے کی وجہ سے اپنی وراثت۔ جائداد یا ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں (۵) غلام جو آزادی کے خواہاں ہوں۔ کیونکہ غلامی کا انسداد ہو چکا ہے۔ اس لئے اس تحت میں ایسے سیاسی قیدی شامل کئے جاسکتے ہیں جو روپیہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اغیار کی قید میں ہوں (۶) ایسے اشخاص جو اپنا قرضہ چکانے کے بعد بہت کم اثاثہ کے مالک رہ جائیں ان پر زکوات فرض نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ قرضہ فضول خرچی کا نتیجہ نہ ہو (۷) مجاہد یعنی وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنا وقت اور قوت صرف کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہوں مگر غیر معمولی اخراجات کو برداشت کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں (۸) ایسے لوگ جو سفر میں ہوں اگرچہ وہ اپنے گھر پر مالدار ہوں مگر زادِ راہ میں کمی واقع ہو جائے یا روپیہ چوری ہو جائے۔ ان کو وطن پہنچانا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ نماز اور زکوات کا مفہوم تو واضح ہو گیا ہو گا۔ اب لیجیئے اسلام کا تیسرا فریضہ یعنی ماہ رمضان کے روزے۔ روزہ رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صبح سے لیکر شام تک تیس دن فاقہ کیا جائے اور اس کے بعد جو جی میں آئے کھا لیا جائے۔ یہ کوئی رسم نہیں ہے بلکہ نماز اور زکوات کی طرح ایک خاص مقصد کے

کا ذریعہ ہے اللہ فرماتا ہے۔ اے ایمان والو۔ روزے تم پر بھی اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح کہ ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں تاکہ تم شاید پرہیزگار بن سکو" شاید کا لفظ قابل غور ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم یقیناً پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اللہ نے تو نسخہ تجویز کر دیا ہے۔ تیس دن بھوک، پیاس اور شہوت پر قابو رکھنا تسخیر نفس کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ روزہ رکھنے کا یہ مطلب ہے کہ انسان تمام گناہوں کے ارتکاب سے پرہیز کرے۔ ایک مہینہ کی یہ تربیت سارے سال کام آسکتی ہے۔ ہر سال کی کوشش سے انسان اپنے جذبات پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھیں کہ اسلام نفس کشی کی تعلیم نہیں دیتا۔ جذبات کو فنا کرنے کا درس نہیں دیتا۔ البتہ جذبات کو جائز طور پر تسکین دینے کی تلقین ضرور کرتا ہے۔ بھوک۔ پیاس اور جنسی بھوک ایسی ضرورتیں ہیں جن کو نظر انداز کرنا امر محال ہے۔ صبح سے شام تک روزہ دار ان ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ مگر روزہ افطار کرنے کے بعد روزہ رکھنے کے وقت تک وہ ان تینوں ضرورتوں کو قوت ارادی کے تابع کر سکتا ہے۔ وہ سال میں کسی وقت بھی ضرورت پڑنے پر ایسا کرنے کا حوصلہ رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اگر آپ رمضان کے مہینے کے ختم ہوتے ہی پھر وہی شراب نوشی زناکاری۔ فریب کاری۔ جھوٹ ظلم اور ناانصافی کا ارتکاب کرنے لگیں تو اس کا یہی مطلب ہوا کہ کیا کرایا سب خاک میں مل گیا۔ اسی لئے رسول عربی کا قول ہے کہ اکثر روزہ دار ایسے ہیں جو سوائے بھوک اور پیاس کے اور کچھ حاصل نہیں کرتے۔ ایسے بھی ہیں جو تمام رات عبادت میں کھڑے رہتے ہیں مگر تھکاوٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا" اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ صرف فاقہ کشی ہی روزہ کا مفہوم نہیں۔ روزہ جذبات پر اختیار حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ روزہ درحقیقت وہی ہے جو تمام گناہوں کی آلائشوں سے پاک ہو۔ یہ تو ہے روزہ کا انفرادی اصلاح کا پہلو۔ اب مذہبی پہلو پر غور کیجئے۔ کیا اس بات کا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص جس کے ذہن میں خدا کے وجود اور روز جزا و سزا کے متعلق کوئی ذرا سا بھی شک وشبہ موجود ہے۔ جون کی چلچلاتی دھوپ اور بے پناہ گرمی میں بھوکا اور پیاسا

رہنا پسند کر سکتا ہے؟ یہ انسانی فطرت ہے کہ شک وشبہ قوتِ ارادی کو کمزور کر دیتا ہے۔ اسلئے یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص جو خدا کی ہستی کا قابل نہ ہو یا یقینِ کامل نہ رکھتا ہو وہ روزے کی مصیبتوں کو بخوشی جھیلنے کی تاب رکھ سکتا ہے۔ اس لیئے روزہ اللہ کے سپاہی کا زبردست امتحان ہے۔ فوجی تربیت کی طرح یہ امر لازمی ہے کہ تمام افراد کی مجموعی طور پر تربیت کی جائے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر سال میں رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا ہے تاکہ ساری قوم کی ایک ہی وقت میں تربیت عمل میں لائی جائے۔ قوموں کی اصلاح و تربیت میں تنظیم کا عنصر نہایت اہم درجہ رکھتا ہے۔ اب لیجئے کعبہ کا حج۔ مختصر طور پر کعبہ کی تاریخ یہ ہے کہ سب سے پہلے کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ مقام صرف عبادت کیلئے مخصوص نہیں کیا گیا تھا۔ اصلی غرض و غایت یہ تھی کہ کعبہ اسلام کا مرکز بنے جہاں ہر سال دنیا کے تمام کونوں سے توحید کے پرستار اکٹھے ہوں۔ ایک پروگرام مرتب کیا جائے اور اس پیغام کو حاجیوں کے ذریعے تمام دنیا میں نشر کیا جائے۔ مگر کچھ عرصہ گذرنے پر کعبہ سب سے بڑے بتخانے میں مبدل ہو گیا۔ ہر طرف سے لوگ ہر سال جمع ہوتے مگر یہ اجتماع میلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس موقعہ پر دعوتیں اڑتیں۔ موسیقی۔ رقص۔ عورت اور شراب اپنے جوبن پر ہوتی۔ حج کرنیوالے کعبہ کا طواف بھی کرتے تھے مگر کس طرح؟ مرد عورت برہنہ حالت میں کعبہ کے گرد چکر لگاتے اور یہ کہتے کہ خدا کے پاس وہ اسی حالت میں لوٹیں گے جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ حالت دو ہزار برس تک رہی اور ایک بار پھر رسول عربی نے حضرت ابراہیم کی تاریخ کو دہرایا اور بتوں کی جگہ اللہ کی حکومت مکہ میں قائم کر دی۔"

مائیکل: "حج کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہ بھی مذہبی رسم ہے؟"

انصر: "جس مقصد کے حصول کے لئے نماز۔ زکوات اور روزہ اعانت کرتے ہیں حج اس تربیت کے آخری قواعد میں سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حج ایک ایسا سفر ہے جو تمام ذاتی اغراض سے پاک ہے سیر یا تجارت اس کا مدعا نہیں ہوتا۔ حج کو جانیوالا شخص اپنے وطن۔ آرام و آسائش، دوست احباب اور رشتہ داروں کو محض اللہ کی اطاعت گذاری کا

ثبوت دینے کی خاطر چھوڑتا ہے۔ وہ ایک نیک مقصد پیش نظر رکھ کر روانہ ہوتا ہے اس لئے معمولی گناہ سے بھی اجتناب کرنا نہایت لازمی ہے۔ بُرے اعمال تو کجا بُرے خیالات سے پرہیز بھی ضروری ہے۔ گناہ کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ جبکہ وہ ایسے مقدس کام کو ہاتھوں میں لیتا ہے۔ یہ اس کا آخری امتحان ہے اور اس میں کامیابی حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ حج کے سفر کا تصور کیجیئے۔ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسے اپنا پسندیدہ یا ملکی لباس اتار کر احرام، باندھنا پڑتا ہے یعنی صرف ایک سفید چادر۔ جوتا استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اس منزل کے بعد عطر آرائش و زیبائش۔ مواصلت اور شکار ممنوع ہیں۔ اس کا باطن ایسا ہی سفید اور بے داغ ہونا چاہیئے جیسا کہ ظاہری لباس۔ احرام باندھنے کے بعد وہ بلند آواز سے یہ الفاظ عربی زبان میں ادا کرتا ہے "میں حاضر ہوں اے میرے خالق میں حاضر ہوں تیرا کوئی ثانی نہیں۔ تیرا حکم بجا لایا ہوں۔ تمام ستائش تیرے ہی لائق ہے۔ تمام کائنات کا تو ہی مالک ہے اور تیری شہنشاہی میں کوئی شریک نہیں" یہ ہیں وہ الفاظ جو نماز کے بعد۔ چڑھتے اترتے۔ دوسرے لوگوں کے پاس سے گذرتے وقت اور بیدار ہوتے ہوئے ادا کرتا رہتا ہے۔ یہ الفاظ یہ دراصل حضرت ابراہیم کی پکار کا جواب ہیں۔ جو آپ نے کعبہ کی تکمیل کے بعد بلند آواز سے کہے تھے "اے اللہ کے خادمو۔ اللہ کے گھر کی طرف آوٴ۔ دنیا کے تمام کونوں سے آوٴ۔ پیدل آوٴ۔ سوار ہو کر آوٴ" اس نظارہ کا تصور کرو۔ جب لاکھوں کی تعداد میں حاجی اس پکار کا جواب دیتے ہیں۔ چار ہزار سال کا عرصہ نیست و نابود ہو جاتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کھڑے دوسری طرف سے پکار رہے ہیں اور تمام حاجی اس طرف سے جواب دے رہے ہیں۔ اس انداز سے توحید کا پرستار۔ سچائی کا عاشق۔ صداقت کا سرچشمہ کعبہ کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔ مکہ پہنچتے ہی وہ سیدھا کعبہ کا رخ کرتا ہے تین دفعہ طواف کرتا ہے اور ہر دفعہ حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے۔ وہ پتھر جو حضرت ابراہیم نے اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا۔ اس کے بعد چند دن وہ وہاں قیام کرتا ہے اور چند مذہبی احکام بجا لاتا ہے۔ اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور عارضی پابندیاں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ تو

ہے۔ حج کا انفرادی پہلو یعنی تکمیل تربیت۔ اب اس کے سیاسی پہلو پر غور کیجئے۔ جو زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ خیال کیجئے کہ حج کے موقعہ پر تمام دنیا کے ملکوں سے لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے مختلف ممالک سے وہ ایک ہی مرکز پر ایک ہی مقصد لیکر جمع ہوتے ہیں۔ جس وقت وہ حج کے سفر پر روانہ ہوئے تھے مختلف لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ مگر اب ایک ہی قسم کے لباس یعنی وردی میں ملبوس ہیں۔ شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ نماز کی ادائیگی اور پکار کا جواب دیتے وقت ایک ہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اور ایک ہی امام کی قیادت میں نماز پڑھتے ہیں۔ اور ایک ہی طریقے سے مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ مساوات اور اخوت کا اس سے بہتر نظارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے رنگ و نسل۔ قوم و وطن۔ دولت و افلاس کے اختلافات کو ایک ہی وار میں دور کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اسلام نے حج کے چار مہینوں کو مقدس قرار دیا ہے اور کسی قسم کا فساد یا کسی قسم کی جنگ کرنے سے منع کیا ہے سال میں کم از کم چار مہینے امن قائم رکھنے کا یہ عملی طریق ہے۔ اور ایک ایسا مرکز مہیا ہو جاتا جہاں تمام مسلمانوں کے حقوق برابر ہیں۔ رسول عربی نے فرمایا تھا کہ جو کوئی بھی اس شہر میں آ کر آباد ہوگا وہ اسی کی اقامت گاہ بن جائے گا۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ مرکز جہاں سے علم و صداقت کی روشنی تمام دنیا میں پھیلی۔ وہی مرکز اسی جہالت کے پردے میں مستور ہو چکا ہے جس کو رسول عربی نے دور کیا تھا۔ اللہ کا گھر ایک جاگیر بن چکا ہے۔ اور منتظمین کعبہ زر کے بندے بن چکے ہیں۔ حج ایک رسم میں مبدل ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاجیوں کی اکثریت سچے مسلمانوں کا نمونہ بن کر واپس نہیں آتی۔ ان کے کردار میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آتی۔ کیا یہ شرمناک بات نہیں ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ہر سال ایک ہی مرکز پر جمع ہوتے ہیں اور کوئی تعمیری کام نہیں کرتے اور حجوں کے توں واپس آ کر پھر وہی گناہ آلود زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر یہ حاجی صداقت کا پیکر بن کر لوٹیں تو کیا یہ لوگ دوسروں کے کردار پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ ان کا اپنا اعلیٰ کردار جہاں بھی وہ رہیں جہاں سے گذریں۔ ایک انقلاب کا باعث

ہو سکتا ہے کسی تبلیغ کی ضرورت نہیں کسی پروپگنڈا کی ضرورت نہیں۔ لوگ خود بخود جوق در جوق اسلام کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک وقت تھا غیر مسلم ایمانداری کی مثال یوں دیا کرتے تھے کہ وہ ایسا ہی ایماندار ہے جیسا کوئی مسلمان۔ اور اب مسلمانوں نے بددیانتی جھوٹ اور فریب میں غیر مسلموں کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ خالی الفاظ کبھی مفید نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کے گھر پیدا ہونے سے تم غیر مسلموں پر کوئی فوقیت نہیں رکھتے۔ فوقیت وہ رکھتا ہے جو قابلیت اور کردار میں بلند درجہ رکھتا ہے اور کردار کی تربیت کا بہترین طریقہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ اگر ان چاروں قواعد پر صحیح معنوں میں عمل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا تمہارے قدموں میں نہ آ گرے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے جو رسول عربی اور خلفائے راشدین نے دنیا کے سامنے عملی ثبوت کی صورت میں پیش کی تھی۔ تم یہ تاریخ پھر دہرا سکتے ہو۔ دنیا جنگ سے تنگ آ چکی ہے۔ تمام اقوام امن عالمگیر کے نسخہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ چار سو اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ روشنی کی سخت ضرورت ہے۔ یہ روشنی تم مہیا کر سکتے ہو۔ تم راہِ راست کی طرف رہنمائی کر سکتے ہو۔ سائنس بوکھلا چکی ہے۔ اس نے ہر چیز پر مادیت کا رنگ چڑھا دیا ہے۔ علم الطبیعات۔ علم الحیات اور نفسیات روشنی میں ہر چیز کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کا قدم اٹھایا۔ مگر جس قدر علم حاصل ہوتا جا رہا ہے اُسی قدر علم کے بے پایاں ہونے کا ثبوت بہم پہنچ رہا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابھی انسان کا علم بہت خام ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ مشرق پھر مغرب کو روشنی دکھائے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ تم خود پہلے ایک مثالی کردار بنو۔

تیسرا باب

ایک تجویز

انصر کی باتیں میرے دلنشیں ہو گئیں۔ مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مذہب کا ظاہری وجود تو قائم ہے مگر مفہوم مردہ ہو چکا ہے۔ لوگ مذہب کے نام پر مرنے مٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر مذہب سے حقیقی استفادہ نہیں اٹھاتے۔ مائیکل ایک ایسے ٹاؤن بنانے کی فکر میں رہتا تھا۔ جہاں سب آزاد ہوں۔ سب مسرور ہوں۔ سب صحیح معنوں میں انسان ہوں۔ انصر اور میں اس ٹاؤن کو اللہ کے زیر سایہ آباد کرنے کے خواہشمند تھے۔ میں نے ایک پروگرام بھی اس سلسلے میں وضع کر لیا تھا۔ انصر نے اسے بہت پسند کیا۔ مائیکل نے بھی اس کی تائید کی۔ تجویز یہ تھی کہ مائیکل کے آئین کے مطابق جب ایک قوم ایک ٹاؤن میں آباد کی جائے تو قوموں کی اس طریق پر تنظیم بآسانی ہو سکتی ہے۔ ایک بستی میں ہزار خاندان آباد کئے جائیں۔ ایک ہزار بالغ مردوں کے جو اپنے اپنے خاندان کے نمائندے ہونگے دس دستے بنائے جائیں۔ یعنی ایک سو ہمسایوں کا ایک دستہ ہوگا۔ دس ہمسائے مل کر اپنے میں سے بہترین شخص کو انتخاب کریں جو انکا حوالدار کہلا سکتا ہے۔ دس حوالدار مل کر ایک سارجنٹ منتخب کر سکتے ہیں۔ اسی طریق پر ایک بستی کے دس سارجنٹ مل کر بہترین شخص کو اپنا لفٹننٹ منتخب کر سکتے ہیں یعنی ایک

بستی کے ایک ہزار بالغ مرد ایک لفٹننٹ کے ماتحت ہونگے۔ یہ ایک کمپنی کہلائی جا سکتی ہے
ایک ٹاؤن میں اگر کسی بستیاں ہیں تو کئی لفٹننٹ مل کر بہترین فرد کو اپنا کیپٹن منتخب کر سکتے ہیں۔ اس
طرح ایک ٹاؤن کا ایک کیپٹن ہو گا۔ ایک ضلع کے تمام کیپٹن مل کر ایک ڈسٹرکٹ کمانڈر کا
انتخاب عمل میں لا سکتے ہیں۔ تمام اضلاع کے کمانڈر مل کر صوبہ کے اعلیٰ کمانڈر کا انتخاب
کر سکتے ہیں۔ اس طرح پروپیگنڈا کئے بغیر بہترین شخص کا انتخاب عمل میں آسکتا ہے۔ جو
شخص قابل۔ ہر دلعزیز اور اعلیٰ کردار کا مالک ہو گا وہی منتخب ہو سکتا ہے۔ حوالداروں
کے فرائض یہ ہوں (۱) جو نو اشخاص اس کے ماتحت ہیں ان کو اوقاتِ نماز کی پابندی
پر مجبور کرے۔ یعنی ایک مقررہ جگہ پر خواہ مسجد ہو یا میدان سب وہاں حاضر ہوں۔ جو غیر حاضر
ہوں انکی سارجنٹ کے پاس رپورٹ کی جائے۔ اگر کوئی شخص بیمار ہے یا کسی تکلیف
کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا تو اس کی اطلاع ہونی چاہیئے۔ اس طریق پر ایک سو آدمی
تربیت پا سکتے ہیں (۲) صبح کی نماز کے بعد حوالدار اپنے نو سپاہیوں کو لیکر کھلی ہوا میں
پہنچے جہاں سارجنٹ کی قیادت میں جسمانی تربیت کی جائے۔ غیر حاضر ہونے کے لیئے
زبردست وجہ ہونی چاہیئے (۳) رمضان کے مہینے میں وہ ان نو اشخاص سے زکوات
وصول کرے۔ اس رقم کو سارجنٹ کے حوالے کر دے یہ لیت ولعل کرنے والوں کی
رپورٹ کرے۔ یہ رقم عید سے پہلے بیت المال میں جمع ہونی چاہیئے (۴) اگلے سال کے
لیئے حوالدار کا انتخاب عمل میں لائے اور اس کے نتیجہ سے سارجنٹ کو مطلع کیا جائے کسی
قوم کی اصلاح مقصود ہو تو اس کے ہر فرد کی اصلاح کر دو۔ قوم خود بخود سدھر سکتی ہے
پائیوں کے جمع کرنے کی طرف توجہ دو، روپے خود بخود بن جائیں گے۔ یہ سنہری اصول
مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح سارجنٹ کے فرائض یہ ہونگے (۱) زکوات کی رقوم کا اندراج
کرنا اور حوالداروں سے مشورہ کرنے کے بعد اپنے دستہ کے مستحق لوگوں میں اُسے تقسیم کرنا۔ اگر
کوئی رقم بچ رہے تو اسے بستی کے بیت المال میں جمع کروانا۔ بیکار اشخاص کے لیئے کام
مہیا کرنا۔ اپاہج اور لاچار اشخاص کو بیت المال سے امداد دلانا۔ (۲) مسجد کے قریب کلب

کی بنیاد رکھنا۔ جہاں کتابیں۔ رسالے اور کھیل تفریح کے سامان مہیا ہوں۔ خیرات اور زکوات کی رقوم اس کام کے لئے صرف ہو سکتی ہیں۔ ہر جمعہ کی رات کو تمام ایک سو افراد ضرور مسجد میں حاضر ہوں۔ ایک خاص پروگرام مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مشاعرہ۔ مناظرہ۔ تقاریر۔ محفلِ میلاد وغیرہ اسی طریق پر ایک بستی کی ایک کلب قائم کی جا سکتی ہے جس کے ارکان صرف سارجنٹ اور حوالدار ہونگے۔ اگر کوئی بستی پردہ کی پابند نہیں ہے تو وہ اسی کلب کو مخلوط قرار دے سکتی ہے۔ یہ افراد کی رضا پر منحصر ہے۔ مقصد یہی ہے کہ مجلسی زندگی کو فروغ دیا جائے (۳) جمعہ کے دن تعطیل ہو۔ اور اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے دستہ کے تمام سپاہی جامع مسجد میں حاضر ہوں۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک پنچایت کا اجلاس منعقد کیا جائے۔ جس کے اراکین لفٹنٹ اور سارجنٹ ہوں۔ معمولی مقدمات اور شکایات اسی مجلس میں پیش کی جائیں۔ اگر ان کا تصفیہ نہ ہو سکے تو یہ مقدمات شہری عدالت میں پیش ہو سکتے ہیں۔ اگر حکومت غیر اسلامی ہو تو یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کا تصفیہ مساجد ہی میں ہو جائے۔ عدالت میں جانے کی نوبت نہیں آنی چاہیئے۔ اب لیجیئے لفٹنٹ کے فرائض (۱) تمام سارجنٹ باقاعدہ اپنے فرائض انجام دیں۔ اُن کے فرائض میں سے حسب ذیل باتیں ہوں۔ زکوات کی رقوم جو سارجنٹوں سے موصول ہوں ان کو مستحق دستوں میں تقسیم کرنا۔ بستی کے کلب کو فروغ دینا۔ اگر کوئی ٹاؤن ایک ہزار سے کم خاندانوں پر مشتمل ہے تو لفٹنٹ کا کیپٹن کے فرائض سرانجام دینا۔ کیپٹن کے فرائض یہ ہونگے (۱) تمام لفٹنٹ زکواۃ کی رقوم اس کے پاس جمع کروائیں۔ اور وہ انکو مستحق بستیوں میں صرف کرے (۲) جمعہ کی نماز وہ پڑھائے اور خطبہ میں وہ پیغام لوگوں تک پہنچائے جو اسے حاکمِ ضلع یا حاکمِ صوبہ سے موصول ہوں۔ (۳) عید میلاد النبی کا جلوس اور جلسہ کا انتظام کرے۔ اسی طرح حاکمِ ضلع کا یہ فرض ہے کہ تمام کیپٹن اور لفٹنٹ اپنا کام باقاعدہ کرتے رہیں۔ حاکمِ صوبہ کے احکام کو ان تک پہنچائے خطبہ کے لئے پیغام کی جتنی نقول چاہیں ان کی تعداد سے حاکمِ صوبہ کو اطلاع دے۔ عید سے پہلے پہلے سرٹاؤن کے کیپٹن کا انتخاب ہو جانا چاہیئے۔ عید کے بعد کوئی دن مقرر

کرکے تمام کیپٹن بلائے جائیں اور حاکمِ ضلع کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اسی طریق پر حاکم صوبہ ایک دن مقرر کرے تاکہ آئندہ سال کے لئے حاکمِ صوبہ کا انتخاب کیا جائے۔ حاکمِ صوبہ کے یہ فرائض ہوں گے (۱) ہر حاکمِ ضلع کے کام کی نگرانی کرنا (۲) جمعہ کے خطبہ کے لئے ایک ہی پیغام کی نشر و اشاعت کا انتظام کرنا۔ اس کے مصارف ہر ٹاؤن کے کیپٹن سے آبادی کے تناسب سے وصول کرنا (۳) دوسرے صوبوں کے حاکموں سے رابطہ و اتحاد قائم کرنے کی سعی کرنا۔ تمام صوبوں کا ایک سپریم کمانڈر یا قائدِ اعظم منتخب کیا جا سکتا ہے۔ یہ سپریم کمانڈر دوسرے ممالک سے رابطہ و اتحاد قائم کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس طرح مکہ پھر اسلام کا مرکز بن سکتا ہے اور خلیفۃ المسلمین کا انتخاب عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ حج کے موقعہ پر تمام ملکوں کے قائدِ اعظم جمع ہو سکتے ہیں اور ایک ہی نظام پر عمل پیرا ہونے کا پروگرام مرتب کر سکتے ہیں۔ خلیفہ کا انتخاب اس طریق پر کیا جا سکتا ہے۔ جب تمام ممالک کے قائدِ اعظم حج کے موقعہ پر جمع ہوں تو وہ بہترین شخص کو خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں۔ اگلے حج تک یہی شخص خلیفہ کے عہدہ پر ممتاز رہ سکتا ہے۔ ایک ہی اللہ۔ ایک ہی رسول۔ ایک ہی نائب اللہ۔ یعنی خلیفہ اور ایک ہی طرزِ عمل کی مثال اس تنظیم سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ طریقہ اب بھی رائج ہو سکتا ہے۔ غیر اسلامی حکومت اس طریقِ انتخاب میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی جس وقت اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ تو آئینِ مسرت کا نفاذ کر دیا جائے۔ اشتراکیت سے بہتر معاشی حل اور کوئی ممکن نہیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) ہندوستان کے مختلف صوبوں کی آبادی کو مخلوط رہنے دیا جائے اور ہر شہر اور دیہات میں علیحدہ علیحدہ بستیاں قائم کر دی جائیں (۲) یا صوبے علیحدہ علیحدہ مقرر کر دیئے جائیں۔ ان صوبوں کی حد بندی نئے سرے سے ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ایک ہی صوبے میں ایک ہی مذہب کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ایک ہی مذہب کی حکومت قائم ہو سکتی ہے اس صورت میں تمام اضلاع کے حکام صوبہ کی مجلسِ نمائندگان کے اراکین گردانے جا سکتے ہیں۔ اور حاکم صوبہ صدرِ اعظم بھی کہلا سکتا ہے۔ سرکاری ادارے صدرِ اعظم اور اس کی کابینہ

کو سونپ دیے جائیں۔ اس طرح ہر ٹاؤن کمیٹی کا صدر ٹاؤن کیپٹن ہوگا۔ لفٹنٹ اس کے معاونین ہونگے اور سرکاری حکام اعزازی ارکان ہونگے مثلاً ٹاؤن کا سب سے اعلیٰ ڈاکٹر انجنیئر۔ پولیس آفیسر۔ جج اور مقامی کالج کا پرنسپل۔

اس تجویز پر موجودہ حالات میں بھی عمل ہو سکتا ہے۔ تنظیم نہایت اہم ہے۔ قومی ترقی کا سب سے پہلا زینہ یہی تنظیم ہے۔ مخالف حالات میں کامیابی اس امر کی دلیل ہوگی کہ موافق حالات میں تم کیا کچھ کر کے دکھا سکتے ہو۔ اب منزل تمہارے سامنے ہے اور منزل کو جانے والی شاہراہ بھی۔ کوئی قوم جو اس وقت قدم آگے بڑھا دے گی وہی منزل کو جا لے گی۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
(اقبال)

محمد اقبال عباسی خوشنویس۔ لاہور۔ ستمبر ۱۹۳۶ء